غلام الثقلین نقوی

پانچواں طبقہ



بے ساختہ کالم



پانچواں طبقہ

غلام ثقلین نقوی

کلاسیک

بارِاوّل: مئی 2006ء

قیمت:-/150 روپے

ناشر: آغا امیر حسین

کلاسیک' چوک ریگل (مال) لاہور

فون: 7312977 فیکس: 7323963

ای میل: agha@classicpublishers.com

ویب سائٹ: www.classicpublishers.com

کمپیوٹر ورک: آصف علی بیگ

طابع: کلاسیک پرنٹرز، لاہور

ارض سدید

سید غلام الثقلین نقوی زندگی کے جزو کا مشاہدہ کرتے تو وہ حقیقت کی اس قاش کو افسانے میں پیش کر دیتے۔ لیکن جب وہ زندگی کے ''کل'' کو زیرِ غور لاتے تو جزئیات پھیلتی چلی جاتیں اور سالم زندگی ناول کی صورت اختیار کر جاتی۔ ان کی ساری زندگی افسانے کے سوز و ساز اور ناول کے پیچ و تاب میں گزر گئی۔ فطرت نے انہیں نفسِ مطمئنہ عطا کیا تھا، اس لئے انہوں نے بازارِ حیات میں کھوٹے سکے چلانے والے خریدار کی حیثیت قبول نہ کی، لیکن زندگی کے آخری دور میں انہیں اچانک احساس ہوا کہ صادق قدریں شکست و ریخت کا شکار ہو رہی ہیں اور ان کا کھرا سکہ بے قعت اور بے قیمت ہو گیا ہے۔ ان کے اس ردِعمل کو میں نے کاغذ پر لفظوں کی صورت میں اترا ہوا دیکھا تو اسے ایک ایسا بے ساختہ کالم قرار دیا جو اخبار پڑھنے والوں کی سوچ کو مہمیز کر سکتا تھا اور انہیں حقیقت کا دوسرا اصلی رخ دکھا سکتا تھا، ان کی یہ تحریریں روزنامہ ''نوائے وقت'' کے ادارتی صفحے پر شائع ہو کر بہت مقبول ہوئیں۔ افسوس یہ ہے کہ غلام الثقلین نقوی ردِعمل کی اس فضا میں زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے اور جنوں میں جتنی بھی گزر سکتی تھی بکار گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور ان کا کالم نگاری کا مفید سلسلہ منقطع ہو گیا۔

غلام الثقلین نقوی کی کالم نگاری ان کے فن کی اضافی جہت ہے، ان بکھرے ہوئے اوراق کو آغا امیر حسین صاحب اپنے ممتاز جریدہ ''سپوتنک'' کے ساتھ ساتھ کتابی صورت بھی دے رہے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ مرحوم کی یہ صحت مند انوکھی تحریریں دور دور تک پہنچ جائیں گی اور قاری کی سوچ کو مثبت کروٹ دیں گی۔ میں اس کتاب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

انور سدید

مصنف کی دیگر کتب

- بند گلی (افسانے)
- لمحے کی دیوار (افسانے)
- نغمہ اور آگ (۱۹۶۵ء کی جنگ کے پس منظر میں افسانے)
- شفق کے سائے (افسانے)
- دھوپ کا سایہ (افسانے)
- سرگوشی (افسانے)
- اک طرفہ تماشا ہے (مزاحیہ مضامین)
- میرا گاؤں (ناول)
- ارضِ تمنّا (مکہ و مدینہ کا سفرنامہ)
- چل بابا اگلے شہر (لندن اور ویلز کا سفرنامہ)
- ٹرمینس سے ٹرمینس تک (سفرنامہ)
- تین ناولٹ (چاند پور کی نینا شمیرا، شیر زمان)
- نقطے سے نقطے تک

عزیزہ عقیلہ زینب نقوی

اور

عزیزم علی عرفان شہزاد

کے نام

ترتیب

میں بھی حاضر تھا وہاں...... 9
عوامی تعلیم اور زیرِ تعمیر بستیاں 12
شکست اور اعترافِ شکست 14
ڈراما کم......اشتہارات زیادہ 17
چوتھا سیز فائر 19
مذاکرات کی میز پر 22
بم دھماکے اور میں 25
دلہن بنی کپاس 28
ترقی کا ''میراج'' 31
بزرگوں کا پیکیج 34
سورلاکھ کا کنگلا 37
زر، ہوسِ زر اور جلبِ زر 40
کتاب کلچر کا ایک آدمی 43
چاچا بوٹا موٹروے پر 47
یکم جنوری 2005ء 50
ساڑھے چار کنال زرعی اراضی 53
الہ دین کا چراغ (ا) 56
الہ دین کا چراغ (آخری قسط) 58
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف 61
بھل صفائی 64
مختصر افسانہ اور ٹیلی ویژن 67
چاچا بوٹا اور حاجی مولا جٹ ایم پی اے 70
محمد منور! محمد منور! 73
بیاسی سالہ شاگرد اور ستتر سالہ استاد 77
چاچا بوٹا اور سی ٹی بی ٹی 80
ایک سپر مین کی آمد 83
علی بابا اور 40 چور 86
اجتماعی خوف اور دعا 89
پانچواں طبقہ 92
ڈیڑھ فرلانگ لمبا فٹ پاتھ 96
شیخ چلی سے ایک ملاقات 99
کس مپرسی سے کس مپرسی تک 102
نور پور کلاں کا پرائمری سکول 105
خرجی سے ڈگی تک 108
آئینے کو لپکا ہے 111
ایک سفر کی روداد 114
نور پور کلاں میں شٹر ڈاؤن ہڑتال 117
اللہ میگھا دے 120

دووفادارخواتین	123
یوایف او، اور این جی او	126
پانچ کلے نہری اور دس گھماؤں بارانی زمین	129
بجٹ سے پہلے اور بجٹ کے بعد	132
ایک لے پالک بچہ	135
مجھے ان پر رحم آتا ہے	138
ایمن آباد سیالکوٹ روڈ	141
ایک ''این جی او'' اور	144
بلدیاتی انتخابات اور عوام	147
بنیادی جمہوریتوں کی کچھ یادیں	150
چینل نمبر تھری	153
ضمیر کی سزا	156
بزرگوں کا پیکیج 2000ء	159
پہلی اینٹ کا معمار	162
یہ نامہ بر ہمارے	165
وزیراعظم کی تلاش	168
بچے دو ہی اچھے	171
بزرگوں کی عیدی	174
حلوہ اور حکمران	177
پی ایچ ڈی.. پچاس پاکستانی اور پانچ سو ہندوستانی	180
حلال روزی کمانے والے	183
موازنہ بینظیر بھٹو اور نواز شریف	186
عارف عبدالمتین...... کمیونزم سے اسلام تک	189
اعدادوشمار اور انسان	193
یہ اکیڈیمیاں؟...... کیا ایک ضرورت ہیں؟	196
شوبز کی خبریں	199
پانچ روپے میں ایک لفافہ	202
ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف	205
جمہوریت اور پاکستان	208
چلو نور پور کلاں چلیں	211
ٹاٹ سے ڈیسک تک	214
بستی بسنا کھیل نہیں ہے؟	217
پروفیسر اشفاق علی خان...... ایک سچا پاکستانی	220
نیا بجٹ...... پرانا پنشنر	224
نظام تعلیم میں استاد کا مقام	227
ایک ادھورا خواب	230
علم و ادب کا فروغ	233
دونوک فیصلہ اور افغان مہاجرین	235
پینشن خوروں کا ایک اور اعزاز	238
تورا بورا	241

میں بھی حاضر تھا وہاں......

کوئی فرد یا ادارہ اچھا کام کرے تو اس کی داد اسے ضرور ملنی چاہیے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کا بہت شکرگزار ہوں کہ اس نے ایک اچھے کام میں ایک مندوب کی حیثیت سے شمولیت کی دعوت دی۔ ۱۴ نومبر ۹۸ء کی تقریب میں شمولیت کئی پہلوؤں سے باعث مسرت بھی ہوئی مثلاً...... بہت سے دوستوں سے تجدید ملاقات ہوئی۔ کئی نوجوان ادیبوں اور شاعروں سے تعارف حاصل ہوا۔ ایک تھری سٹار ہوٹل میں دو راتیں ٹھہرنے کا موقع ملا ورنہ ہم تو مالی طور پر اتنی توفیق بھی نہیں رکھتے کہ کسی سرائے میں بھی قیام کر سکتے۔ آج کل سرائیں کہاں باقی رہی ہیں اسلام آباد میں تو ان کا تصور بھی حرام ہے۔ ناشتہ بھی ٹھنڈا تھا اور جو دو ڈنر اس ہوٹل میں کئے‘ ان کا تو جواب نہیں۔ البتہ واپسی پر جو سوپ پیا‘ وہ واقعی گرم بھی تھا بلکہ لب سوز اور مزیدار بھی۔ اس سے پہلے اکادمی نے ہمیں ہالیڈے ان‘ اسلام آباد ہوٹل اور پرل انٹر کانٹی نینٹل میں قیام کا شرف بخشا تھا اور ہم نے صحیح معنوں میں اپنے آپ کو وی آئی پی جانا تھا۔ اس ہوٹل کے قیام نے ہمیں اپنی حیثیت یاد دلائی کہ ...... مسٹر ادیب! قدر خود بشناس۔ پاکستان پر جو پیغمبری وقت آیا ہوا ہے یعنی قرضہ نہ ملنے کی وجہ سے جو کساد بازاری کا دور دورہ ہے‘ اس میں ہمیں اس ہوٹل میں قیام بھی اسراف محسوس ہوا۔ ۱۴ نومبر کو سٹیٹ بنک ہال کے لان میں لنچ کیا۔ شامیانوں کے نیچے‘ جگہ تنگ اور مردماں بسیار۔ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن اتنی نفسانفسی ہوگی کہ بیٹا باپ کے کام نہیں آ سکے گا۔ وہی نفسانفسی کا عالم اس لنچ کے موقع پر نظر آیا کہ جو نوجوان ادیب ہاتھ ملا کر کہتے تھے کہ سر! ہم تو آپ کے بچے ہیں۔ ہم نے آپ سے لکھنا سیکھا‘ وہی کھانے کی میز پر آنکھ نہیں ملاتے تھے۔ اسی شب جو آخری ڈنر براڈ کاسٹنگ کارپوریشن نے دیا‘ اس نے اپنے آپ پر ہمارا اعتماد بحال کر دیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہم واقعی وی آئی پی ہیں۔ لان جہاں خوبصورت شامیانے تنے ہوئے تھے۔ نہایت کشادہ اور سرسبز تھا۔ روشنیاں بھی نظر افروز تھیں شامیانوں تک پہنچنے کے لئے سرخ رنگ کی بانات بچھائی گئی تھی اور اس سے آگے سرخ قالین تھے۔ کھانا نہایت اشتہا انگیز اور اتنا وافر کہ کسی میز پر ہجوم نہ ہوا۔ افسوس

صد افسوس! کہ تنگیٔ معدہ تنگیٔ داماں بن گئی۔ اتنی نعمتیں موجود‘ ان کا حصول بھی آسان اور پلیٹ میں صرف سلاد۔ قریب ہی کباب اور تکے بن رہے تھے۔ اگرچہ چاہتا تو پلیٹ لبالب بھر لیتا تاہم دبیز قالین پر بیٹھ کر سلاد کھانے میں بہت مزہ آیا۔ بعد میں نہایت ذائقہ دار فرنی سے منہ میٹھا کر لیا۔ تقسیم انعامات کی محفل میں پہلی بار وزیر اعظم محمد نواز شریف کو ان کے وجود اصلی میں دیکھا‘ اگرچہ بہت دور رہے۔ تاہم ٹیلی ویژن پر ان کا وجود عکسی تو تقریباً ہر روز نظر افروز ہوتا ہے۔ ان سے پہلے پاکستان کے ایک وزیر اعظم محمد خاں جونیجو مرحوم سے تو ہاتھ ملانے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ محض اتفاق سے۔ آج اس اتفاق کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی۔ کئی مقالے سنے۔ یقیناً حکمت و دانش سے پر ہوں گے لیکن آلہ سماعت لگانے کے باوجود کچھ پلے نہ پڑا تو غنودگی کا عالم طاری ہو گیا۔ لنچ کے بعد خواہ وہ بہت ہلکا ہی کیوں نہ ہو‘ مقالے کی سماعت کارے دارد ہے۔ مقالوں کی نقل مہیا نہ کی گئی۔ اگر نقل مل جاتی تو پڑھتے رہتے لیکن غنودگی کی لذت سے محروم رہتے۔ سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ ادباء شعراء کو انعامات سے سرفراز کیا جا رہا تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ انعام کی رقم کو دو لاکھ سے پانچ لاکھ کر دیا گیا تھا۔ اس خبر پر اتنی خوشی ہوئی کہ اگر خوشی سے پھول بھی جاتے تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن یہ کیفیت اس لئے وارد نہ ہوئی کہ کمال فن ادبی انعام سے ہمیں تو نہیں نوازا جا رہا تھا۔ امید نہیں کہ ہمارے ساتھ ایسا حادثہ کبھی واقع ہو۔ اب توازن برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ کچھ مایوسیوں کا ذکر بھی کر دیا جائے جن سے خاصا دکھ ہوا مثلاً...... ادیبوں کے اتنے بڑے ہجوم میں کئی سینئر ادیب نظر نہ آئے جن سے اکادمی کی ہر گزشتہ تقریب میں ملاقات ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ رحمٰن مذنب اور اے جی جوش کے سوا کوئی سینئر ادیب شریک محفل نہ تھا۔ ہمیں بھی اگر سینئر ادیب سمجھ لیا جائے تو ہمارا بھی دم غنیمت تھا۔ احمد ندیم قاسمی کمال فن ادبی انعام لینے کے لئے خود رونق محفل نہ بنے گویا بارات کا دلہا غائب تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ غیر ملکی دورے پر ہیں۔ تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ جب تک وہ اس محفل مین شامل نہ ہو سکتے۔ اسے ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ سچ جانئے (یہ میں دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہوں۔ اس میں کوئی منافقت نہیں) کہ ان کے بغیر تقریب پھیکی پھیکی رہی...... فخر زمان کے زمانے کی ایک ادبی کانفرنس بھی ان کی شرکت سے محروم رہی تھی اور اس میں بھی یہ احساس ہوا تھا کہ تصویر سے کوئی رنگ اڑا اڑا سا ہے۔ سنا ہے کہ جس کمیٹی نے انہیں اولین کمال فن ادبی انعام کے لئے منتخب کیا تھا‘ اس کے صدر بھی وہی تھے لیکن انصاف کا تقاضا مد نظر تھا‘ اس لئے اس موقع پر باہر چلے گئے تھے۔ یہ سنی سنائی بات ہے۔ اس پر

اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ اگر وہ کمیٹی کے صدر نشیں بھی رہتے تو کیا ہرج تھا۔ ہمارے ایک صدر جنرل محمد ایوب خاں مرحوم جب فیلڈ مارشل بنے تھے تو یہ فرمان انہی کے دستخطوں سے جاری ہوا تھا۔ بہتر تھا کہ جناب نذیر ناجی صاحب اس مسئلے پر ریفرنڈم کروا لیتے۔ ہم ادب کے تقدس کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم ضرور ان کے حق میں ووٹ دیتے۔ محترمہ منصورہ احمد کی خوبصورت تصویر تو اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے عطا ہونے والے اجمالی جائزے میں دیکھ لی تھی لیکن انہیں بنفس نفیس انعام وصول کرتے ہوئے دیکھنے کی خواہش تھی جو پوری نہ ہوئی۔ بقول اجمالی جائزہ ''وہ ان شعراء شاعرات میں سے ہیں جو ابتدا ہی سے الگ پہچان قائم کر لیتے ہیں اور جن کی شاعری میں فکر و فن یکجا ہیں''۔ اس لمحے مجھے مرحومہ پروین شاکر شدت سے یاد آ رہی ہیں۔ ۷ نومبر کی شب کو ساڑھے سات بجے شب لیٹنا چاہا تو روڈ لائنز میں ۳۵۰ کلومیٹر کا سفر کرنے کے بعد اکڑی ہوئی پیٹھ نے بستر کے ساتھ لگنے سے انکار کر دیا۔ بڑی مشکل سے اسے سیدھا کیا۔ تب اچانک ندامت کا ایک غبار دل و دماغ پر چھا گیا۔ اگر ہم اس تقریب میں شامل نہ ہوتے تو قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی قوم کو ہماری مہمانداری پر کم از کم پانچ ہزار روپے تو صرف نہ کرنے پڑتے۔

۲۰ نومبر ۱۹۹۸ء

عوامی تعلیم اور زیر تعمیر بستیاں

میں عرصہ دس سال سے ایک زیر تعمیر بستی میں رہتا ہوں۔ یہاں دیہات سے مزدور آتے اور اپنی روزی کماتے ہیں۔ ہر زیر تعمیر مکان میں ایک چوکیدار بھی ہوتا ہے جو اکثر بال بچوں کو بھی ساتھ رکھتا ہے۔ سردی' گرمی' بارش اور طوفان میں جس طرح اس کی اور اس کے خاندان کی زندگی گزرتی ہے' اس سے علامہ اقبال یاد آتے ہیں۔

ہیں تلخ بہت بندہء مزدور کے اوقات ان دنوں جب میں دن چڑھے سیر کو نکلتا ہوں تو ہر زیر تعلیم مکان کے سامنے کی سڑک پر بچوں کے ایک غول کو دیکھتا ہوں جو ٹوٹے پھوٹے بلّے اور ٹوٹی پھوٹی گیند سے کرکٹ کھیلنے میں مصروف ہوتا ہے۔ کسی کے تن پر پورے کپڑے نہیں ہوتے اور اکثر کے پاؤں جوتوں سے محروم ہوتے ہیں۔

اس کالونی میں چھوٹے چھوٹے پرائیویٹ سکول بھی ہیں۔ ان کے سامنے کی سڑکوں پر صاف ستھرے لباس میں ملبوس بچے بھی کرکٹ کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ سکول بھی اونچے درجے کے سکول نہیں۔ ان میں جو بچے پڑھتے ہیں' ان کا تعلق تیسرے درجے کی مڈل کلاس سے ہے۔

زیر تعمیر مکانوں کے ڈھانچوں میں بسنے والے بچوں اور ان بچوں کا مقابلہ و موازنہ کرتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کہیں کہیں وہ بچے بھی نظر آتے ہیں جو بوری کندے پر ڈالے کوڑے کرکٹ سے خوراک کے ریزے تلاش کر رہے ہوتے ہیں اور میں شرم سے زمین میں گڑ جاتا ہوں۔ یہ میرا روزانہ کا مشاہدہ ہے لیکن میں اسے معمول کی زندگی کا جز نہیں بنا سکا۔ اس طبقاتی تفاوت میں میں بھی برابر کا شریک ہوں اور ہر لحظہ میرے احساس گناہ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ میں ایک ریٹائرڈ استاد ہوں۔ میں کڑھتا رہتا ہوں کہ یہ بچے جہاں زندگی کی دوسری ضروریات سے محروم ہیں' وہاں انہیں علم کی روشنی بھی میسر نہیں۔ ان بچوں کی تعلیم سے محرومی کا ذمے دار معاشرہ ہے۔ لیکن معاشرے میں کتنے لوگ ہیں جو باشعور ہیں۔ جو شعور

۱۹۴۷ء میں پیدا ہوا تھا' وہ پانچ سات سال کے اندر ختم ہو گیا۔ کچھ درد مند لوگوں نے ایسے محروم بچوں کے لئے سکول بھی کھولے لیکن ان کا سلسلہ چلا نہیں۔

لامحالہ یہ ذمے داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ جب جنگ بدر کے کچھ قیدیوں کو اس شرط پر آزاد کیا گیا کہ وہ مہاجرین کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو گویا اس بنیادی اصول کو دستور میں شامل کر دیا گیا کہ کم از کم ابتدائی تعلیم ریاست کی ذمے داری ہے۔ جو حکومت اس فریضے کو ادا کرنے سے جی چرائے گی' وہ اسلامی دستور کی اس شق سے انحراف کی مرتکب ہو گی۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا پاکستان میں کسی بھی حکومت نے اپنا فرض ادا کیا؟ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ اعداد و شمار ممکن ہے کہ کچھ اور کہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستان میں خواندگی کی شرح مسلسل گر رہی ہے۔ اس کا ایک سامنے کا ثبوت یہ ہے کہ اس زیر تعمیر بستی میں اس وقت بھی کم از کم سو بچے ایسے ہوں گے جو ابتدائی تعلیم کے حق سے محروم ہیں۔ یہ بچے اپنے گاؤں میں واپس جائیں گے تو وہاں بھی ان کے لئے ایسی کوئی سہولت موجود نہیں ہو گی۔ ایسی کئی بستیاں لاہور میں زیر تعمیر ہیں۔

دوسرا سامنے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ بچے جن کے والدین دو تین ہزار ماہوار سے زیادہ کمائی نہیں کر سکتے' وہ مفت تعلیم والے سکول میں بھی اپنے بچے کو نہیں پڑھا سکتے۔ ذرا اس بستے کے حجم کو دیکھئے جو پرائمری سکول کے ایک بچے کی پشت پر لٹکا ہوتا ہے۔ اس کے اندر جو کتابیں اور کاپیاں ہیں' ان کی قیمت کی میزان لگایئے اور کاغذ' پنسل اور سیاہی پر جو خرچ اٹھتا ہے' اسے بھی اس میں جمع کیجئے اور مزدور کے بجٹ سے اس رقم کو پورا کر کے دکھایئے۔ اب ابتدائی تعلیم بھی مزدور اور کسان کے بس کی چیز نہیں رہی۔ سلیٹ اور تختی کے دور میں غریب کے بچے بھی پڑھ جایا کرتے تھے۔ میری تجویز ہے کہ ان بچوں کے لئے کسی مکان کے ڈھانچے میں دو تین ٹاٹ بچھا دیجئے' انہیں ایک استاد مہیا کر دیجئے اور ہر بچے کے ہاتھ میں ایک کتاب' ایک تختی اور ایک سلیٹ تھما دیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بچے ہونہار ثابت ہونگے اور پڑھ جائیں گے۔ اگر ہم ان محروم بچوں کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے تو پھر ملک و قوم کا اللہ ہی حافظ ہے!

17 فروری 1999ء

شکست اور اعتراف شکست

حال ہی میں پاکستانی قوم کو دو نہایت صدمے پہنچے ہیں۔ ایک صدمہ تو کرکٹ میں ناقابل یقین شکست کا ہے اور دوسرا کارگل کی چوٹی سے یک دم نیچے اتر آنے کا۔ بظاہر قوم پرسکون نظر آتی ہے اور ابھی تک ان صدموں کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قوم شاک پروف بن چکی ہے۔ کرکٹ میں شکست کا معمولی سا ردعمل نظر آیا جس پر کرکٹ بورڈ کے سابق چیئرمین خالد محمود نہایت برہم ہوئے اور اس کی بجائے کہ ٹیلی ویژن پر قوم سے معافی مانگتے' الٹا اسے ''عوام کے شرمناک رویئے'' کا نام دیا۔ کرکٹ کے عظیم ہیرو وسیم اکرم ابھی تک انگلستان سے وطن واپس نہیں آئے۔

دوسرے صدمے کے ردعمل کا اظہار اپوزیشن کے لیڈروں کے کچھ بیانات اور مضمحل سے جلسے جلوسوں سے ہوا ہے جن میں مجھے تو کوئی جوش وخروش یا ولولہ نظر نہیں آیا۔ اپنے الیکٹرانک میڈیا نے تو انہیں اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ ان کی ایک جھلک ہی سکرین پر دکھا دی جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اندرون خانہ کچھ مفاہمت ہو چکی ہے۔ سیاست میں سمجھوتے عام ہیں۔ اس کے باوجود حکومت کے پڑھے لکھے (اور زیادہ تر ان پڑھ) ارکان' وزیر' مشیر اور پارلیمنٹری سیکرٹری معاہدہ واشنگٹن کو سیاست وتدبر کا ایک عظیم کارنامہ قرار دے رہے ہیں۔ سابق جرنیلوں' ہارے ہوئے اور ہارنے والے سیاستدانوں پر بری طرح سے برس رہے ہیں۔

مجاہد اول وآخر سردار عبدالقیوم کو تو اس شکست میں فتح مبین کی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پھر سے آزاد کشمیر کے آسمان سیاست پر اپنی پوری آب وتاب سے چمکنے والے ہیں۔ آزاد کشمیر کے موجودہ وزیراعظم بیرسٹر سلطان محمود عرصے سے منظر سے غائب نظر آتے ہیں۔

اپنے الیکٹرانک میڈیا کی بے حسی وبے نیازی دیکھنے کے قابل ہے۔ اس پر ناچ گانے ہو رہے ہیں' عشقیہ ڈرامے چل رہے ہیں اور زرآمد اور کارآمد اشتہارات کی بارش ہو رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پاکستان میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ حسب سابق حکومت کی اعلیٰ کارکردگیوں کے

گن گائے جا رہے ہیں اور بار بار دیکھے ہوئے چہروں کی بار بار نمائش ہو رہی ہے۔ جہاں تک خبروں کا تعلق ہے' وہ پہلے سے بھی زیادہ مردہ اور بے روح ہو چکی ہیں۔ سب سے اچھی خبر میرے نزدیک اگلے دن کے موسم کی ہوتی ہے کہ کبھی کبھار گرجتے برستے بادلوں کے آنے اور ٹھنڈی ہواؤں کے چلنے کی نوید تو ملتی ہے۔

جناب وزیراعظم ۱۲ جولائی ۹۹ء کو ٹیلی ویژن پر حسب معمول بڑے طمطراق سے آئے یعنی نیوز کاسٹر خالد حمید نے ان کی آمد کا ''باملاحظہ و باادب'' والا اعلان کیا اور قومی ترانہ بھی بجایا گیا۔ میرا ناقص خیال ہے کہ قومی ترانہ صرف ملک کے صدر کی آمد پر بجایا جانا چاہئے۔ کیا انگلستان اور ہندوستان کے وزرائے اعظم جب ٹیلی ویژن کی سکرین پر رونق افروز ہوتے ہیں تو قومی ترانہ بجتا ہے؟

خیال تھا کہ وزیراعظم کی تقریر سے میرے چلّو بھر خون میں بھی ولولوں کا ابال آ جائے گا۔ ستتر سال کی عمر میں اکثر آدمی کا مورال گرا ہوا رہتا ہے لیکن ان دنوں کچھ بہت ہی زیادہ گر گیا ہے۔ افسوس کہ اس میں کوئی تموج پیدا نہ ہوا۔ میں نے اپنے چند بزرگ دوستوں کی خیریت دریافت کی' تو وہ بھی اسی قسم کی کیفیت میں مبتلا نظر آئے۔ عوام سے مجھے ملنے کا موقع نہیں ملا' خاص طور پر ''دہی کلچہ'' کھانے والے عوام سے کہ ان کا ردعمل معلوم ہو سکتا۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ عوام پر ''دہی کلچے'' نے بے حسی مسلط کر دی ہے لیکن اس بے حسی کے نیچے دل گرفتگی کی کیفیت بھی جاری و ساری ہے کہ یہ ایک عام نفسیاتی کیفیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فی الحال حکومت کے خلاف عوامی ردعمل کا وہ سیلاب نہیں اٹھے گا جو فیلڈ مارشل ایوب خاں' جنرل یحییٰ خاں اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو بہا لے گیا تھا۔

تاہم بے حسی بھی ایک نہایت خطرناک کیفیت ہے۔ کبھی کبھار یہ انقلاب فرانس کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ اندر ہی اندر لاوا ابل رہا ہو' تو اسے بہہ نکلنے کے لئے کوئی کمزور جگہ ضرور مل جاتی ہے۔

اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ حکومت اپنی مجبوریوں اور شکست کا برملا اعتراف کرے اور قوم سے اپنی سفارتی کوتاہیوں کی معافی مانگے جس طرح ظہیر الدین بابر نے جنگ کنواہہ میں ''کلِ کفر'' کے خلاف اپنے مے خانے کے خم اور جام و مینا توڑ ڈالے تھے' اسی طرح وزیراعظم بھی اس قسم کی کسی عظیم قربانی کا مظاہرہ کریں۔ ابھی تک تو وہ اپنا

کوئی عظیم وعدہ پورا نہیں کر سکے۔ اگر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں وہ یہ کام کر آئے ہیں تو قوم کی اس کی اطلاح دیں۔ نہیں کیا تو بتائیں کہ وہاں کیا کرنے گئے تھے؟

الیکٹرانک میڈیا حکومت کی جاگیر نہیں' اس پر اپوزیشن کا بھی برابر کا حق ہے۔ معرکہ کارگل کے سلسلے میں زعمائے وطن کو' خواہ وہ مخالف جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں' اظہار رائے کا موقع ملنا چاہئے۔ اس سے جذباتی کتھارسس ہو جاتا ہے۔ ایک مدت سے میں نے کسی مخالف لیڈر کو ٹیلی ویژن پر نہیں دیکھا۔ ائر مارشل اصغر خاں' جنرل کے ایم اظہر' نواب زادہ نصر اللہ خاں' قاضی حسین احمد' مولانا طاہر القادری' جنرل حمید گل' جنرل اسلم بیگ' ڈاکٹر اسرار احمد' عبدالستار ایدھی' اعتزاز احسن اور عمران خاں اگر پانچ منٹ کے لئے سکرین پر آ جائیں تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ جناب سید علی مردان شاہ پیر پگاڑا بھی دو چار لطیفے سنا جائیں تو قوم کی حس مزاح کو تازگی ملے گی' جو مردہ ہو چکی ہے۔

پاکستان کے صدر محترم اللہ والے بزرگ ہیں۔ انہیں بھی سکرین پر آ کر معرکہ کارگل کے بارے میں قوم سے مخاطب ہونا چاہئے۔ صرف وزیراعظم کو نہیں پوری قوم کو ان کی مومنانہ فراست سے مستفید ہونے کا موقع ملنا چاہیے۔

مجاہد اول و آخر مانیں یا نہ مانیں' اس وقت کشمیر بہت اداس ہے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے محمود ہاشمی کا رپورتاژ "کشمیر اداس ہے" پڑھا ہو گا۔ وہ اسے ایک بار پھر ضرور پڑھیں اور سوچیں کہ کشمیر کب تک اداس رہے گا۔ کشمیر کو پاکستان پر بہت اعتماد تھا۔ ہر شکست پر کشمیر اداس سے اداس تر ہو جاتا ہے۔ کیا اعتماد کا ستون ہل تو نہیں گیا؟ اسے سہارا کون دے گا؟

23 جولائی 1999ء

ڈراما کم......اشتہارات زیادہ

کوئی زمانہ تھا کہ ٹیلی ویژن پر ڈرامہ لگتا تو اطمینان کے ساتھ دیکھا جاتا کہ پینتالیس پچاس منٹوں کے بعد اپنے وجود کا ہر امکان بروئے کار لا کر اختتام تک ضرور پہنچے گا۔اس دور کے ڈرامے ناظر کو تفریحی اہتزاز سے بہرہ ور کرتے تھے کیونکہ ابھی ان میں اشتہارات کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔

ناگاہ زمانہ بدلا۔میری عمر کے ناظر بھونچکا سے رہ گئے کہ یا اللہ یہ کیا ہوا یعنی سیریل کا زمانہ آ گیا۔ ہفتے میں سات سیریل لگنے لگے۔ مجھے تو کسی سیریل کی پچھلی کہانی یاد نہیں رہتی۔ بہر حال دیکھتا ضرور ہوں کہ چلئے آٹھ بجے شب سے خبروں کے اختتام تک کا ڈیڑھ گھنٹہ ذہنی سبکساری میں گزرے گا لیکن حالت اس کے برعکس ہوتی ہے۔جب خبریں سن اور دیکھ کر اٹھتا ہوں تو سر شائیں شائیں کرتا ہے۔دماغ آواز اور تصویر کا ملغوبہ بن جاتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ بیس منٹ کا ڈراما دیکھنے کے لئے تیس منٹ کے اشتہارات دیکھنے پڑتے ہیں اور خبروں کے دوران بھی اشتہارات کے لئے نہایت فنکاری سے گنجائش پیدا کی جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ اشتہارات حسن و لطافت کا مرقع ہوتے ہیں لیکن اگر کسی شخص کو پھولوں کے ڈھیر میں دفن کر دیا جائے تو نزاکت، لطافت اور خوشبو کے باوجود اس بے چارے کا دم تو ضرور گھٹے گا۔ ہر کامیاب سیریل میں انیس بیس اشتہارات تو ضرور ہوتے ہیں آغاز میں ایک پردہ نشین اناؤنسر سکرین کے پر لکھے ہوئے ان اداروں کا نام پڑھ کر سناتی ہے جنہوں نے پی ٹی وی پر کرم فرمائی کی۔اس کے بعد سیریل کا اعلان اتنی گھن گرج سے ہوتا ہے کہ فضا تھرتھرانے لگتی ہے اور اشتہارات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جنہیں دیکھنا اور سننا پڑتا ہے۔طارق عزیز کی طرح آپ مجھے یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ تم چینل کیوں نہیں بدل لیتے۔(انہوں نے ایک بار اپنے ایک ناظر کے خط کا کہ جو ان کے پروگرام کی یکسانیت سے تنگ آ چکا تھا، یہی جواب دیا تھا) چینل بھی بار بار بدلتا ہوں لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ادھر بھی اشتہارات چل رہے ہوتے ہیں کہ دوسرا تو ہے ہی ایک کمرشل۔یوں بھی بار بار چینل بدلنے سے میرے جیسا چھہتر سالہ ناظر اور بھی بوکھلا جاتا ہے۔

پھر ڈرامے کا آغاز ہوتا ہے۔ایک متکلم پس منظر میں رہ کر اتنی اونچی آواز میں ''ہاہا کار'' مچاتا ہے کہ میں آلہ سماعت بند کر کے آواز کا گلا گھونٹ دیتا ہوں۔تب خاموش فلم چلنے لگتی ہے۔

جب سیریل کی قسط کا کوئی ذیلی عشر عشیر شروع ہوتا ہے تو آواز جاری کر دیتا ہوں اور آلہ سماعت کو بھی آن کر دیتا ہوں لیکن ابھی کچھ پلے نہیں پڑتا کہ اشتہارات چل پڑتے ہیں۔ اشتہارات ختم ہوتے ہیں تو پھر وہی "ہاہا کار" شروع ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی تاریکی میں ملفوف پاپ سنگنگ اور پاپ ڈانسنگ کانوں کے پردے پھاڑنے پر تل جاتی ہے' اس سے کچھ ریلیف ملتا ہے تو معلوم ہوتا کہ ڈرامے کا "عشر عشیر" شروع ہو کر اپنے اختتام تک پہنچ چکا ہے۔ نہ اس کا آغاز معلوم نہ اس کا انجام معلوم۔ اس وجہ سے یوں لگتا ہے جیسے وقت ایک جگہ رک گیا ہے نہ آگے بڑھتا ہے نہ پیچھے ہٹتا ہے۔ حالانکہ مجھے یعنی ناظر کو سکرین کی فلائینگ کارپٹ پر بٹھا کر کئی ملکوں کی سیر کرائی جاتی ہے لیکن میں نہ مکان کی حالت میں ہوتا ہوں نہ لامکاں کی حالت میں۔ اکثر سلسلوں میں وقت کو جامد کر دیا جاتا ہے۔ اصل میں اشتہارات وقت کا راستہ روک لیتے ہیں' خود تو چلتے ہیں لیکن وقت کو چلنے نہیں دیتے۔ ایک سیریل میں کئی کہانیاں ایک ساتھ چلتی ہیں بلکہ اپنے ہی محور کے گرد گھومتی رہتی ہیں' آگے نہیں بڑھتیں۔ ان ندیوں کی طرح جن کا پانی اتنا آہستہ خرام ہوتا ہے کہ اس میں حرکت کا احساس نہیں ہوتا اور یہ ندیاں ایک دوسری کے متوازی چلتی ہیں اور کہیں کوئی "پنج ند" نہیں آتا کہ ایک دوسری میں مدغم ہو جائیں۔

میں ڈرامہ کی ہر قسط کے دوران اس احساس میں مبتلا رہتا ہوں کہ جیسے میرا استحصال کیا جا رہا ہے اور میری جائز تفریح میں بھی مجھے دھوکا دیا جا رہا ہے اور میں ایک مسافر ہوں جس کی گٹھڑی کو چور لگا ہوا ہے۔ چھہتر سال کی عمر میں ضائع کرنے کو آدمی کے پاس وافر وقت ہوتا ہے۔ لیکن جو وقت ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر ضائع ہوتا ہے اس کا مجھے ہمیشہ بہت افسوس ہوتا ہے۔ خوش نصیب وہ لوگ ہیں جو اس کی لہو و لعب کی بجائے یہ وقت مصلے پر بیٹھ کر کاٹ لیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ملک کے نامور افسانہ نگار منشا یاد کا تحریر کردہ ایک سیریل "راہیں" کے عنوان سے لگا رہا۔ پہلی دو تین قسطوں ہی میں مشہور ہو گیا بس پھر کیا تھا اشتہارات اس پر برسنے لگے اور آخرا سے آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا اگر یہ سیریل تیرہویں قسط میں ختم ہو جاتا تو بلاشبہ اپنے فطری انجام کو پہنچتا اور فنی اور تکنیکی اعتبار سے ایک شاہکار ہوتا لیکن افسوس کہ پی ٹی وی کی ہوس زر نے "لسی" میں پانی' ڈلوانا شروع کر دیا اور آخری قسط میں لسی "فجا" بن گئی کہ نہ اس میں لسی کا مزہ رہا نہ پانی کا۔ تاہم خوشی ہوئی کہ اس سیریل نے ریکارڈ بزنس کیا اور پی ٹی وی کے وارے نیارے ہو گئے۔ اب پی ٹی وی ایک خالص کمرشل ادارہ بن گیا ہے۔ اب اسے ڈھائی سو روپے سالانہ لائسنس فیس لینے کا کوئی حق حاصل نہیں رہا۔ لیکن ممکن ہے کہ اگر یہ اڑھائی سو روپے سالانہ بند ہو جائیں تو ہم پی ٹی وی سے مفت میں عشا کی اذان سننے سے بھی محروم ہو جائیں۔

(5 اپریل 1999ء)

چوتھا سیز فائز

قلم ہاتھ میں لیا تو آغا بابر مرحوم کا ڈرامہ ''سیز فائر'' یاد آ گیا۔اس ڈرامے کا مرکزی کردار ایک کشمیری مجاہد ہے جو''سیز فائر'' کی خبرسن کر بہت مایوس ہوتا ہے اور جیب سے قائداعظمؒ کی تصویر نکال کر ان سے مخاطب ہوتا ہے اور اپنی مایوسی اور بے بسی کا اظہار اتنے درد آمیز الفاظ میں کرتا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے ہیں۔

انہیں دنوں جناب محمود ہاشمی نے ایک منفرد رپورتاژ'' کشمیر اداس ہے'' کے عنوان سے لکھا تھا۔

''جب بھی سیز فائر ہوتا ہے کشمیر اداس ہو جاتا ہے۔

اور پاکستان شرمسار!''

کشمیر محسوس کرتا ہے کہ اسے اس کے دوست اور مددگار نے اکیلا چھوڑ دیا ہے اور پاکستان سوچتا ہے کہ اس کی بہت سی قیمتی قربانیاں رائیگاں گئیں اور کشمیر کے کام نہ آسکیں۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد جو سیز فائر ہوا اور تاشقند معاہدے کے بعد جو مایوسی پھیلی، اس نے کشمیر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔اس جنگ پر بہت سا ادب تخلیق ہوا لیکن آغا بابر نے''سیز فائر'' کا دوسرا حصہ نہ لکھا اور محمود ہاشمی نے ''کشمیر اداس ہے'' کو آگے نہ بڑھایا۔قیوم نظر مرحوم نے''سرینگر کی بیٹیاں......نڈر دلیر بچیاں'' کے عنوان سے ایک ایسی دلگداز نظم لکھی اور اسے موسیقار نے اتنی غم انگیز دھن عطا کی کہ جب بھی میں ٹیلیویژن پر کشمیر کی بیٹیوں کو احتجاج کرتے، فوج کا ظلم سہتے اور اپنے پیاروں کی موت پر ماتم کرتے دیکھتا ہوں، تو یہ دھن میرے کانوں میں گونجتی ہے اور میں بہت اداس ہو جاتا ہوں۔

میری آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی ہے اور میں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔میں نے اکتوبر 67ء میں ایک افسانہ ''اے وادی لولاب'' کے عنوان سے لکھا۔اس کا مرکزی خیال علامہ اقبالؒ کی جس نظم سے اخذ کیا گیا، وہ درج ذیل ہے۔

پانی تیرے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغان سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب
اے وادیِ لولاب!

گر صاحب ہنگامہ نہ ہوں منبر و محراب
دیں بندہء مومن کے لئے موت ہے یا خوب
اے وادیِ لولاب!

ہیں ساز پہ موقوف نواہائے جگر سوز
ڈھیلے ہوں اگر تار تو بے کار ہے مضراب
اے وادیِ لولاب!

ملا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی
بے سوز ہے میخانہ ء صوفی کے مئے ناب
اے وادیِ لولاب!

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیِ لولاب!

(ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض)

مجھے معلوم نہیں کہ ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری، وادی کشمیر کی ادبی تاریخ کا کوئی گمنام شاعر ہے یا علامہ اقبال کے تخیل کا ایک شاہکار، میں نے اسے اپنے افسانے کا ہیرو بنایا اور اس کا نام نور زماں نور لولابی رکھا۔ وہ ایک طالب علم شاعر ہے اور موسیقار بھی۔ پاک بھارت جنگ 65ء کے دوران، پہلے یا بعد میں سرینگر کی بیٹیوں نے علم بغاوت بلند کیا اور سرینگر کی نواحی آبادی "بٹ مالو" کو جلا کر راکھ کر دیا گیا تو سرینگر کی ایک بیٹی "زینت" نے نور زماں نور لولابی کو آمادہ کیا کہ وہ راکھ میں پڑا آزادی کا ساز اٹھالے۔ اس نے ساز اٹھالیا، اس کے ڈھیلے تار کسے تو " نغمے کو آواز مل گئی"۔ اس نے کتابیں جھیل میں پھینک دیں کیونکہ پہلے وہ صرف کتاب خواں تھا، اب صاحب کتاب بن چکا تھا۔

1971ء میں پاکستان سے "ایک ہزار سالہ غلامی کا انتقام" لیا گیا اور امریکی صدر نکسن

کا بحری بیڑا خلیج بنگال تک نہ پہنچ سکا۔ سقوط ڈھاکہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس کے بعد پاکستان آدھا رہ گیا۔ تیسرے سیز فائر پر کشمیر کی اداسی اتنی گہری ہوئی کہ ایسا لگا جیسے موت کے شہپروں نے پوری وادی پر اپنا منحوس سایہ ڈال دیا ہے۔

لیکن آج سے دس سال پہلے وادی کشمیر کے اندر سے آزادی کی ایک لہر پھر اٹھی۔ دیکھتے دیکھتے چناروں کی سوئی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ برف چوٹیوں سے چشمے ابلنے لگے۔ وہ کشمیری جسے حکمران ''ہاتو'' یعنی ''اوئے تو'' کہہ کر پکارتا تھا' اس نے کلاشنکوف اٹھالی اور کشمیر کو سات لاکھ فوج نے گھیرے میں لے لیا۔ کئی بٹ مالو اور بانڈی پور آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس تحریک آزادی کی قیادت کئی ضیغم لولابیوں نے کی ہے لیکن افسوس کہ 16 جولائی کو ضیغم لولابی مجبور ہو گیا کہ وہ کرگل کی چوٹیوں سے اتر آئے۔ اس نے کرگل کی چوٹیوں پر فتح کا جو جھنڈا لہرایا تھا' اسے ایک عالمی طاقت نے سرنگوں کروادیا۔

افسوس صد افسوس! کشمیر اور پاکستان کے شہیدوں کو اس چوتھے سیز فائر پر کوئی افسانہ اور کوئی نغمہ نصیب نہ ہوا کہ ٹی وی پر نشر ہوتا۔ ہم میں کوئی قیوم نظر موجود نہیں کہ کشمیر کی بیٹیوں کا ایک اور نوحہ لکھتا۔ آغا بابر جیسا ڈرامہ نگار بھی میسر نہیں کہ کرگل کی چوٹیوں سے اتر کر چوتھا سیز فائر لکھتا اور پرچم آزادی کے سرنگوں ہونے پر خود بھی شرمسار ہوتا اور جنہیں کشمیر سے محبت ہے' انہیں بھی شرمسار کرتا۔ کشمیر پر اداسی کا سایہ اتنا گہرا ہو گیا ہے کہ اب کوئی محمود ہاشمی اس کا نقشہ نہیں کھینچ سکتا۔

ستم تو یہ ہے کہ اس طرف کا کشمیری ریاست جموں کشمیر کی ایک پٹی پر کہ جسے ''آزاد کشمیر'' کہتے ہیں' رضامند ہو گیا ہے جیسا کہ مجاہد اول کے ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے جو ٹیلیویژن پر نشر ہوتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے کئی لیڈران کے ہمنوا ہو چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کنٹرول لائن کے تقدس کو امریکی انداز میں قبول کر لیا ہے۔ میں اقبال کی زبان میں کشمیر کے اس مرد مجاہد کی خدمت میں کہ جو بندہ درویش بھی ہیں اور جنرل ضیاء الحق مرحوم کے مرشد بھی' ضیغم لولابی کا یہ شعر نذر کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

نصیب خطہ ہو یا رب' وہ بندہء درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ

مذاکرات کی میز

مذاکرات کی میز بہت خوبصورت ہوتی ہے۔

کسی زمانے میں اسے گول میز کہا جاتا تھا اور گول میز پر جو مذاکرات ہوتے تھے' انہیں گول میز کانفرنس کا نام دیا جاتا تھا۔ کئی گول میز کانفرنسیں تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں۔ ایک گول میز کانفرنس سے مولانا محمد علی جوہر اتنے دل شکستہ ہو کر اٹھے کہ ان کے منہ سے بے اختیار ایک دعا نکلی اور وہ قبول ہوگئی۔ گول میز کانفرنس سے واپسی پر انہیں ترکی کے آزاد ملک کی سرزمین میں مدفون ہونے کی سعادت نصیب ہوگئی۔

مذاکرات کی میز گول نہیں ہوتی' بیضوی ہوتی ہے جیسے ہماری زمین ہے۔ یہ میز مہاگنی کی لکڑی کی بنی ہوتی ہے یا آبنوس کی۔ اس کی سطح سیاہی مائل ہوتی ہے اور بہت چمکتی ہے۔ اس کے گرد جو لوگ بیٹھتے ہیں ان کے سروں پر روشنی کا ہالہ ہوتا ہے یعنی یہ سر اتنے فارغ البال ہوتے ہیں کہ چھت میں لگے قندیل اور فانوس ان میں منعکس نظر آتے ہیں۔ انگریزی میں ایسے سروں کو "ایگ ہیڈز" (EGG HEADS) کہا جاتا ہے۔ ان سروں کے اندر ازل سے لے کر ابد تک کی تمام حکمت بھری ہوتی ہے۔ ان میں کوئی ارسطو ہوتا ہے اور کوئی افلاطون۔ کوئی بسمارک ہوتا ہے او کوئی گلیڈسٹون' کوئی چانکیہ ہوتا ہے اور کوئی میکیاولی۔

کبھی گول میز کانفرنس کی تصویر اخبار میں چھپتی تھی' اب اسے ٹیلیویژن کے خبرنامے میں چاروناچار دیکھنا پڑتا ہے۔ جب لوگ مذاکرات کی میز پر سے اٹھ کر باہر آتے ہیں تو کیمرے فلیش پر فلیش کرتے ہیں اور مائیکروفون ان کے منہ میں ٹھونسے جاتے ہیں' تو وہ بمشکل ایک یہ جملہ کہنے پر آمادہ ہوتے ہیں کہ "مذاکرات خوشگوار ماحول میں ہوئے۔ بات چیت کچھ آگے بڑھی"۔

بیسویں صدی کے آخر میں مذاکرات کی میز بہت اہمیت حاصل کر گئی ہے۔ یہاں طوعاً وکرہاً متحارب قوموں کو بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہاں جیتی ہوئی قوم ہار جاتی ہے اور ہاری ہوئی قوم جیت جاتی ہے۔ ہارنے والی قومیں اکثر جرم ضعیفی کی مرتکب ہوتی ہیں۔ اگر علامہ اقبالؒ آج زندہ ہوتے تو

فرماتے کہ جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات نہیں بلکہ مذاکرات کی میز ہے۔ جو ضعیف قومیں مذاکرات کی میز پر کج روی کا اظہار کرتی ہیں' انہیں میزائلوں اور راکٹوں سے سیدھا کر دیا جاتا ہے۔ ایک نہایت ہی ضعیف قوم کے بوڑھے صدر کو مذاکرات کی میز پر اتنے عرصے اور اتنے تواتر سے اٹھایا بٹھایا جا رہا ہے کہ اب وہ پا بجولاں قیدی کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے آتے ہیں اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اس پر بیٹھتے ہیں۔ کیا پتہ وہ مذاکرات کی میز کے پہلے شہید کا درجہ حاصل کر لیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ بوڑھے صدر کبھی بہت بڑے باغی لیڈر تھے اور ان کے آباؤ اجداد اس پورے ملک کے مالک تھے جس کی سرحد پر ان کے ملک کا نقطہ لگایا گیا ہے۔ دنیا کے نقشے پر یہ نقطہ خوردبین سے بھی نظر نہیں آتا۔

ایک ضعیف قوم کا ایک مسئلہ نصف صدی سے مذاکرات کی میز پر زیر بحث ہے۔ کیسے کیسے لوگ اس میز پر یہ کہتے ہوئے بیٹھے کہ مذاکرات کا نتیجہ اچھا بر آمد ہوگا اور اٹھے تو یہ کہتے ہوئے کہ ''بات چیت خوشگوار ماحول میں ہوئی ہے اور کچھ آگے بڑھی ہے''۔ جب یہ مسئلہ پہلی بار مذاکرات کی میز پر آیا تو اس ملک کے وزیر خارجہ نے اس پر چھ گھنٹے تقریر کی اور اس کے دوران ایک بار بے ہوش بھی ہوئے۔ ان کے مدمقابل نے سات گھنٹے تقریر کی اور وہ دو بار بے ہوش ہوئے۔

کچھوا تو رینگ کر اپنی منزل پر جا ہی پہنچتا ہے لیکن اس مسئلے کا کچھوا شاید دائرے میں رینگتا رہتا ہے کہ پھر اسی نقطے پر آ جاتا ہے' جہاں سے رینگا تھا۔

ایک نوجوان وزیر خارجہ یا مندوب نے مذاکرات کے ہال میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے اور ایک قرارداد کو پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ہوا میں اڑا دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک ٹکڑے پر ''ادھر تم' ادھر ہم'' کا سنہری سٹکر لگا کر انہوں نے چار سال حکومت کی اور اس کا جو انجام ہوا' وہ میرا قلم نہیں لکھ سکتا۔ بعد ازاں وزیر اعظم بننے کے بعد وہ مذاکرات کی میز پر بھی بیٹھے اور ایک معاہدے کی رو سے جسے ''شملہ معاہدہ'' کہتے ہیں' ایک کنٹرول لائن کو تسلیم کر کے اٹھے کہ آج جسے ''معاہدہ واشنگٹن'' نے مقدس قرار دے دیا ہے۔

اقوام عالم نے مذاکراتی میز پر نصف صدی پہلے اس مسئلے کا فیصلہ کر دیا تھا اور وہ یہ تھا کہ ریاست جموں و کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے اور اس علاقے کے لوگ آزادانہ استصواب کے ذریعے اپنی قسمت کا خود فیصلہ کریں گے یعنی ہندوستان کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ یا پاکستان کے

ساتھ۔ اس مسئلے کا اس کے علاوہ اور کوئی حل ممکن نہیں لیکن ہندوستان اس سے منحرف ہو گیا ہے اور اس نے جموں و کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بنالیا ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا اصرار ہے کہ اس مسئلے پر مذاکرات کی میز پھر بچھائی جائے۔ جس مسئلے کا فیصلہ ہو چکا ہے' اس پر مزید مذاکرات سے کیا فائدہ ہو گا؟ نجانے اس واحد سپر طاقت کے ورلڈ آرڈر میں جموں کشمیر کی کیا حیثیت ہے اور وہ اس کے نقشے میں کیا تبدیلیاں کرنا چاہتی ہے؟ لیکن اس کا جھکاؤ واضح طور پر ایک ارب فاقہ کش اور مفلوک الحال لوگوں کے بڑے ملک کی طرف ہے۔ وہ مذاکرات کی میز پر وہی فیصلہ کرائے گی جو اس بڑے ملک کے حق میں ہو گا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ معمولی ردوبدل کے ساتھ موجودہ کنٹرول لائن کو نہ صرف مقدس بلکہ مستقل قرار دے دیا جائے گا۔

لیکن کوئی ضروری نہیں کہ دنیا کی اس واحد سپر طاقت نے جو ''ورلڈ آرڈر'' تیار کیا ہے' وہ ضرور نافذ ہو کر رہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس سے بھی ایک بڑی قاہر و جابر طاقت موجود ہے جو فرعون کو بحیرہ قلزم میں ڈبو کر اس کا ورلڈ آرڈر غرقِ دریا کر سکتی ہے اور افغانستان میں ممولوں کو شاہباز سے لڑا کر اسے پرشکستہ کر سکتی ہے۔

ہمارے نوجوان وزیراعظم کو اگر مذاکرات کی میز بچھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ اسے اسلام آباد کے کسی خوبصورت کانفرنس ہال میں بچھائیں اور پاکستان کے بزرگ اور جوان رہنماؤں کو اس پر بٹھائیں اور اپنی ذاتی انا کو قومی انا پر قربان کر کے ان سے پوچھیں کہ اے زعمائے قوم! پس چہ باید کرو؟

23 اگست 1999ء

بم دھماکے اور میں

جب کوئی بم دھماکہ ہوتا ہے‘ تو میں اندر سے ہل جاتا ہوں!

میرا زندگی پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور اس کی معنویت میری نظروں میں مشکوک ہو جاتی ہے۔ آفات ارضی وسماوی سے بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت ذہن میں پیدا ہوتی ہے لیکن یہ انسان کے لئے عبرت کا سامنا بھی مہیا کرتی ہیں۔ جنگوں میں سپاہی اپنا دفاع کرسکتا ہے اور سویلین کو کم از کم یہ اطمینان تو حاصل ہوتا ہے کہ وہ قوم و وطن کی غیرت پر قربان ہو رہا ہے لیکن بم دھماکے میں کام آنے والے بیچارے نہ شہید ہوتے ہیں‘ اور نہ زخمی ہونے والے غازی۔

بم دھماکوں سے کوئی دفاع ممکن نہیں۔ وہ لوگ جو گھر سے محنت مزدوری کے لئے نکلتے ہیں یا سفر کی حالت میں ہوتے ہیں‘ انہیں کیا پتہ کہ اگلے لمحے ان پر کیا گزرنے والی ہے۔ ایک آدمی کے مرنے سے کئی اور آدمی بھی مرجاتے ہیں۔ عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں اور بچے یتیم‘ رستے بستے گھر اجڑ جاتے ہیں۔

بم دھماکے انسان کی نفسیات پر بہت منفی اثر ڈالتے ہیں۔ پوری زندگی کا سرمایہ جسے ہم ایمان کہتے ہیں‘ متزلزل ہو جاتا ہے اور یہ خوف ہر انسان کے ساتھ لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کس موڑ پر کہاں بم دھماکہ اس کی تاک میں گھات لگائے بیٹھا ہے۔

بم دھماکے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں دشمن کے ملک میں اس سے بھی بڑا دھماکہ ہوتا ہے اور دونوں طرف بے گناہ لوگ ہی مارے جاتے ہیں۔ بم دھماکوں کے گنہگار کبھی کیفر کردار کو نہیں پہنچتے۔ چند استثنائی صورتوں کے علاوہ کوئی بڑا گنہگار پھانسی کے تختے تک نہیں پہنچ سکا۔ جو لوگ بم دھماکوں کے منصوبے تیار کرتے ہیں‘ ان کے سروں پر سفارتی چھتر سایہ فگن ہوتا ہے۔

بم دھماکوں مین جو لوگ ہلاک ہوتے ہیں‘ حکومت ان کے لواحقین کو کچھ رقم دے کر اپنے ضمیر کو مطمئن کرلیتی ہے۔ اگر فرصت ہو تو کوئی وزیر ان کے گھروں میں جا کر تعزیت کے دو لفظ

بھی کبھار آتا ہے اور زخمیوں کی عیادت کے لئے کوئی وزیر ہسپتال میں بھی چلا جاتا ہے اور اس کی تصویر اخبار میں آجاتی ہے یا ٹیلی ویژن کی سکرین پر۔ مرنے والے کے لواحقین کو زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ کا چیک دیا جاتا ہے اور زخمیوں کو بیس پچیس ہزار پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر ساری عمر کے لئے اپاہج ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اکثر اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کی روزی شاخ آہو پر ہوتی ہے۔ جو ہر روز کا لقمہ اس ہاتھ دے' اس ہاتھ لے' کے اصول کے تحت کماتے ہیں۔ ان میں کئی اپنی خودداری کا خون کر کے سڑک کے کنارے بھیک مانگنے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔

24 مئی کو ڈسکہ میں جو بم دھماکہ ہوا' اس کی گونج معرکہ کارگل کی حشر سامانیوں میں گم ہوگئی۔ اب تو ہم یہ بھی بھول چکے ہیں کہ کتنے مزدور تھے جو اس دھماکے کے نذر ہوئے اور کتنے زخمی ہیں جو معذور ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ گھر سے رزق حلال کمانے آئے تھے' جس کے لئے بہت پسینہ بہانا پڑتا ہے اور اس میں ان خون بھی شامل ہو گیا۔

حال ہی میں دو دھماکے آزاد کشمیر میں ہوئے ہیں۔ ان کے شہیدوں میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ یہ بس اور ویگن پر سوار ہو کر سفر کے لئے گھر سے نکلے تھے لیکن منزل پر نہ پہنچ سکے یا شاید صحیح منزل پر پہنچ گئے۔ بڑے خونی دھماکے تھے کہ بے گناہوں کے پرخچے اڑ گئے' اخباروں میں جو خبریں آئیں' انہوں نے دہلا کر رکھ دیا۔ اتنا خوف محسوس ہوا کہ اب لکھتے ہوئے میرا قلم لرز رہا ہے۔ ٹیلی ویژن پر بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ انہیں اس خون ناحق کا کتنا معاوضہ ملا؟

البتہ میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تینوں دھماکوں کا کوئی مجرم پولیس کے ہتھے نہیں لگا۔ ممکن ہے کبھی کوئی مجرم اتفاق سے پولیس کے ہاتھ لگ جائے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ آج تک سینکڑوں دھماکے ہوئے ہیں جنہیں پولیس کی فائلیں کھا گئی ہیں یا یہ کہ ان کی قبر میں دفن ہو چکے ہیں۔

ہمیں بم دھماکے افغانستان کی آزادی کے صلے میں ملے۔ افغان حکمران ڈاکٹر نجیب اللہ کے زمانے میں ان کا آغاز ہوا۔ ہزاروں پاکستانیوں کے پرخچے اڑے۔ بس کے اڈے اور ریلوے سٹیشنوں کے پلیٹ فارم لہو سے سرخ ہو گئے۔ ایک سپر پاور کے ''ورلڈ آرڈر'' کی ایک شق پوری ہو گئی کہ دوسری سپر پاور کو اس نے افغانستان سے نکال باہر کیا۔ ان بم دھماکوں سے افغانستان کو کیا ملا؟ یہ ٹھیک ہے کہ نجیب اللہ اور اس کی کابینہ کے کئی وزیروں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا

لیکن آج کل اس ملک میں جو خوں ریزی ہو رہی ہے' اس کے لئے کس ملک کے صدر کو تختۂ دار پر لانا چاہیے؟

بم دھماکوں میں ہلاک نہ ہونے والے علامہ اقبالؒ کے ایک مصرعے کے مطابق' نہ کافر ہیں نہ غازی۔ وہ شہید محبت ضرور ہیں' اس لئے شہید ہوئے کہ وہ پاکستانی ہیں۔ انہیں کوئی سند' کوئی تمغہ' کوئی نشان نہیں ملے گا۔ ان کی قبریں بھی بے نشان رہیں گی۔ ان پر کون پھولوں کی چادر چڑھانے جائے گا؟

اس کی تلافی صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ:

1۔ ان کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔

2۔ ایک رفاہی ادارہ قائم کیا جائے کہ بم دھماکوں میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کو مستقل امداد دی جا سکے۔ بیواؤں کی پنشن مقرر کی جائے اور یتیموں کی سرپرستی۔ انہیں وظیفے ملنے چاہئیں۔

3۔ جو لوگ زخمی ہوئے ہیں' ان کی بحالی کا انتظام کیا جائے۔ جو معذور ہو چکے ہیں' انہیں مصنوعی اعضا لگوائے جائیں اور انہیں تاحیات پنشن دی جائے۔ ورنہ ہر بم دھماکے کے بعد ملک میں بے روزگاروں اور بھک منگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے گا اور سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہمارے تفتیشی ادارے حقیقی معنوں میں فعال بنیں۔ صرف کارروائی نہ ڈالیں' خدا کرے ہماری پولیس میں جذبہ حب الوطنی پیدا ہو کہ مجرموں کی تلاش میں اپنا عیش و آرام تج سکے...... انہیں کونے کھدروں سے ڈھونڈھ نکالے اور عدالت سے انہیں عبرت انگیز سزا دلوائے! لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب پولیس کو سیاستدانوں کی ڈیوٹی سے نجات دی جائے۔

7 ستمبر 1999ء

دلہن بنی کپاس

کپاس کو دلہن بننے میں چھ ماہ لگ جاتے ہیں!

اس عرصے کے دوران اسے بہت سی آفاتِ ارضی وسماوی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کا محافظ جسے عرفِ عام میں کسان کہا جاتا ہے‘ اس کی نگہداشت میں سستی و غفلت سے کام لے‘ تو دلہن پر رنگ روپ نہیں آتا۔ یہ دلہن ہے بھی بہت نازک مزاج۔ لُو کا تیز جھونکا اسے جھلسا دیتا ہے اور بے وقت بارش کا ایک چھینٹا بھی اسے راس نہیں آتا۔ کہتے ہیں کہ یہ صحرائی پودا ہے جسے قدیم مصر کے فلاحین نے نیل کے پانی سے سیراب کیا اور اس کے مزاج میں قلوپطرہ جیسی نزاکت آ گئی۔ سندھ اور اس کے معاونین نے اسے مزید نازک اندامی اور حسن و تابانی عطا فرمائی۔ کھجور صحرائے عرب کی حور ہے اور کپاس وادی سندھ کی دلہن۔

اسے دلہن بنانے کے لئے کسان کو بہت جہاد کرنا پڑتا ہے۔ ابھی اس پر شیر خوارگی کا عالم ہوتا ہے کہ سبز تیلا اور کالا تیلا اس کا رس چوسنے کے لئے اس پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ اس کی سب بڑی دشمن سنڈی ہے۔ لاہور کے قدیم باسیوں نے سنڈی کو اور شاید کپاس کے پودے کو پہلی بار ٹیلی ویژن کی سکرین پر دیکھا ہوگا۔ میرے ایک پوتے نے جو خیر سے لاہوریا ہو چکا ہے‘ مجھ سے پوچھا ’’دادا! آپ نے سنڈی دیکھی ہے؟‘‘ میں نے جواب دیا ’’صرف دیکھی ہی نہیں‘ اس سے کھیلتے بھی رہے ہیں‘‘

جو سنڈی ہم نے بچپن میں دیکھی تھی وہ ہرے رنگ کی ہوتی تھی اور بظاہر بڑی بے ضرر سی نظر آتی تھی۔ ہم تنکے سے اسے چھیڑتے تو وہ سو سو بل کھا جاتی ہے۔ ہم اسے ’’کنجری‘‘ کہتے اور اس کے رقص سے محفوظ ہوتے تھے۔ میں فطرتاً رحم دل بچہ تھا۔ ایک دو بار نچا کر اسے جانے دیتا۔ لیکن میرے کچھ شریر ساتھی اسے تگنی کا ناچ نچاتے اور سیر نہ ہوتے۔

اور اب یہی سنڈی ملک کے لاکھوں کسانوں کو تگنی کا ناچ نچاتی ہے! اس نے اپنا روپ تو نہیں بدلا‘ رنگ بدل لیا ہے۔ کوئی سنڈی چتکبری ہوتی ہے‘ کوئی گلابی‘ ایک کا رنگ زرد ہے اور

اسے امریکی سنڈی کہتے ہیں۔ کیا امریکی سنڈی امریکہ سے درآمد ہوئی؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو میرا یہ گمان بھی درست ہوگا کہ یہ سنڈی اس لئے درآمد ہوئی کہ امریکہ کی کیڑے مار دوائیوں کو پاکستان میں بھیجنے کا جواز پیدا ہو جائے۔

ایک کارٹون میں تینوں سنڈیوں کو آپس میں مکالمہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان میں گلابی سنڈی 'ملکہء عالم' نظر آئی حالانکہ یہ درجہ امریکی سنڈی کو حاصل ہونا چاہئے تھا۔ سب سے خطرناک سنڈی چتکبری ہے۔ یہ بورر ہے یعنی سوراخ کر کے کپاس کے ٹنڈے کے اندر چلی جاتی ہے اور روئی کو کھاتی رہتی ہے۔ یہ نظر نہیں آتی اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ ٹنڈے سے باہر ہو تو اس پر سپرے کارگر ہوتا ہے ورنہ سپرے بھی بے کار ہے۔

کپاس پر حملہ آور ہونے والی آفات میں ایک سفید مکھی بھی ہے۔ یہ پتے پر منڈلاتی ہے تو بہت بھلی لگتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ جو شے بھلی لگے وہ اچھی بھی ہو۔ کپاس کی ایک پیراسائٹ جُوں بھی ہے۔ انسانی جُوں بھی بہت خطرناک چیز ہے کہ وہ انسان کا خون چوستی ہے اور کپاس کی جُوں اس کا رس۔ میرا خیال ہے کہ ٹنڈے کے شگافتہ ہونے کے بعد یہ روئی میں پناہ لے لیتی ہوگی جس سے روئی کی چمک ماند پڑ جاتی ہوگی۔

کپاس کو لگنے والی ہر پیسٹ (PEST) اور پیرا سائٹ کے لئے پیسٹیسائڈ (PESTICIDE) موجود ہے لیکن انسانی معاشرے کو لگنے والی کسی ایسی بیماری کے لئے کوئی زہر موجود نہیں۔ عجیب بات ہے کہ کپاس کے کھیت یا انسانی معاشرے کی کسی پیسٹ یا پیراسائٹ کی مکمل طور پر نسل کشی نہیں ہو سکتی بلکہ زہر کھا کھا کر وہ اور بھی پھلتی پھولتی ہے۔

کپاس کے کھیت میں پھول آئے ہوں تو منظر بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ پھول بھی کئی رنگ کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ رنگارنگ پھولوں کا جو نظارہ میں نے پوست کے کھیت میں دیکھا' وہ کہیں اور نظر نہ آیا۔ کینولا اور سورج مکھی کا کھیت بھی بہت دلکش سماں پیش کرتا ہے لیکن رنگ میں یکسانیت ہوتی ہے۔

تاہم کپاس کے کھیت کا وہ منظر سب سے زیادہ دلکش ہوتا ہے' جب اس کے ٹنڈے شگافتہ ہوتے ہیں اور ہر جھروکے سے کپاس کی دلہن کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے اور جب کپاس چننے والیاں جھلونگیاں باندھے ٹنڈوں سے کپاس کی چاندی نکال رہی ہوتی ہیں' تو ہونا یہ چاہئے کہ کپاس کی چاندی کسان کے لئے سونا بن جائے لیکن ہوتا یہ ہے کہ کپاس سونا ان کے لئے بنتی ہے

جنہوں نے اسے چاندی بنانے کے لئے ایک بھی مکھی یا جُوں نہیں ماری ہوتی۔ بلکہ کپاس جونہی دلہن بنتی ہے، سارے سبز تیلے، کالے تیلے، سفید مکھیاں، چتکبری، گلابی اور امریکی سنڈیاں پاکستان پر حملہ آور ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی جوئیں بھی خوں آشامی میں کسی سے پیچھے نہیں رہتیں۔

کسان بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایکڑ دو ایکڑ کپاس بونے والے کسان اور مربعوں پر محیط فارم میں کپاس کاشت کرانے والے فارمر۔ یہ بھی اپنے آپ کو کسان کہلوانا پسند کرتے ہیں۔

سنڈیاں اور تیلے دونوں قسم کے کسانوں پر حملہ آور ہوتے ہیں لیکن بڑا کسان ان کا حملہ روکنے کی قوت رکھتا ہے اور چھوٹا کسان اپنے ''کٹے وچھے'' بیچنے کے باوجود پوری پوری مدافعت سے محروم ہے۔ وہ قرضہ لینے کے لئے ''ون ونڈو'' پر ساری فصل کے دوران کھڑا رہتا ہے اور اس کا ہاتھ خالی رہتا ہے۔ اس وجہ سے وہ جنگ ہار جاتا ہے۔ بڑا کسان گھر بیٹھے اس ایک ونڈو سے سب کچھ وصول کر لیتا ہے اور واپسی کی ہر ونڈ بند کر دیتا ہے۔

چنانچہ آپ نے اشتہارات میں اکثر دیکھا ہوگا کہ یہ لحیم شحیم بڑا کسان اپنے فارم میں کھڑا ہو تو سلطان بحر و بر نظر آتا ہے اور نحیف و نزار چھوٹا کسان اپنے کھیت میں بھی کھڑا ہو تو عجز و درماندگی کا مجسمہ دکھائی دیتا ہے۔

24 ستمبر 1999ء

ترقی کا ''میراج''

وہ چھوٹے چھوٹے کسانوں کا ایک گاؤں تھا۔ اس گاؤں کے پرائمری سکول میں کبھی ٹاٹ بچھتے تھے اور اب ایک عرصے سے سرکار نے ٹاٹ سپلائی نہیں کئے تھے۔ بچے گھر سے بوری کا ایک ٹکڑا اٹھا لاتے اور چھٹی کے بعد لپیٹ کر گھر لے جاتے۔ ان کے بستے میں دو چار کتابیں ہوتیں اور تختی اور سلیٹ سے زیادہ کام لیا جاتا۔ پھر یوں ہوا کہ ان کا بستہ بھرنا شروع ہو گیا اور تختی اور سلیٹ کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ ان کی جگہ کاپیوں نے لے لی اور سلیٹی اور قلم کی جگہ پنسل نے۔ تب بستہ اتنا بھاری ہو گیا کہ کسان کی پشت پر آخری تنکا بن گیا۔ چنانچہ کسانوں کے بچے پنسل اور کاپی نہ ملنے پر خود بخود سکول سے اٹھنے لگے۔

کسانوں کو بلکہ کمی کمیروں کو بھی اپنے بچوں کو پڑھانے کا شوق تھا۔ ان کے بچے اتنا تو پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے کہ ڈپٹی کمشنر بن جائیں لیکن کچھ خوش قسمت پٹواری بن جاتے تھے اور کچھ پولیس کے سپاہی۔ اب ٹاٹ، تختی اور سلیٹ کے غائب ہونے سے ان کی امیدوں کا یہ دیا بھی ٹمٹانے لگا تو گاؤں کے لوگ وفد بنا کر اپنے ایم این اے سے ملے کہ اگر سکول کو آباد رکھنا ہے تو تعلیمی اخراجات کم کئے جائیں۔ ہم اب اس قابل نہیں رہے کہ اپنے بچوں کو مسلسل کاپیاں اور پنسلیں خرید کر دیتے رہیں۔

ایم این اے سکولوں کی آبادی کا کچھ زیادہ دلدادہ نہیں تھا۔ میٹرک بھی اس نے سینتیس سال کی عمر میں کسی اور کو اپنی جگہ بٹھا کر پاس کیا لیکن گاؤں میں ووٹروں کی تعداد خاصی تھی اور اگلا الیکشن بھی قریب تھا۔ اس کے کہا ''میں اسمبلی کے اگلے اجلاس میں اس مسئلے کو اٹھاؤں گا''۔ اس کے سوال پر وزیر تعلیم نے جواب دیا کہ ہم بہت جلد ایک ایسی تعلیمی پالیسی وضع کرنے والے ہیں کہ پرائمری تک تعلیم مفت اور لازمی ہو جائے گی، کتابیں اور کاپیاں بچوں کو مفت ملا کریں گے بلکہ ہم غریبوں اور امیروں کے سکولوں میں تفاوت بیک قلم ختم کر دیں گے اور ٹاٹ کی جگہ پرائمری سکولوں میں ڈیسک اور کرسی والا تعلیمی کلچر نافذ ہو گا''۔

اور ایک دن یہ پالیسی ملک میں نافذ ہوگئی۔ کچھ سکولوں کو اس تجربے کے لئے منتخب کرلیا گیا۔ خوش قسمت دیہات کی فہرست میں اس گاؤں کا نام بھی آ گیا۔ سکول کی عمارت کی مرمت کرائی گئی اور کمرے نئے تعمیر کئے گئے۔ سکول کے گرد چار دیواری بھی کر دی گئی۔ ڈیسک اور کرسیاں بھی بن کر آ گئیں۔ اساتذہ کو بھی کرسیاں' میز اور نئے بلیک بورڈ دیئے گئے۔ والدین کو صرف یہ تکلیف دی گئی کہ وہ بچوں کو نئی یونیفارم سلوا دیں اور اساتذہ سے کہا گیا کہ وہ بھی ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہن کر سکول آیا کریں۔

اور اس سال یکم اپریل کو سکول کے صحن میں جو مارننگ اسمبلی تقریباً 10 بجے منعقد ہوئی' وہ اس گاؤں کے پرائمری سکول کی ایک یادگار اسمبلی تھی کیونکہ اس میں صوبائی وزیر تعلیم' علاقے کے ایم این اے اور ایم پی اے' یونین کونسل کا چیئرمین اور کونسلر اور محکمہ تعلیم کے افسر شریک ہوئے۔ ٹیلی ویژن کے لوگ بھی آئے اور اخبارات کے رپورٹر بھی۔ گاؤں کے لوگ بھی جمع تھے۔ غرض یہ کہ میلے کا سا سماں تھا۔ ''لب پہ آتی ہے دعا'' اگرچہ سر تال کے اعتبار سے کچھ زیادہ قابل رشک نہ تھی لیکن پر اثر ضرور تھی۔

صوبائی وزیر تعلیم نے اپنے دست مبارک سے لڑکوں کو کتابوں' کاپیوں اور پنسلوں والا ایک ایک بستہ عطا فرمایا اور اس دوران کیمرے کھٹ کھٹ کرتے رہے۔ اس کے بعد لڑکے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور کرسیوں اور ڈیسکوں پر جا بیٹھے۔ وزیر صاحب اور معززین نے ہر کمرے کا دورہ کیا اور کیمرں نے تصویریں لیں۔ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی اساتذہ گویا بلیک بورڈوں پر پل پڑے۔ اس سے قبل بلیک بورڈ کے استعمال کا اتنا شوق کبھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ کیوں نہ ہوتا' آج سے ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا!

پانچویں جماعت کے استاد نے جو اوّل مدرس بھی تھے' ایک محاورہ لکھا' ...... ''ترقی کا میراج'' ...... اور لڑکوں سے کہا کہ اسے استعمال کریں۔ لڑکے حیران ہوگئے۔ ایک لڑکے نے جرات سے کام لیا اور کہا' ''منشی جی! کتاب میں تو ''ترقی کی معراج'' لکھا ہوا ہے''۔

''پہلے تو یہ بات ذہن نشین کرلو کہ آج سے اپنے استاد کو 'منشی جی' 'سر' کہہ کر مخاطب کیا کرو اور دوسری بات یہ ہے کہ کیا تم نے پچھلے یوم پاکستان پر میراج طیارے اڑتے ہوئے نہیں دیکھے تھے؟'' استاد صاحب نے پوچھا۔

''دیکھے تھے!'' سب لڑکے بیک زبان بولے کیونکہ گاؤں میں دو چار ٹیلی وژن سیٹ

بھی تھے۔اس رات ان ٹیلی وژنوں کے سامنے گاؤں کے لوگوں کا جھمگٹا لگا ہوا تھا۔خبر نامے میں مارننگ اسمبلی کی حمد سنائی اور دکھائی گئی۔عجیب بات تھی کہ آوازیں بہت رسیلی ہو گئی تھیں اور جب وزیر محترم نے پہلا بستہ پہلے لڑکے کے ہاتھ میں تھمایا تو یہ مصرع کہلوایا جا رہا تھا'' ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا''۔

ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ بستوں کے سٹریپ ٹوٹ گئے اور لڑکے منج کی رسیاں باندھ کر کام چلانے لگے۔کرسیاں اور ڈیسک شکستہ ہو گئے کیونکہ لکڑی کو گھن کھا گیا تھا۔غریب والدین بچوں کو کاپیاں اور پنسلیں مہیا کرنے سے عاجز آ گئے۔انہوں نے پھر ایم این اے سے رجوع کیا۔اس نے اسمبلی میں سوال اٹھایا۔وزیر تعلیم نے جواب دیا'' اگلے سال کی قسط پائپ لائن میں ہے''۔یہ جملہ گاؤں والوں کی سمجھ میں نہ آیا۔

لوگوں نے محکمہ تعلیم میں درخواست دی کہ اگر ہمارے بچے اس قابل نہیں کہ کرسی اور ڈیسک پر بیٹھ سکیں تو انہیں ٹاٹ ہی مرحمت فرما دیئے جائیں۔لیکن سرکار ترقی معکوس کی قائل نہ تھی۔چنانچہ کاٹھ کباڑ کمروں کے ایک طرف لگا دیا گیا اور فرش پر بوریوں کے ٹکڑے پھر سے بچھ گئے۔اساتذہ نے سلیٹ اور تختی کا استعمال پھر سے جائز قرار دے دیا۔

اگلے سال یکم اپریل کو پانچویں جماعت کے استاد نے تختہ سیاہ پر'' ترقی کی معراج'' لکھ کر لڑکوں سے کہا کہ اسے اپنے جملے میں استعمال کریں۔ایک لڑکا جو پانچویں جماعت کے محکمانہ امتحان میں پاس نہ ہو سکا تھا' بول پڑا'' سر! پچھلے سال تو آپ نے'' ترقی کا میراج' استعمال کروایا تھا''۔

'' اس سال تم ڈیسک اور کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے''۔استاد صاحب بولے'' گویا ترقی کے میراج پر اڑ رہے تھے اور آج تم پھر سے بوری کے ٹکڑے پر بیٹھے ہوئے ہو۔مزید برآں آج سے میں 'سر' نہیں' 'منشی جی' ہوں''۔

15 اکتوبر 1999ء

بزرگوں کا پیکج

ٹیلیویژن پر پیغام تو مجھے بھی ملا تھا لیکن افسوس کہ ناسازیٔ طبع کے باعث تمغے عطا ہونے والے جلسے میں شامل نہ ہو سکا۔ یوں کوئی ضروری بھی نہیں تھا کہ تمغے کا قرعہ میرے نام بھی نکل آتا۔ اس کا تجربہ مجھے پہلے سے ہے۔ مجھے اکادمی ادبیات پاکستان کے ہر سالانہ جلسے میں شمولیت کا دعوت نامہ ملتا رہا' سوائے اس کانفرنس کے دعوت نامے کے جو محترم جناب فخر زمان صاحب کے عہد جلیلہ اور زمانۂ فخریہ میں بین الاقوامی انداز میں منعقد ہوئی اور جس پر اس غریب قوم کا پونے تین کروڑ کا معمولی سا خرچہ اٹھا۔ اس میں اندر اور باہر کے صرف ایک ہزار ادیب یا ادیب نما لوگ جمع ہوئے تھے اور یہاں تو 29 لاکھ جینوین (GENUINE) بزرگوں میں سے منتخب ہونے کا مسئلہ تھا۔ ٹیلیویژن پر اس جلسے کی کارروائی دیکھی جو مختصر بھی تھا اور منتشر بھی۔ بزرگی و احترام کا اتنا بڑا مجمع لیکن اتنا بجھا بجھا سا۔ اگر کانفرنس ہال میں برودت زدہ بزرگوں کی بجائے پندرہ سو نوجوان ہوتے تو میاں کے نعرے سقف شگاف بن جاتے۔ اس کی کچھ کمی زاہد انور واہلہ کے جوش و خروش سے پوری ہوئی۔ اپنے قائد کا کوئی والہ و شیدا ہو تو ایسا ہو۔ 29 لاکھ بوڑھوں کے سرخیل بابائے پوٹھوہاری کو طوالت عمری کی ٹرافی ملی۔ ان کی عمر صرف 135 سال ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی جوانی کو نظر بد سے دور رکھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پوٹھوہار کا یہ گاؤں ''شانگری لا'' ہے یا بوڑھوں کی جنت۔ مجھے خوف ہے کہ پاکستان کے مرفہ الحال بوڑھے کہیں اس گاؤں کا رخ نہ کر لیں اور فضا پیرانہ سالی کے ہر لوث سے ملوث نہ ہو جائے مثلاً قرآن مقدس کے مطابق ایک ہزار سال زندہ رہنے کی تمنا اور اس کے ساتھ قارون کے خزانے کی ہوس ہے کہ یہودی سائیکی کے اجزائے طبعی ہیں' دنیا کے ہر ''شانگری لا'' کو پولیوٹ (POLLUTE) کیا جا سکتا ہے۔ اب تو ''کے۔ٹو'' کی چوٹی بھی پولیوٹ ہو چکی ہے۔

دوسری وجہ اس جلسے میں شرکت نہ کرنے کی یہ تھی کہ ابھی میں عمر عزیز کا سترواں (77واں) سال بھی پورا نہیں کر سکا اسلئے مجھے گولڈ میڈل ملنے کی امید نہ تھی۔ گولڈ میڈل کی مجھے

بہت حسرت ہے۔ ابھی تک میں کسی گولڈ میڈل کا حقدار نہیں بنا حالانکہ چالیس سال تک ایک استاد کی حیثیت سے قوم کی خدمت کی۔ فارغ وقت میں ادب کی آبیاری میں مصروف رہا۔ اب تک نو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ دسویں کتاب عنقریب اپنے خرچ پر شائع کر رہا ہوں (پنشن سے کوڑی کوڑی جوڑ کر) واضح رہے کہ آج کا پبلشر صرف اس ادیب کی کتاب چھاپتا ہے جو اشاعت کا خرچہ بھی برداشت کر سکے۔ جب میری پہلی کتاب چھپی تھی تو اس وقت جن بچوں کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے' آج ان کے گلوں میں اتنے گولڈ میڈل حمائل دیکھ رہا ہوں کہ مزید گولڈ میڈل ملیں تو ان کی پیشانیوں پر چسپاں کرنے پڑیں گے۔

لیکن میں گولڈ میڈل کے لئے سو سال عمر پانے کی تمنا بھی نہیں رکھتا بلکہ جوں جوں عمر بڑھ رہی ہے میں اس خوف میں مبتلا ہو رہا ہوں کہ کہیں طوالت عمری کی اس منزل پر نہ پہنچ جاؤں جسے باری تعالیٰ نے ''ارزل'' قرار دیا ہے۔ میں اس سے حفظ وامان کی دعا مانگتا رہتا ہوں' اگرچہ میں ان خوش قسمت بوڑھوں میں سے ایک ہوں جو پوتے پوتیوں میں گھرا ہوا ہے اور اپنی قلیل سی پنشن کو اپنا جیب خرچ جانتا ہے۔ اس سے پوتے پوتیوں کے لئے ٹافیاں تو خرید سکتا ہے' بیمار ہو تو ڈاکٹر کو فیس دے کر دوائیں نہیں خرید سکتا' اسلیئے بیماری کے ساتھ زندگی گزارنے پر بھی قناعت کر لیتا ہے۔ آدمی بوڑھا ہو یا جوان کسی کو خواہشات سے مفر نہیں اور ہر خواہش پہ اس کا دم بھی نکلتا ہے۔ میں نے کسی خواہش کو ''درد جگر'' نہیں بنایا۔ ''دردسر'' ہو تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ ہاں کبھی کبھار کسی ''شانگری لا'' میں جانے کی خواہش نے ضرور غلبہ حاصل کیا ہے۔ یعنی کسی پہاڑ کے دامن میں ایک کٹیا ہو لیکن بجلی کے چراغوں سے روشن اور جس کے آتش دان میں آگ بھی دہک رہی ہو۔ میں مہاتما بدھ نہیں بننا چاہتا لیکن فطرت سے قریب ہو کر اس لمحے سے آگے جانا چاہتا ہوں جب عدم سے وجود نے جنم لیا تھا۔ وزیر اعظم نے بزرگوں کو رعایات کا جو پیکج دیا ہے اس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں لیکن ان سے بہت کم بزرگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ البتہ جن بوڑھوں کو اپنے ذرائع سے بڑھاپے کی عمر گزارنے کی توفیق حاصل نہیں' انہیں اولڈ ایج پنشن دی جائے تو بہت بڑا احسان ہو گا۔ ان کے لئے اولڈ ہوم بنایا جائے تو مزید احسان ہو گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن نے بزرگوں کی خدمت کا فریضہ اولاد کے کندھوں پر ڈالا ہے لیکن کتنے لوگ ہیں جو اس فرمان خداوندی سے آگاہ ہیں اور اس عمل کرتے ہیں؟ میرا جواب ہے کہ بہت کم۔ حالت یہ ہے کہ پاکستان میں جوان لوگ بھیک مانگ کر گزارا کرتے ہیں' وہ اپنے بوڑھے باپ دادا کی کیا خدمت کریں گے۔

ان بے سہارا بوڑھوں کے لئے دارالامان بنائے جائیں تاکہ وہ بڑھاپے کی زندگی آرام سے گزار سکیں۔

پاکستان میں ہسپتال بہت کم ہیں اور اتنے دور ہیں کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے بچے جوان اور جوان بوڑھے اور بوڑھے قبر رسیدہ ہو جاتے ہیں۔ انتارش ہوتا ہے کہ کیو میں لگ کر کوئی بوڑھا ڈسپنسری کی کھڑکی تک صحیح سالم نہیں پہنچ سکتا۔ جب پہنچے گا تو رعشہ زدہ ہاتھ سے شیشی گر کر ٹوٹ جائے گی اور لوگ واویلا مچائیں گے کہ بابا اپنی شیشی تو توڑ بیٹھے' اب راستے سے تو ہٹ جاؤ۔ بوڑھوں کو سیر کے لئے پارکوں میں ضرور جانا چاہئے۔ لیکن لاہور کے ہر پارک پر لڑکوں کا قبضہ ہے جو کرکٹ کھیلتے ہیں اور کوئی برخوردار ہٹ لگاتا ہے تو بنچ پر بیٹھے ہوئے بوڑھے کو مرزا غالب کی طرح اپنا سر یاد آ جاتا ہے۔ بزرگ لائبریویوں میں کیا جائیں گے۔ لائبریریوں کو ان کے پاس چل کر آنا چاہئے۔ وہ کون سی بستی ہے جہاں بوڑھوں کے لئے ریڈنگ روم قائم ہیں؟ بزرگوں کی کلبیں قائم ہوں تو وہ کچھ گپ شپ بھی کر سکیں۔ گپ شپ بوڑھوں کے لئے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔ کبھی کبھار سیاسی بحث میں ان کا چلّو بھر لہو کھول بھی اٹھے تو کوئی ہرج نہیں بلکہ ان کا کتھارسس ہو جائے گا۔ اخبار اتنا باریک چھپتے ہیں کہ خوردبین لگا کر پڑھنے پڑتے ہیں۔ ٹیلیویژن پر آج کل سلسلہ وار کھیل کھیلتے ہیں' بیچارے بوڑھوں کو پچھلا سلسلہ بھول جاتا ہے اور پھر اشتہارات کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ رہی سہی مت بھی ماری جاتی ہے۔ بوڑھے اگر بار بار پوچھنے کی جسارتِ بزرگانہ کریں تو پاس بیٹھے پوتے پوتیوں کو کہنا پڑتا ہے ''دادا جی! سمجھ نہیں آ رہی تو جا کر سو جائیے''۔

سولہ لاکھ کا کنگلا

آج سے نو سال پہلے جب میرے ایک بیٹے نے اس کالونی میں مکان تعمیر کیا' تو یہاں آبادی بہت کم تھی۔ اردگرد کی وسیع و عریض کالونیاں بھی ابھی خالی تھیں۔ اب میں اپنے ایک مضمون پاکستان اکیسویں صدی میں سے ایک اقتباس درج کرتا ہوں۔

''میری نظروں کے سامنے کھلے میدان کا ایک منظر ہے۔ جس میں پکی سڑکیں ایک دوسری کو قطع کر رہی ہیں اور ان کے کنارے درختوں کی بجائے کھمبے اُگ آئے ہیں۔ سامنے کی پکی سڑک پر گدھی پر سوار ایک دودھی ٹاؤن شپ کی طرف جا رہا تھا۔ گدھی کی پشت پر دو ولٹوہیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ ایک ادھر' ایک ادھر۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک چھوٹی سی بچی چل رہی ہے۔ تھک جاتی ہے تو اچک کر دودھی اور ولٹوہیوں کے درمیان گدھی کی پشت پر جو حصہ خالی ہے' اس پر سوار ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھار سیر کرتے ہوئے ان سے ملاقات بھی ہو جاتی ہیں۔ میں سڑک کے کنارے کنارے چلتا ہوں اور گدھی بھی۔ ایک بار شام کے جھٹپٹے میں ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وجہ یہ ہے کہ دودھی کو بہت کم سجھائی دیتا ہے اور مجھے بہت کم سنائی دیتا ہے۔ بچی چلا کر ہمیں متنبہ نہ کرتی تو گدھی مجھے ضرور سائڈ مار جاتی اور پھر ہفتوں پسلیاں دکھتی رہتیں۔ تب بچی کھلکھلا کر ہنسی اور میں بھی ہنس دیا۔ اب جب کبھی اس بچی سے ملاقات ہوتی ہے' وہ مجھے دیکھ کر مسکراتی ضرور ہے۔

اور اب تو اس دودھی سے مفصل جان پہچان بھی ہو چکی ہے۔ میرے ایک دوست خان صاحب اس سے روزانہ دودھ لیتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ دودھی کو اب اردگرد کی دنیا ہیولوں کی صورت میں نظر آتی ہے۔ کیونکہ اسے سرکاری ہسپتال میں جا کر علاج کرانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس کی یہ بچی سب سے چھوٹی ہے اور جوان ہو چکی ہے۔ وہ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں ہے۔ اس سے پہلے وہ دو بچیاں بیاہ چکا ہے۔ جو اسی طرح اس کی گدھی کے پیچھے چل کر اسے راستہ دکھاتی رہی ہیں۔ اس کا ایک ہی بیٹا ہے جو جسمانی اور ذہنی طور پر معذور ہے۔ اس کی بیوی مر چکی ہے۔ اس کی بڑھیا ماں گھر کا سارا کام کاج نپٹاتی ہے۔ وہ صبح اندھیرے اٹھتا ہے اور گئی رات کو

کمر سیدھی کرنے کے لئے کھاٹ پر لیٹ جاتا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اس کی یہ بیٹی بھی بیاہی گئی تو کون اس کی دستگیری کرے گا۔ خان صاحب نے ایک مرتبہ اس سے یہی سوال کیا تھا۔ اس نے جواب دیا تھا۔ ''اللہ مالک ہے''۔ اللہ پر یقین ہو تو ایسا ہو۔

ایک دن اس نے خان صاحب سے کہا تھا کہ میں نے آج تک لاہور نہیں دیکھا۔ خان صاحب بولے ملک صاحب لاہور تو خود چل کر آپ کے پاس آ گیا ہے۔ ارد گرد کی بستیاں انہیں لوگوں کی زمینوں پر آباد ہوئیں۔ اس کا گاؤں ابھی تک ماضی کی ایک یادگار بن کا قائم ہے لیکن کبھی لاہور اسے پورا ہڑپ کر جائے گا۔

میں ایک دن سڑک سے تھوڑا سا ادھر خان صاحب کے گھر کے پھاٹک کے باہر سیمنٹ کے بنچ پر بیٹھا ہوا تھا کہ شاہ صاحب پاس سے گزرے۔ میں نے انہیں پکارا تو وہ رک گئے۔ شاہ صاحب بہت ظریف ہیں۔ سڑک کے کنارے کھڑے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اور ہنسا رہے تھے کہ گدھی پر سوار دودھی اور پیچھے پیچھے چلنے والی اس کی بیٹی بھی وہیں آ کر ٹھہر گئے۔ شاہ صاحب بولے ملا نصر الدین اینڈ سن۔ ساتویں یا آٹھویں جماعت کی نیلسن ریڈر کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ باپ اور اس کا بیٹا ایک گدھے کو ڈنڈا ڈولی کر کے ایک پل پر سے گزر رہے تھے۔ میں کھلکھلا کر ہنسا۔ تب کسی نے گویا میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے کہا یہ تو اس بیچارے کی بیٹی ہے۔

وہ کہنے لگے بیٹی ہے لیکن کام تو بیٹے کا کر رہی ہے۔

خان صاحب دودھ لینے کے لئے برتن اندر سے لے کر آئے تو بولے ملک صاحب دودھ روز بروز پتلا ہوتا جا رہا ہے۔

مہنگائی بھی تو بہت بڑھ گئی ہے۔ جناب۔ اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

مہنگائی کا یہی حال رہا تو آپ ہمیں دودھ کی جگہ خالص پانی پلایا کریں گے۔ میرے ظریف دوست نے کہا اور دودھی ہنسنے لگی۔

ملک صاحب! کیا گاؤں میں آپ کی کوئی زمین نہ تھی۔ میں نے پوچھا۔ تھی جناب! اس نے جواب دیا۔ آپ کی بستی والوں نے خرید لی۔ کتنے پیسے ملے۔ میں نے پوچھا۔

سولہ لاکھ۔ اس نے جواب دیا اور میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ شاہ صاحب بھی دم بخود ہو گئے اور خان صاحب کے ہاتھ میں دودھ سے بھرا جگ چھلک گیا۔

وہ پیسے کہاں گئے ملک صاحب؟ شاہ صاحب نے پوچھا۔

میرے چھوٹے بھائی نے اچھرے کے کسی بینک میں جمع کرا دیئے۔ اس نے اس انداز میں کہا جیسے وہ اپنی تقدیر پر شاکر ہو گیا ہو۔

لڑکی بولی! ابا اب چلو بھی۔

وہ نظروں سے اوجھل ہوئے تو خان صاحب نے کہا۔ یہ آدمی اپنے گاؤں سے ذرا آگے جا کر ایک مربع زرعی زمین خرید سکتا تھا۔ سولہ لاکھ بچت کی کسی سرکاری سکیم میں جمع ہوتے تو یہ اور اس کی بیٹی دربدر نہ ہوتے۔ ابھی تک تو کواپریٹو بینکوں سے پچاس ہزار روپے جمع کرانے والوں کو اپنی رقسم واپس نہیں ملی۔ اسے سولہ لاکھ تو قیامت تک نہیں مل سکتے۔ شاہ صاحب نے متاسفانہ لہجے میں کہا اور چلے گئے۔

میری آنکھوں کے سامنے قیامت کا ہنگامہ تو نہیں البتہ وہ لمحہ ضرور آ گیا جب دنیا اکیسیوں صدی میں داخل ہو رہی ہوگی۔ امریکہ اور یورپ کے بعد ایشیا کی باری آئے گی۔ فضائے آسمانی پر جہاں ایک بوئنگ اڑ رہا ہوگا۔ وہاں سطح زمین پر ایک گڈا بھی رینگ رہا ہوگا۔ وہی مہنجوداڑو والا گڈا۔ عین اس لمحے ایک بی ایم ڈبلیو کے پہلو بہ پہلو اپنی بستی کا یہ شیر فروش بھی اپنی گدھی پر بیٹھا ہوا نظر آئے گا اور سنگم کو عبور کر کے اکیسیویں صدی میں داخل ہو جائے گا۔ لیکن قدرت لوگوں کے درمیان زمانے کو ہمیشہ گردش میں رکھتی ہے۔ یقیناً اس محروم کے ایام بھی بدلیں گے اور میں بیسیویں اور اکیسویں صدی کے سنگم پر بی ایم ڈبلیو کے پہلو میں ایک سوزوکی پک اب کو دیکھوں گا، جس میں دودھ سے بھرے بہت سے ڈرم ہوں گے سوزوکی دونوں سائڈوں پر لکھا ہوگا۔ ''ملک ڈیری کا خالص دودھ'' ملک صاحب ڈرائیور کے ساتھ اجلے کپڑوں میں ملبوس آنکھوں پر کالی عینک لگائے بیٹھے ہوں گے۔

اور ان کی فرمانبردار بیٹی کب کی اپنی قسمت کا جہیز لے کر اپنے سسرال پہنچ چکی ہوگی۔

28 اکتوبر 99ء

زر، ہوسِ زر اور جلبِ زر

''زر'' کے لفظ ہی میں بہت چمک ہے!

اچھے مقولے کو 'آبِ زر' سے لکھا جاتا ہے۔ آدمی کے مرتبے کی پہچان بھی یہی ہے کہ وہ کتنا 'زردار'' ہے۔ 'زر' ایک دھات ہے جو بہت کم یاب ہے۔ اسے زنگ نہیں لگتا۔ اس کا رنگ کالا نہیں پڑتا۔ اس میں لچک بہت ہوتی ہے۔ صلابت پیدا کرنے کے لئے اس میں پیتل کا کھوٹ ضرور ملایا جاتا ہے۔ 'زرِ خالص' ممکن ہے کہ اینٹ کی صورت میں ہوتا ہو کہ شاہی خزانوں میں جمع ہوتا ہے۔ آج کل پونڈ اور ڈالر ہی 'زر خالص' ہیں کہ اگر چہ کاغذ کی شکل میں ہوتے ہیں لیکن 'زر مبادلہ' کہلاتے ہیں۔

''زر'' کی محبت انسان کی اجتماعی سائیکی کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔ جب یورپ کا رہزن سونے کی تلاش میں نکلا تو اس نے امریکہ کے ان شہنشاہوں کا نہایت بے دردی سے خاتمہ کیا کہ ان کے پاس بہت سونا تھا۔ پھر اس نے ریت کے ذرے ذرے کو کھنگال کر اس سے ''گولڈ ڈسٹ'' نکال لی۔ اس میں پسینہ بھی بہا اور لہو بھی۔ کبھی سونا زمین کے بطن سے ڈلیوں کی صورت میں بھی نکلتا تھا۔ اب چٹانوں کو توڑ کر اور پتھر کو پیس کر اس سے سونا نکالا جاتا ہے۔ کافر کہا کرتے تھے کہ ''اے محمدؐ اگر آپ اللہ کے سچے نبی ہیں تو سامنے کے پہاڑ کو سونا بنا دیجئے''۔ جدید تحقیق کے مطابق احد سونے کا پہاڑ ہے۔ اب عرب میں کالے سونے کا دریا رواں ہے جس کا رخ یورپ اور امریکہ بتدریج اپنی طرف موڑ رہے ہیں۔ جب یہ دریا سوکھ جائے گا تو امریکہ کہے گا کہ اب کوہ احد سے سونا نکالو۔ ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ کرانہ بار کی پہاڑیوں میں بھی سونا موجود ہے۔ زر کے بیوپاریوں یا پجاریوں کو میرا مشورہ ہے کہ ابھی سے کرانہ بار کی پہاڑیاں خرید لیں ورنہ سارا سونا کٹ کر موٹر ویز میں لگ جائے گا۔ یوں بھی آہستہ آہستہ یہ پہاڑیاں مہنگی ہوتی چلی جائیں گی لیکن وہ ایسا نہیں کریں گے کیونکہ ان کے پاس تیشۂ فرہاد نہیں کہ چٹانیں توڑتے رہیں۔ پاکستان کا بنک سلامت رہے کہ اس معدن سے سونے کا حصول نہایت آسان ہے۔

''زر'' کی نفسیاتی اہمیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ''زر'' اگرچہ خدا نہیں لیکن قاضی الحاجات ضرور ہے۔

ایک بلوچ قبیلے کا نام' زرداری'' ہے۔ یہ نام اسے اس لئے نہیں ملا کہ زر وافر رکھتا ہے بلکہ اس لئے کہ بلوچوں کی روایت کے برخلاف کوئی مسافر ان کا مہمان بننا چاہتا تو اس سے پوچھتے ''زرداری؟'' یعنی کیا تمہارے پاس مہمانداری کی قیمت ادا کرنے کے لئے' زر' ہے؟ پچھلے تین سالوں سے اس قبیلے کا سردار سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ حکومت اس سے پوچھتی ہے کہ'' زرداری؟'' تو وہ نہ میں سر ہلا دیتا ہے۔ منہ سے کچھ نہیں بولتا اور اپنی زبان کاٹ لیتا ہے۔

کون سا سینہ ہے جو'' حب زر'' سے خالی ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ اس کی دسترس سے کوئی حالی (یعنی شریف آدمی) بچا ہوا نہیں ہے۔ اپنے متعلق زعم تھا کہ میں ایک فقیر منش ریٹائرڈ استاد ہوں اور میرا سینہ اس سے خالی ہے۔ آج میری نظر اچانک اپنے زیر قبضہ دو بانڈوں پر پڑ گئی۔ ان میں سے ایک بانڈ ایک ہزار کا ہے اور دوسرا پانچ سو کا ہے۔ جب ان کی قرعہ اندازی ہوتی ہے تو اخبار میں سب سے پہلے فہرست دیکھتا ہوں۔ اس امید پہ کہ اس بار تو دس لاکھ یا پانچ لاکھ کا انعام ضرور میرے نام نکلے گا۔ میں نے یہ نیت بھی کی ہوئی ہے کہ اگر انعام نکل آیا تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے نام پر غریبوں' مسکینوں اور یتیموں میں بانٹ دوں گا۔ حسن نیت کے باوجود ابھی تک قدرت نے میری'' ہوس زر'' کی تسکین کا سامان نہیں کیا۔

''حب زر'' سے اگلی منزل'' ہوس زر'' کی ہے بلکہ آج کل تو'' حب'' کا لفظ متروک ہو چکا ہے۔ کون ہے جو'' ہوس زر'' میں مبتلا نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مزدور اور کسان بھی'' ہوس زر'' میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ایک کارخانہ دار سے ایک مزدور نے کہا'' صاحب مہنگائی بہت ہو گئی ہے۔ میری اجرت بڑھا دیجئے۔'' کارخانہ دار نے کہا'' جس ملک کے مزدور بھی ہوس زر میں مبتلا ہو جائیں' اس کا خدا ہی حافظ ہے''۔

ایک کسان نے کپاس کی قیمت گر جانے پر احتجاج کیا تو کئی ٹیکسٹائل ملوں کے ایک مالک نے کہ جو حال ہی میں دساور سے سستی کپاس منگوا کر ملکی کپاس کو اپنی' آنے' والی پر جگہ پر لے آیا ہے' ٹھنڈی آہ بھری اور کہا'' جس ملک کا کسان ہوس زر میں مبتلا ہو جائے' وہاں قدرت کپاس پر کالے چٹے تیلوں اور نیلی پیلی سنڈیوں کی بارش کیوں نہ کرے؟''

''ہوس زر'' کو پورا کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے'' جلب زر''

کا ٹیلنٹ ملا ہو تو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ صلاحیت قدرت سب کو تو عطا نہیں کرتی۔ اس کے کچھ نیک بندے ہی اس سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ ہذا من فضل ربی۔ یہ میرے اللہ کا فضل و کرم ہے کہ کسی کو نوازتا ہے (نعوذ باللہ)

''جلب زر'' کی چالیں بہت باریک ہوتی ہیں لیکن کبھی اتنی واشگاف بھی ہوتی ہیں کہ ہزار ہا میل سے بھی نظر آ جاتی ہے۔ مثلاً ایک دور میں تخت حکومت پر متمکن ایک ہستی کو بہت دور کی سوجھی۔ اس نے اپنے نصف بہتر کو لہریں گننے پر مقرر کر دیا۔ اس نے کہا ''میں اپنے ملک کی فضاؤں کو آلودہ نہیں ہونے دوں گا'' کوئی ٹیوب ویل یا پٹرول پمپ نصب ہوتا تو اس سے پروانہ اجازت لینا پڑتا۔ ٹیوب ویل لگنے سے بھلا کون سی آلودگی ہوتی ہے اور پٹرول پمپ تو لگتے ہی اس لئے ہیں کہ آلودگی میں اضافہ ہو۔

حال ہی میں ایک خاندان کے متعلق پڑھا ہے کہ ماشاء اللہ اس کے ہر فرد کو ''جلب زر'' کا مافوق الفطرت ٹیلنٹ عطا ہوا ہے۔ میرا ذہن ان باریکیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایسے کمپلیکس ذہن بڑے بڑے کمپلیکس تیار کرتے ہیں اور اس کے کملے بھی سیانے ہوتے ہیں کہ مٹی میں ہاتھ ڈالیں تو وہ سونا بن جاتی ہے لیکن اس کے نتیجے میں لاکھوں افراد کا رتی سونا مٹی بن جاتا ہے۔ ہر بنک کا ایک خفیہ دروازہ ہوتا ہے جو ان کے ''کھل جا سم سم'' کہنے پر کھل جاتا ہے اور دوسروں کے لئے بند ہو جاتا ہے۔ غضب یہ کہ یہ علی بابا زر و جواہر کو اپنے ملک کے اندر نہیں رہنے دیتا۔ وہ انہیں سوئٹزرلینڈ پہنچاتا ہے اور کسی سرے سں یا مے فیئر فلیٹس کی بنیادوں میں لگا دیتا ہے۔

یہ دونوں خاندان ملک کے حکمران رہتے ہیں اور بیت المال کے امین۔ ایک امین عمر بن عبدالعزیزؒ بھی تھے کہ ذاتی کام کرتے تو بیت المال کا دیا بجھا دیتے اور اپنا دیا جلا لیتے۔ ایک دیا روشن تو ہوا ہے' امید کا دیا...... دنیا امید پر قائم ہے!

16 نومبر 99ء

کتاب کلچر کا ایک آدمی

وہ ایک معلم تھے اور شاعر بھی لیکن دونوں حیثیتوں سے انہیں بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن مجھے فخر ہے کہ میں ان کے جاننے والوں میں سے ایک ہوں اور ممکن ہے کہ مشہور شاعر اور کالم نویس ظفر اقبال بھی انہیں جانتے ہوں کیونکہ وہ میونسپل ہائی سکول اوکاڑہ میں ان کے شاگرد رہے ہیں اور اپنی ابتدائی نظمیں اور غزلیں انہیں دکھایا کرتے ہوں گے۔ ان کا نام نور احمد فاروقی ہے اور تخلص انجم۔ وہ 19 جون 99ء کو اس جہان فانی سے ترانوے سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

معلم اور شاعر کی حیثیت سے انہیں کوئی اعزاز نہیں ملا۔ معلم کی حیثیت سے تھوڑی سی پنشن ضرور ملی اور شاعر کی حیثیت سے ایک مجموعہ کلام کہ جو انہوں نے اپنے خرچ پر چھاپا اور اہل ذوق میں تقسیم کیا۔ اس کا عنوان ''نشاطِ آرزو'' ہے۔

میرا ان سے 12 جون 46ء کو رابطہ قائم ہوا۔ جب میں ڈی بی ہائی سکول بامان بالا ضلع اوکاڑہ میں انگلش ٹیچر کی حیثیت سے متعین ہوا۔ وہ اس سکول میں فارسی اور اردو پڑھایا کرتے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے محسوس ہو گیا کہ میرے اور ان کے درمیان ''ادب'' قدر مشترک ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے اور ان کے ذوق ادب میں اختلاف بھی ہے۔ وہ شعر و شاعری کے دلدادہ تھے اور میں افسانہ و افسوں کا۔ وہ علامہ اقبال، ظفر علی خاں اور نیاز فتح پوری کے گرویدہ تھے اور میں پریم چند، میرزا ادیب، منٹو، کرشن چندر، بیدی اور ندیم قاسمی کا۔ وہ قلیل مشاہرے کے باوجود ''نگار'' کے کنٹری بیوٹر تھے اور میں ''ادب لطیف'' کا۔ میری افتادِ طبع ''نگار'' سے کبھی مانوس نہ ہوئی اور ان کی ''ادب لطیف'' سے لیکن ہم رسالہ بدل دوست ضرور بن گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کچھ کچھ شعر شناس ہو گیا اور وہ افسانہ شناس لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک نہ چلا کیونکہ رینالہ خورد کے صاحب ذوق پوسٹ ماسٹر ہمیں رسالہ اس وقت بھیجتے جب وہ خاصا بوسیدہ ہو چکا ہوتا۔ ان کا پہلی جماعت میں پڑھنے والا بیٹا خالی صفحوں پر خوشخطی کی مشق کرتا اور رینالہ خورد کے کوئی صاحب ذوق ان پر عجیب عجیب ریمارکس بھی لکھ دیتے۔ ہم نے رسالے بند کر دیئے۔

ہمارے سکول میں صرف ''ہمایوں'' آتا تھا جسے سب سے پہلے ہیڈ ماسٹر صاحب پڑھتے اور بعد میں جس کا داؤ چلتا' وہ اسے اپنے قبضے میں لے لیتا۔ اگر انجم صاحب کو مل جاتا تو وہ دوسرے تیسرے دن مجھے پڑھنے کو ضرور دے دیتے۔ ایک جے وی ٹیچر جو ہیڈ ماسٹر صاحب کی میز کے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے۔ اکثر رسالہ ان کے قبضہ ناہنجار میں آجاتا۔ ایک بار وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ میرے پاس آئے۔ ''شاہ جی! پیروڈی!...... پیروڈی کیا ہوا؟ پیروڈا ہونا چاہئے۔ پیر مذکر ہے' مونث تو نہیں۔'' میں نے رسالہ دیکھا۔ مضمون کا عنوان مجھے یاد نہیں آرہا۔ نیچے بریکٹ میں لکھا ہوا مضمون کا عنوان مجھے یاد نہیں آرہا۔ نیچے بریکٹ میں لکھا ہوا تھا ''پیروڈی''۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں سمجھ گیا کہ یہ لفظ (PARODY) ہے۔ تاہم میں نے کہا ''اگر پیر عورت ہو تو اسے وڈی ہی ہونا چاہئے۔''

میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو لطیفہ سنا کر کہا ''جناب! آپ آرڈر کر دیں کہ آئندہ جو صاحب مطالعے کی میز سے رسالہ اٹھا کر لے جانا چاہیں' ان کا صاحب ذوق ہونا ضروری ہے''۔ مجھے انجم صاحب نے بتایا کہ ان صاحب کو صاحب ذوق کہلانے کا بہت شوق ہے۔ ''سوادِ غم'' کے ان کے نزدیک معنی ہیں ''غم کا مزہ''۔

جناب نور احمد انجم فاروقی کتاب کے بہت رسیا تھے۔ اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹ کر کتاب خریدتے رہتے۔ ایک سکول سے دوسرے سکول میں تبدیل ہوتے تو ان کے سامان میں سب سے بڑا اور بھاری ٹرنک کتابوں اور رسالوں کا ہوتا۔ کوئی نئی کتاب ملتی تو چلتے چلتے بھی پڑھتے رہتے۔ باماں بالا گاؤں سے سکول ایک میل کے فاصلے پر کھیتوں میں واقع تھا اور راستے میں مینڈھیں بھی تھیں اور کھال بھی۔ کئی بار گرتے گرتے بچتے۔ ایک بار چلچلاتی دھوپ میں کوئی رسالہ پڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔ آنکھوں پر رنگین چشمہ لگا ہوا تھا کیونکہ آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ میں نے رسالہ چھینتے ہوئے کہا ''انجم صاحب! اپنی آنکھوں پر رحم کیجئے۔ اب یہ رسالہ آپ کو اس وقت ملے گا جب آپ کی آنکھیں پوری طرح صحت یاب ہو جائیں گی۔'' اس پر وہ چیں بجبیں بھی ہوئے اور ہنسے بھی۔

انجم مرحوم ''آب حیات'' کے حافظ تھے۔ کہتے تھے کہ میں نے یہ کتاب کم از کم سو بار تو ضرور پڑھی ہو گی۔ کتاب سے یہ عشق ...... اللہ ...... اللہ۔ قاضی سلمان منصور پوری کی کتاب ''رحمت اللعالمینؐ'' سے تو انہیں عشق تھا۔ ''سیرت النبیؐ'' بھی ان کی بہت ہی پسندیدہ کتاب تھی۔

انہیں بار بار پڑھ کر وہ سیر نہیں ہوتے تھے۔ علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں سے انہیں بہت عقیدت تھی۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا ذکر کرتے تو ایک زمانہ معاشرتی اور سیاسی طور پر زندہ و متحرک ہو جاتا۔ میں نے کئی بار فرمائش کی کہ جو جو بات انہیں یاد آتی ہے' اسے لکھتے رہا کریں لیکن افسوس کہ نہ لکھ سکے البتہ جو کتاب پڑھتے' اس کے حاشیے پر مختصر نوٹ ضرور لکھتے۔

انجم فاروقی مرحوم کا مولد چونڈہ تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد یہاں کافی عرصہ قیام پذیر رہے۔ یہاں ایک پبلک لائبریری کے قیام میں عملی تعاون کیا اور اپنی ساری کتابیں اور رسالوں کی فائلیں اس لائبریری کی نذر کر دیں۔ لاہور میں ایک عرصے تک 28 عثمان بلاک نیو مسلم ٹاؤن میں اپنے بڑے بیٹے توقیر خالد فاروقی کے ہاں رہائش پذیر رہے اور مجھے گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہا۔ زندہ دل بزرگ تھے۔ مجلس اتنی دلچسپ ہوتی کہ اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔ پھر اپنے چھوٹے بیٹے صدیق خالد کے پاس فیصل آباد چلے گئے۔ ان سے آخری ملاقات اکتوبر 96ء میں لاہور میں ہوئی۔ جب وہ توقیر خالد کے بچوں کو ملنے کیلئے آئے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا "اب آپ عمر عزیز کے کس مرحلے پر ہیں؟"

فرمانے لگے "نوے سال پورے ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا "اکڑ وکڑ بمبا بو...... اسی' نوے' پورے سو"۔

"نہیں شاہ جی! اتنے ہی سال کافی ہیں۔ زیادہ کی آرزو نہیں۔" دھان پان سے آدمی تھے۔ کسی موٹر سائیکل والے نے ٹکر ماری اور استخوان شکستہ سے چور ڈھانچے کو کوئی نیک دل کار والا گھر پہنچا گیا۔ بعد میں چل پھر لیتے تھے لیکن نہر کے کنارے کی سیر کی لذت سے محروم ہو گئے۔

دو چار روز ہوئے توقیر خالد اور ڈاکٹر محمد اسلم مجھیانہ جو ان کے شاگرد ہیں' مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ توقیر خالد کو دیکھا تو اندر سے آواز آئی "فلاں نماند"۔ میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے اور میں نے کو ندا کی طرف کان لگا دیئے کہ وہاں سے آنے والی صدا وہی سنتا ہے جسے پکارا گیا ہو۔

انجم فاروقی مرحوم کتاب کلچر کے آدمی تھے۔ "فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے" کے متمنی و آرزو مند آدمی۔ کتاب سے پیار کا اظہار ان کے نامہ گرامی مرقومہ 3 اکتوبر 98ء سے اس طرح ہوتا ہے "قرآن حکیم اگر کسی مسجد سے چرا کر اپنے پڑھنے کیلئے لیا جائے تو حنفی فقہ میں اس کی کوئی سزا نہیں۔ بالکل اس طرح ادب دوست شخص اگر کوئی ادبی کتاب چرا لے تو اہل ذوق کے ہاں

تحسین کے سوااور کیا ہے۔'' سیاق وسباق یوں ہے کہ ایک بار وہ راقم الحروف سے نو(9) کتابیں پڑھنے کیلئے لے گئے۔ان سے یہ کتابیں ان کی ایک عزیزہ نے جوایم اے کی طالبہ تھیں' پڑھنے کو لیں۔ جب واپس کیں تو لکھتے ہیں'' میں نے انہیں گنا' وہ آٹھ تھیں اور وہ بھاگ گئیں۔ میں (اس کے پیچھے) اندر گیا تو اس نے برملا کہا کہ انور سدید کی کتاب'' غالب کے نئے خطوط'' میں نہ دوں گی......اب آپ مجھے معاف کریں یا اسے دعائیں دیں۔''

اس خط کے جواب میں میں نے انہیں اپنی کتاب'' ٹرمینس سے ٹرمینس تک'' بھیجی تو اپنے 9نومبر 98ء کے خط میں تحریر فرمایا'' پچھلے خط میں ادبی چوری کا جواقرار کیا گیا تھا'اس کی سزا یہ کتاب ہے۔یہ آپ ہی کا دل گردہ ہے کہ جرم کے عوض انعام'انعام ادب۔'' کتاب کلچر کے ایسے لوگ اب کتنے باقی رہ گئے ہیں؟

مرحوم اپنے شاگردوں میں ظفر اقبال' سجاد نقوی' شفقت نقوی' سابق ایم این اے محمد سعید مجھیانہ اور حکیم محمد آصف (ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول باماں بالا) کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ سجاد نقوی نے ان کی کتاب'' نشاط آرزو' پر تبصرہ بھی لکھا تھا۔

انجم فاروقی شاکی تھے کہ پاکستان میں بتدریج ذوق مطالعہ کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ٹیلیویژن نے رہی سہی کسر نکال دی ہے۔وہ وقت جو مطالعے کیلئے موزوں ہوتا ہے' اسنے ناچ گانے اور اشتہارات کی نذر کردیا جاتا ہے۔

واقعی ٹیلیویژن کلچر نے ابھی تک'' کتاب کلچر'' کا کوئی نعم البدل قوم کونہیں دیا اور کتاب کلچر کے آدمی آہستہ آہستہ رخصت ہو رہے ہیں۔

30نومبر 99ء

چاچا بوٹا موٹر وے پر

موٹر وے چاچا بوٹا کے گاؤں سے صرف ایک فرلانگ کے ایک فاصلے پر ہے۔اس نے اس کے پانچ چھ کلوز مین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔اس کے ایک بیٹے نے ادھر کٹیا اسارلی ہے۔اب تو خیر چک کے کچھ اور لوگ بھی وہاں آباد ہو گئے ہیں' چک کا نام وہی رہا ہے لیکن اس ساتھ ''خورد'' کا لفظ بڑھا دیا گیا۔کلاں سے خورد آنے جانے میں کم از کم دو میل کا سفر کرنا پڑتا ہے۔تاہم وہ ادھر جنگلے سے لگ کر ادھر جنگلے سے لگے' بیٹے سے اشاروں ہی اشاروں میں روزانہ خیریت پوچھ لیتا ہے۔

چاچا بوٹے کو موٹر وے سے بہت محبت ہے کہ اس نے اس پر بیلچہ چلایا ہے۔جہاں وہ کھڑا ہوتا ہے' وہاں ''سنگ'' صاحب نے اپنا کیمپ لگایا ہوا تھا۔جب کوریا سے بڑی بڑی مشینیں آ گئیں تو بہت سے مزدوروں کو فارغ کر دیا گیا لیکن ''سنگ'' صاحب نے چاچا بوٹے کو کیمپ کا چوکیدار لگا دیا۔اس کیمپ کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ چک کے آوارہ کتوں میں خود بخود' بہبود آبادی' ہو گئی۔کتے تھے بھی بہت زیادہ۔بھونکتے بھی تھے اور کاٹتے بھی۔بیچارے کیمپ سے باہر پڑے ہوئے روٹی کے ٹکڑے' گوشت کے لوتھڑے اور ہڈیاں کھانے آتے ہوئے تو نظر آتے لیکن جاتے ہوئے دکھائی نہ دیتے۔چنانچہ انہوں نے کیمپ میں آنا چھوڑ دیا۔

''سنگ'' صاحب پنجابی کے ایک دو لفظ سیکھ گیا تھا۔ایک دن اسے بلایا اور کہا ''بوٹا! کتا!'' چاچا بوٹے کو بہت غصہ آیا۔آج تک کسی نے اسے کتا کہنے کی جرات نہ کی تھی۔لیکن جب ''سنگ'' صاحب نے اشاروں میں بتایا کہ ہم کتے کو بہت شوق سے کھاتا ہے اور اب کتا خود بخود ادھر کا رخ نہیں کرتا تو چاچا بوٹا سمجھ گیا کہ ''سنگ'' صاحب اس سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔وہ کئی دن تذبذب میں رہا۔کئی بار جی چاہا کہ نوکری چھوڑ دے۔پھر سوچا کہ کتا ہے تو حرام مال ہی' حرام میں لگ جائے تو کیا ہرج ہے۔وہ کتوں کو بہلا پھسلا کر کیمپ تک لے آتا۔اس کے بعد ''سنگ'' صاحب اور ان کے ساتھیوں کا کام تھا۔جب بھولو اور ڈبو بھی اس کارِ حرام میں کام آ گئے تو گاؤں

میں کوئی کتا نہ رہا اور چوریاں ہونے لگیں۔

تب اسے محسوس ہوا کہ وہ اچھا کام نہیں کرتا رہا ہے۔ یہ خیال اس کے ضمیر کو کئی دنوں تک کچوکے لگاتا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے سوچا ''لوگ کہتے ہیں سنگ صاحبان نے اس سڑک کا ٹھیکہ لینے کے لئے کچھ بڑے بڑے لوگوں کو خوش کیا تھا اور میں نے تو ایک پیسہ بھی نہیں لیا''۔

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ موٹروے بن گئی۔ اتنی صاف شفاف سڑک کہ گاڑیاں اس پر تیرتی ہوئی نظر آتیں اور اس کی تعمیر میں اس کا پسینہ بھی شامل تھا لیکن آج تک اسے موٹروے پر سفر کرنے کا موقع حاصل نہ ہوا تھا۔ وہ سوچتا ''اتنے بڑے بڑے راج محل بنتے ہیں' کیا ان میں کسی راج مزدور کو ایک دن بھی گزارنے کا موقع دیا جاتا ہے؟'' لیکن موٹروے پر سفر کرنے والوں پر کوئی پابندی بھی تو نہیں تھی' البتہ کرایہ تگنا چوگنا تھا۔ شیخوپورہ سے لاہور تک کا کرایہ اس کے پاس موجود تھا لیکن لاہور جائے کس کے پاس اور شیخوپورہ سے لاہور تک کوئی بس یا ویگن براستہ موٹروے جاتی بھی نہ تھی۔ اللہ نے یہ موقع بھی فراہم کر دیا۔ اس کی برادری کی ایک بارات نے بھلوال کے قریب کسی چک میں جانا تھا اور بارات والی بس نے شیخوپورہ سے سالم پوائنٹ تک موٹروے پر سفر کرنا تھا۔ چاچا بوٹا بھی براتیوں میں شامل تھا۔ چاچا بوٹا بہت خوش تھا۔ بارات والوں کے ہاں سے پستے بادام والی سبز چائے کے کئی پیالے بھی وہ چڑھا گیا تھا۔

بس موٹروے پر دوڑنے لگی تو اسے یوں لگا جیسے وہ ہوائی جہاز پر اڑ رہا ہو۔ (واضح رہے کہ چاچا بوٹے کے دل میں ہوائی جہاز پر اڑنے کا ارمان بھی موجود ہے!) ایک سانولی سلونی میراثن گڈوی بجا رہی تھی اور دو تین میراثنیں مل کر گا رہی تھیں۔ نوجوان براتی ہنسی مذاق کر رہے تھے لیکن چاچا بوٹا ہنسی تماشے سے بے نیاز شیشے سے آنکھیں چپکائے باہر کے نظاروں میں محو تھا۔ دور تک پھیلے ہوئے کھیت ایسے لگ رہے تھے جیسے قدرت کے درزی نے رنگ برنگے ٹکڑوں کی ایک چادر سی کر زمین پر بچھا ہو۔ کچھ کھیتوں کے کناروں پر پاپلر کے درخت سبز پوش سنتریوں کی طرح کھڑے تھے۔

تب اچانک گھنی لسی کے کٹوروں اور سبز چائے کی پیالوں میں طوفان آ گیا۔ چاچا بوٹے نے انہیں بہلانے کی بہتیری کوشش کی لیکن وہ بہت ضدی تھے' اس کے بہلاوے پھسلاوے میں نہ آئے۔ اس نے کچھ دیر بعد ہتھیار ڈال دیئے اور پکار کر کہا ''بھائی ڈرائیور! بس روکو!''۔ وجہ

معلوم کر کے ڈرائیور نے پوچھا۔ پانچ سو روپیہ جرمانہ کون دے گا۔ چاچا بوٹے نے چیخ کر کہا'' میں دوں گا۔ میں دوں گا''۔ ڈرائیور نے ناچار بس روک لی۔ چاچا بوٹا بس سے کودا اور تیر کی طرح جنگلے کی طرف گیا لیکن جنگلے کے اوپر سے کود کر باہر نہ جا سکا اور وہیں کچی جگہ پر بیٹھ گیا۔ جب سکون حاصل ہوا تو سڑک کی طرف لوٹا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کی بس کالے رنگ کی ایک کار میں بدل گئی ہے اور ایک نوکیلی مونچھوں والا پولیس افسر اسے نہایت خوفناک آنکھوں سے گھور رہا ہے۔ افسر نے پوچھا'' پانچ سو روپیہ جرمانہ ہے تمہارے پاس؟'' چاچا بوٹے نے تھر تھر کانپتا ہوا سر 'نہ' میں ہلایا' تو اس نے کہا'' پھر تین مہینے کی قید کے لئے تیار ہو جاؤ''۔ چاچا بوٹا ذہنی طور پر تین مہینے کی قید کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔ اس لئے اس نے وجہ دریافت کرنے کی جرات کر لی۔ جب اسے وجہ معلوم ہوئی تو وہ کھلکھلا کر ہنسا اور پوچھا'' جناب! موٹر وے کی یہ کچی زمین میت کے صحن کی طرح پاک ہے؟'' ابھی پولیس افسر جواب نہ دے سکا تھا کہ چاچا بولا'' اگر کوئی کسّی بیلچہ آپ کے پاس ہو تو مجھے دیجئے۔ میں یہاں سے جتنی آپ چاہیں کتوں کی کھالیں اور ہڈیاں بر آمد کر سکتا ہوں''۔ پولیس افسر ششدر ہو کر رہ گیا۔ جب اس نے سنگ صاحب اور چاچا بوٹے کی بپتا والا قصہ سنا تو ہنستے ہنستے اس کی مونچھوں کے بل ڈھیلے پڑ گئے۔

چاچا بوٹا لوگوں کو اپنا قصہ سنا کر پوچھتا ہے'' یارو! پولیس اتنی ہی نیک ہو گئی ہے یا میری کوئی نیکی کام آ گئی ہے اور کتنے مزدور ہیں' جنہیں موٹر وے پر سفر کرنے کا موقع ملا ہے؟''

8 جنوری 2000ء

یکم جنوری 2000ء

محاورے کی رو سے انیس بیس کا فرق بہت معمولی ہے لیکن انیس کو بھی گزرنے میں ننانوے سال لگ جاتے ہیں۔ خیال تھا کہ 20ویں صدی کا آغاز یکم جنوری 2001 سے ہوگا لیکن ذرائع ابلاغ مسلسل کہہ رہے ہیں کہ وہ شب جو یکم جنوری 2000ء کی صبح سے پہلے گزر گئی' اس میں عین بارہ بجے ایک لمحہ آیا تھا جسے 19ویں اور 20ویں صدی کا زیرو پوائنٹ کہا جانا چاہئے اور یہ آ کر گزر گیا۔ وقت کا تسلسل ناقابل تقسیم ہے۔ دریا میں بہنے والا پانی بہے چلا جا رہا ہے اور کنارے پر بیٹھنے والا فلسفی اپنے خیالوں میں دونوں کو حال ماضی اور مستقبل کا کوئی زیرو پوائنٹ نہیں ملتا۔

کل رات 19ویں 20ویں صدی کے سنگم پر کسی ہاتف غیبی نے پکار کر نہ کہا ''ایہا الناس''! باادب' بلاملاحظہ ہوشیار...... 21ویں صدی کا نزول اجلال ہو رہا ہے''۔

میں نے 1995ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ ''پاکستان اکیسویں صدی میں'' میرا خیال تھا کہ بیسویں اور اکیسیویں صدی کے سنگم پر کھڑے ہو کر میں اور رڈیارڈ کپلنگ کرہ ارض کو اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔ بیسیویں صدی کے آغاز کے سب سے بڑے استعمار پسند انگریز شاعر اور افسانہ نویس کپلنگ سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ میں نے 1939ء میں جب میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا' اس کی نظم ''ایسٹ از ایسٹ اینڈ ویسٹ از ویسٹ'' پڑھی تھی۔ ان دنوں دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی اور آسمان پر کوئی ہوائی جہاز اڑتا ہوا نظر آ جاتا تھا اور زمین پر گڈا تو ہر وقت رینگتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ یہی منظر کپلنگ نے پہلی جنگ عظیم کے بعد دیکھا تھا اور اس نے کہا تھا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے۔

تب انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم پر کھڑے ہو کر ہم نے دیکھا کہ دنیا اکیسیوں صدی میں داخل ہو رہی ہے۔ جب امریکہ اور یورپ کا قافلہ اس سنگم پر عبور کر چکا اور ایشیا کی باری آئی تو فضائے آسمانی پر ایک بوئنگ اڑتا ہوا نظر آیا اور سطح زمین کی ایک کچی سڑک پر موہنجوڈارو والا گڈا بھی رینگتا ہوا دکھائی دیا۔ رڈیارڈ کپلنگ بے اختیار پکار اٹھا ''بیسویں صدی کے آغاز میں میں

نے کتنی سچی پیشن گوئی کی تھی کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ یہ جڑواں بہنیں پھر کبھی نہیں مل سکیں گی،، عین اس لمحے اسے ایک موٹروے پر ایک بی ایم ڈبلیو فراٹے بھرتی ہوئی نظر آئی۔ پھر یکے بعد دیگرے چھ دھماکے سنائی دیئے اور چاغی کے ایک پہاڑ کی چوٹی پر اچانک سبزی رنگ بکھر گیا۔ وہ حیران و ششدر رہ گیا تو میں نے کہا،،مسٹر کپلنگ! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایشیا کے دو ملک ایٹمی طاقتیں بن چکے ہیں اور پاکستان جنوبی ایشیا کا پہلا ملک ہے جس نے موٹروے تعمیر کی ہے،، ابھی وہ میری بڑھکوں کو ہضم کر رہا تھا کہ لاہور شہر کی ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک پر کہ جہاں بے ہنگم ٹریفک کی وجہ سے بہت رش تھا' اسے ایک سوزوکی کار کے پہلو بہ پہلو ایک گدھا گاڑی بھی رینگتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے پوچھا،، یہ کیا ہے؟ جب میں لاہور کی سول لائنز میں رہتا تھا تو میں نے بھنگیوں کی توپ کے پاس سے کہ جسے میں کمز گن کہا کرتا تھا' گدھوں کو مال روڈ کراس کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن گدھا گاڑی نہیں دیکھی تھی،،۔

میں نے جواب دیا،،مسٹر کپلنگ! یہ بیسوی صدی کے آخری ربع کی ایجاد ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ گاڑی کو موٹر کے ٹائر لگے ہوئے ہیں...... یوں ابھی تک ہم موہنجوڈارو کے سارے گڈوں کو ٹائر نہیں لگوا سکے،،۔

اور آج رات بارہ بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے کہ میری نیند خود بخود کھل گئی حالانکہ ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے لحاف میں ملفوف رہ کر بلب روشن کرلیا۔ دو تین کریکر چلے لیکن میرے تخیل کو کوئی اڑان نہ ملی۔ مجھے دو صدیوں کے سنگم پر نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی نظر آئی' نہ آتش بازی کا تماشا دیکھا' میں بلب بجھا کر پھر سو گیا۔ صبح نماز پڑھنے کے لئے اٹھا تو بجلی غائب تھی۔ موم بتی جلا کر اندھیرے کو اجالے میں بدلا' نماز سے فارغ ہوا تو بجلی پھر آ گئی۔ میں نے حسب معمول تلاوت مکمل کر کے سامنے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا' باہر صبح کی روشنی میں سورج کی پہلی کرنوں کی روشنی نظر نہ آئی۔ اتنی دھند تھی کہ لان میں لگے پام کے دو درختوں کی چوٹیاں بھی نظر نہ آئیں۔ ایک دھند میں لپٹے ہوئے بے کیف دن کا آغاز ہو رہا تھا کہیں دس گیارہ بجے دھوپ نکلے گی اور باہر کا منظر واضح ہوگا۔ میں ٹیرس پر کرسی بچھا کر بیٹھوں گا اور سامنے کے پلاٹ میں سوکھی گھاس مجھ سے پوچھے گی،، تو نے مجھے پھر سے سرسبز و شاداب کرنے کا کوئی انتظام کیا۔،، اور درختوں پر دھول میں اٹے ہوئے پتے شکایت کریں گے کہ اس دھند میں تو اوس کے چند قطرے بھی نہیں تھے کہ ہمارا منہ دھلا جاتے۔ پھر مجھے کھیتوں کا خیال آئے گا...... بارانی علاقے کے

کھیتوں کا کہ جہاں نوخیز گندم کے شگوفے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ کب ان کے منہ میں آب حیات ٹپکتا ہے۔

میں نے ایک کتاب کھولی اور بڑے خشوع وخضوع سے ایک دعا پڑھی۔ آیئے! آپ بھی میرے ساتھ اس دعا میں شریک ہو جائے...... بارالہٰی ...... ہمیں اس بارش سے سیراب کر جو خشک سالی کو دور کرنے والی' سبزہ اگانے والی اور سرسبز کرنے والی' بڑے پھیلاؤ اور اتھاہ گہرائی والی ہو جس سے تو مرجھائی ہوئی گھاس کی رونق پلٹا دے اور سوکھے سڑے سبزے میں جان پیدا کر دے۔ خدایا! ہمیں ایسی بارش سے سیراب کر جس سے ٹیلوں پر سے پانی کے دھارے بہا دے' کنویں چھلکا دے' نہریں جاری کر دے' درختوں کو تروتازہ وشاداب کر دے۔ شہروں میں نرخوں کی ارزنی کر دے' چوپایوں اور انسانوں میں نئی روح پھونک دے' پاکیزہ روزی کا سروسامان ہمارے لئے مہیا کر دے' کھیتوں کو سرسبز وشاداب کر دے اور چوپایوں کے تھنوں کو دودھ سے بھر دے اور اس کے ذریع ہماری قوت وطاقت میں مزید قوت کا اضافہ کر دے''۔ آمین ...... (صحیفہ سجادیہ! مترجم مفتی جعفر حسین مرحوم)۔

کون جانتا ہے کہ کب آسمان کا دروازہ کھلے اور رحمت کا نزول ہونے لگے اور میرے اس کالم کے چھپنے تک مرجھائی ہوئی گھاس کی رونق پلٹ آئے اور نہریں جاری ہو جائیں۔ تب میں سمجھوں گا کہ اکیسویں صدی کا آغاز ایک ایسے ملک کے لئے یمن وبرکت کا باعث ہوا کہ جس کی معیشت کی خوشحالی کا انحصار سراسر اس کی زرعی ترقی وکامیابی پر ہے۔

(یہ کالم چھپ رہا ہے تو نقوی صاحب کی دعا قبول ہوگئی ہے' باہر ہمارا خدا بارش برسا رہا ہے۔)

14 جنوری 2000ء

ساڑھے چار کنال زرعی اراضی

میں موضع بھڑتھ تحصیل وضلع سیالکوٹ میں ساڑھے چار کنال زرعی اراضی کا مالک ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے کیونکہ زرعی معاشرے میں قدیم ہی سے زمین کی ملکیت باعث فخر سمجھی جاتی ہے۔ کاشتکار اور غیر کاشتکار کا امتیاز صدیوں پرانا ہے۔ انگریز کے زمانے میں اور کچھ عرصہ بعد تک بھی سکول کے حاضری رجسٹر کے ایک خانے میں درج ہوتا تھا کہ طالب علم کاشتکار یا غیر کاشتکار۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے صنعتکار زرعی اراضی خرید رہے ہیں کہ ان کا نام بھی کاشتکاروں میں شامل ہو جائے۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کبھی کبھار ترنگ میں آ کر کہا کرتے تھے کہ میں ایک کسان کا بیٹا ہوں۔ لیکن جناب نواز شریف نے آج تک نہیں کہا کہ میں ایک مزدور کا بیٹا ہوں۔

میں اپنے بزرگ سید محمد شاہ بادشاہ مرحوم کا احسان کن لفظوں میں ادا کروں کہ انہیں مغلوں کے آخری عہد میں یہ گاؤں جاگیر میں ملا اور اس درویش نے قبول فرمایا۔ وہ سیالکوٹ شہر سے اٹھ کر تین میل کے فاصلے پر یہاں نہ آ بستے تو میرے نام کے آگے بھی ''غیر کاشتکار'' لکھا جاتا۔ کہتے ہیں کہ کسی گاؤں میں ایک صاحب حیثیت جاٹ محفل لگاتے تو پلنگ کی پائنتی کی طرف بیٹھتے تاکہ کوئی آدمی ان کے سرہانے بیٹھنے کی جرات نہ کرے۔ گاؤں میں ایک نووارد سید ان کے سرہانے آ بیٹھا تو فرمانے لگے ''شاہ جی! سید سمجھ کر ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ یوں سرکاری کاغذوں میں تو آپ غیر کاشتکار ہی ہیں''۔

جب انگریز کے زمانے میں پہلا بندوبست ہوا تو ہمارے مزارعے گاؤں کی دو تہائی زمین کے مالک بن گئے۔ مجھے اس کا قطعاً کوئی افسوس نہیں کہ زمین اسی کی ہے جو اس پر ہل چلائے۔ ممکن ہے کہ انہی سے زمین چھین کر ہماری جاگیر قائم کر دی گئی ہو۔ حق بہ حقدار رسید۔ سیدوں کے پاس ایک تہائی زمین باقی رہ گئی البتہ عزت سادات سالم کی سالم، تاہم سید کو بھی ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھنا پڑا کہ روحانی سیادت سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اب حالت یہ ہے کہ جاگیردار بھڑتھ

سید محمد شاہ بادشاہ کا ایک وارث ساڑھے چار کنال زرعی اراضی کا مالک ہے اور وہ ہل کی ہتھی پر ہاتھ بھی نہیں رکھ سکتا۔ اس نے درس و تدریس کو اپنا پیشہ بنا کر روٹی کمائی اور کھائی۔

جب اٹھارہ کنال زمین اشتمال کی وجہ سے ایک جگہ اکٹھی ہوئی تو ہم بہن بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ اسے بانٹیں گے نہیں، تا آنکہ موضع بھڑتھ پھیلتے پھیلتے یہاں تک نہ پہنچ جائے۔ ہمارے وہ رشتہ دار جن کی زمین گاؤں کے قریب پڑی، بیچ بیچا کر انہیں کھا پی گئے ہیں۔ موضع بھڑتھ کی ایک ذیلی بستی ہماری زرعی زمین کی طرف بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے اور میرا دل کانپ رہا ہے کہ یہ زرعی زمین بھی سنگ و خشت کی نذر ہو گئی تو اٹھارہ کنال بانجھ ہو جائیں گے اور اس وقت تک بانجھ رہیں گے جب تک کالا باغ ڈیم تعمیر نہیں ہوتا اور اس سے نکلی ہوئی نہر ہمیں چولستان میں ان کا نعم البدل عطا نہیں کرتی۔ ان اٹھارہ کنالوں میں بھی سال کے سال چالیس پچاس من غلہ پیدا ہو ہی جاتا ہے اور ان کے کئی پیٹ بھرتے ہیں۔

سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گجرات، جہلم اور پنڈی کے اضلاع میں زرعی اراضی کنالوں اور مرلوں کی تنگ دامانی میں سمٹ گئی ہے۔ گویا زمین کی چادر دھجیاں بن گئی ہے جب تک ان دھجیوں کو سی کر ایک سالم چادر نہ بنائی جائے، زمین کی عریانی ڈھانپی نہیں جا سکتی۔ اراضی کے اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے زرعی اعتبار سے نہایت نقصان دہ ہیں۔ ان ٹکڑوں پر خود کاشت نہیں ہو سکتی۔ ٹھیکے پر دیئے جائیں تو نہ کھاد ڈالی جاتی ہے، نہ سلیقے سے پانی دیا جاتا ہے۔ ایسے ٹکڑوں پر کوئی محنت نہیں کی جاتی۔

کہا جاتا ہے کہ زرعی زمین کا چھوٹے سے چھوٹا فارم ساڑھے بارہ ایکڑ کا ہونا چاہئے۔ اگر چھوٹی ملکیتوں کے ان علاقوں میں کوآپریٹو فارم بنا دیئے جائیں تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے لیکن گزشتہ نصف صدی سے اس محکمے نے جو کارکردگی دکھائی ہے، اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے زرعی معاشرے نے صرف قرضوں کی حد تک اسے قبول کیا ہے۔

افواہ ہے کہ اب نئے سرے سے زرعی اصلاحات ہو رہی ہیں اور زمین کی ملکیت کی حد گھٹا کر دو مربعے کی جا رہی ہے۔ پہلے چار مربعے تھی۔ میں فطرتاً ترقی پسند ذہن رکھتا ہوں اور زمینداریوں کے حق میں نہیں لیکن کیا کروں کہ پاکستان کا معاشرہ بنیادی طور پر زراعت پر استوار ہے۔ یہاں تا حال صنعت کاری ناکام ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ پاکستان بیمار صنعتوں کا ہسپتال بن چکا ہے۔ اگر ملکیت کی حد اور گھٹا دی گئی تو تقسیم در تقسیم کے عمل میں یہاں کے ہر بڑے کاشتکار کا

وارث، چند سالوں میں اس ملکیت تک پہنچ جائے گا جہاں راقم الحروف پہنچ چکا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ گزشتہ زرعی اصطلاحات پر سختی سے عمل کیا جائے۔ میں حیران ہوں کہ جب ملکیت کی حد چار مربعے ہے، تو پاکستان میں بڑی بڑی زمینداریاں کیسے قائم رہ گئیں۔ یقیناً ان بڑوں نے زبردست قوت کے مالک پٹواری سے مل کر اصلاحات پر عمل نہیں ہونے دیا۔ اس افواہ سے پھر پٹواری کے وارے نیارے ہوں گے۔ لیکن ملک خوراک میں خود کفیل نہیں ہوگا اور گندم بھی درآمد کرنی پڑے گی اور برآمد کے لئے ہمارے پاس سوائے کشکول کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ اس سال سب سے بڑی نقد آور فصل کپاس کا جو حشر ہوا، وہ ہمارے سامنے ہے۔

حکومت کو چاہئے کہ زراعت پر زیادہ توجہ دے۔ کسان کو ہر قسم کی رعایت دی جائے، بارانی علاقے میں زیادہ تر انحصار بارشوں پر ہوتا ہے۔ وہاں بھی آبیاری کے ذرائع دریافت کئے جائیں۔ نہری علاقے میں مربع دو مربعے کے مالک آباد کارخانے خوشحال تھے، اب زمین کی تقسیم در تقسیم کی وجہ سے زمین کی آمدنی پر گزارہ ممکن نہیں رہا۔ اس کا بھی کوئی علاج دریافت کیا جائے۔

اگر میرے علاقے میں کوئی زرعی اصلاحات ہوئیں تو میں اپنی ساڑھے چار کنال زمین مفت میں دینے کو تیار ہوں لیکن یہ اصلاحات جلد ہونی چاہئیں اگر میرے گاؤں کی ذیلی بستی میری زمین تک پہنچ گئی تو میں دس بارہ لاکھ کی قربانی دینے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکوں گا۔ آخر میں بھی تو اسی معاشرے کا فرد ہوں جو لوٹا ہوا مال واپس نہیں کرتا اور تھانے کی حوالات قبول کر لیتا ہے۔

24 جنوری 2000ء

الہ دین کا چراغ......(1)

ان دنوں اپنے ہاں ٹیلی ویژن ڈرامے کم لگتے ہیں اور اشتہارات زیادہ لیکن کبھی کبھار کوئی اشتہار اتنا چونکا دینے والا ہوتا ہے کہ میں ڈراما بھول جاتا ہوں اور اشتہار میں محو ہو جاتا ہوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ برتن دھونے والی صابن کی ایک ٹکیا سے اچانک ایک جن برآمد ہو جاتا ہے اور برتن صاف کرنے والی خوبرو گھریلو خاتون سے کہتا ہے ''آقازادی! میں حاضر ہوں''۔ یہ خاتون اس سے ذرا بھر خائف نہیں ہوتی اور اسے برتن دھونے پر لگا دیتی ہے۔ غلیظ برتن چشم زدن میں دھل جاتے ہیں تو جن بھی غائب ہو جاتا ہے۔ شاید ٹکیا میں سما گیا ہوگا۔ مجھے اس گھریلو قسم کے ''ڈش واشر'' جن سے یک گونہ ہمدردی محسوس ہوئی کہ پاکستان کے ایک باورچی خانے میں اسے بے چارے جن کی کیا حیثیت باقی رہ گئی ہے؟ نہ جانے کس ستم ظریف جادوگر نے اسے صابن کی ٹکیا میں بند کر دیا تھا۔ اتنا عاجز و درماندہ جن پہلے کس نے دیکھا ہوگا۔ داستانوں میں تو یہی پڑھا تھا کہ جناب جب اپنا حلوہ دکھاتے ہیں تو زمین و آسمان پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے' زلزلے آتے ہیں اور سمندر اچھل پڑتے ہیں۔ مجھے تو باورچی خانے کا یہ جن ایک گھٹیا سی پیروڈی معلوم ہوا کہ اس کے چہرے پر جناتی ماسک بھی فٹ نظر آ رہا تھا۔

میرا ذہن آج سے کئی برس پہلے کے ایک ڈرامے کی طرف منتقل ہو گیا۔ ان دنوں ٹیلی ویژن پر بعض اچھے ڈرامے بھی دکھائے جاتے تھے۔ یہ ایک علاقائی کھیل تھا۔ ایک پاکستانی (ایکٹر انور علی) کو نہ جانے کیسے ایک جن کی خدمات حاصل ہو جاتی ہیں۔ لمبا تڑنگا خاصا خوفناک جن جیسا کہ جن کو ہونا چاہیے! یہ پاکستانی اپنی پہلی خواہش ہی اپنے ظرف کے مطابق کرتا ہے یعنی اس سے ''نان چھولے'' تیل منگواتا ہے۔ پھر مصالحہ گھٹواتا ہے' بازار سے ہلدی' نون تیل منگواتا ہے۔ شروع شروع میں وہ جن بازار میں سے گزرتا تو لوگ اسے انگشت بدنداں ہو کر دیکھتے۔ پھر اس کا قد کاٹھ گھٹنے لگتا ہے اور آخر میں وہ ''بونا'' ہو کر رہ جاتا ہے۔ لوگ اس پر انگلیاں اٹھاتے ہیں' تو وہ کہتا ہے کہ میرا اس میں کیا قصور؟ قصور تو میرے آقا کا ہے کہ جس کا ظرف ہی بہت چھوٹا ہے''

بونے جن'' کا کردار گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک ذہین ''بونے'' طالب علم نے ادا کیا تھااور بہت اچھاادا کیا تھا۔ یقیناوہ صاحب عزیمت طالب علم اب ''بونے'' سے جن بن گیا ہوگا۔

یہ ڈراما محترم عطاء الحق قاسمی نے تحریر فرمایا تھااور الحق بہت معنویت کا حامل تھا۔ اگر اب وہ اس خیال کو آگے بڑھائیں تو بلاشبہ ایک انوکھااور منفرد سیریل وجود میں آئے گا۔

''بونے جن''اور''صابن کی ٹکیاوالے جن'' سے میرا خیال آج سے دس بارہ ہزار سال پہلے کے ایک جن کی طرف منتقل ہو گیا ہے' جوایک طلسماتی چراغ کا قید تھااور جو چین کے ایک عظیم سپوت الہ دین کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ وہ ایک غریب درزی کا کھلنڈرا سا کام چور بیٹا تھا لیکن جب وہ چراغ کی طلسمات سے آگاہ ہوااور بے پناہ قوتوں والے ایک جن کا مالک بنا تو اس کے اندر بھی ایک عظیم انسان نے جنم لے لیا کہ جس نے خاقان چین کے ساتھ شرف دامادی کا اپنا عظیم مقصد قرار دیا۔ اس نے بڑے بڑے محلات تعمیر کروائے' خزانوں کے منہ کھول دیئے' خاص و عام پر زرو جواہر نچھاور کئے گویا دولت پر سانپ بن کر نہ بیٹھا بلکہ اسے گردش میں لا کر رفاہ عامہ پر خرچ کرتا رہا۔ اس نے اپنے ملک کے بیت المال میں زرو جواہر کے ڈھیر لگا دیئے۔

یہاں خیال کی پٹڑی بدلتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ یہ طلسماتی چراغ کسی پاکستانی الہ دین کے ہاتھ لگتا تو وہ پہلا حکم کیا دیتا؟ میرا خیال ہے کہ کہتا ''اے جن! سب سے پہلا یہ کام کرو کہ غار کا سارا خزانہ میرے گھر کی کوٹھڑی میں منتقل کردو اور تالہ لگوادو'' اس کے بعد اس کا دوسرا حکم ہوتا ''فی الحال کوٹھڑی کے فرش پر دستر خواں بچھاؤ اور نان چھولوں کا اہتمام کرو۔ اگر تکلیف نہ ہو تو تھوڑا سا گجریلا بھی کہیں سے مہیا کردو'' پیٹ پوجا کر لینے کے بعد وہ ایک نئی تشویش میں مبتلا ہو جاتا' چراغ رگڑ کر جن کو طلب کرتا اور کہتا ''محترم جناب جن صاحب! مجھے انکم ٹیکس والوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ انہیں خبر ہوگئی تو ایک تو وہ اپنا حصہ مانگیں گے اور پھر دولت ٹیکس لگا کر آدھا خزانہ لے اڑیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اسے سوئٹزرلینڈ کے کسی بنک میں جمع کروادیں اور کوڈ نمبر مجھے لا دیں۔ اس کے بعد میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ صرف نان چھولوں کی فراہمی کا کام لیا کروں گا۔ تھوڑے سے گجریلے کی آپ کو تکلیف مزید کرنا پڑے گی''۔ (جاری ہے)

30 جنوری 20ء

الہ دین کا چراغ......(آخری قسط)

الہ دین کے بعد اس کا چراغ نہ جانے کس کو ورثے میں ملا۔ ایسی کوئی داستان ''الف لیلیٰ'' میں موجود نہیں۔ کیا یہ چراغ گم ہو چکا ہے؟ اسے گم نہیں ہونا چاہئے۔ یقیناً گم نہیں ہوا ہوگا لیکن کوئی الہ دین دوبارہ پیدا نہیں ہو سکا۔ ہوا ہو تو کسی داستان نے اس کا نام محفوظ نہیں رکھا۔ یوں ہر شخص کے دل میں اس چراغ کی خواہش موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ چراغ ہر ایک کو بقدر ظرف ملتا بھی ہے لیکن کوئی کوئی ہے جو اس سے کام لیتا ہے۔

ہمارے حکمران جب اپنے وعدوں کی ایفا میں ناکام ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں ''ہمارے پاس الہ دین کا چراغ تو نہیں کہ معجزے دکھائیں'' لیکن عجیب بات ہے کہ معجزے دکھاتے بھی رہتے ہیں۔ انہیں کوئی چھوٹا موٹا چراغ ضرور مل جاتا ہے کہ راتوں رات ''سرے محل'' تعمیر ہو جاتا ہے' اگر چہ اپنی سرزمین پر نہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے جن کے لئے بھی مشرق و مغرب کی اتنی مسافت کیا معنی رکھتی ہے؟ اور اسے سنوارنے نکھارنے کے لئے اپنے ملک کے عجائب گھروں کے نوادرات بھی اس میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہ خالصتاً کسی ''بونے جن'' کی کارستانی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس بیچارے کی رسائی اپنے ہی گھر تک ہے' وہ الہ دین کے خزانوں والے غار میں بھلا کیسے پہنچتا؟

ہمارے ملک میں جس کسی کے ہاتھ میں کوئی ''جن'' آتا ہے' وہ سلطنت کے اندر سلطنت تعمیر کر لیتا ہے۔ عالی شان فیکٹریاں لگتی ہیں' بڑے بڑے کمپلیکس تعمیر ہوتے ہیں' ایک خاندان جس کے افراد کی تعداد بیس پچیس سے زیادہ نہیں ہوتی' وہ بیک وقت بیس پچیس محل تعمیر کرتا ہے۔ صرف اپنے ملک ہی میں نہیں' باہر کے ملکوں میں بھی ''مے فیر فلیٹس'' خریدے جاتے ہیں اور اپنے ملک میں ان کے محلات کے زیرِ سایہ جو جھونپڑیاں بنتی ہیں' انہیں اجاڑ دیا جاتا ہے کہ محلات میں توسیع ہو سکے۔ کبھی تو میرے دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں الہ دین کے جن سے بڑا جن ہے لیکن اس کے پاس الہ دین کے غار والا خزانہ نہیں۔ پھر وہ خزانہ لاتا کہاں سے ہے؟ جب ملک کے بیت المال کا خزانہ دار یہ اعلان کرتا ہے کہ دو سو گیارہ ارب روپے خزانے سے غائب ہیں' تو اس بڑے جن کی طلسماتی قوتوں پر پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ ''چراغ'' روشنی کی

علامت ہے۔ان کا یہ ''جن'' چراغ یعنی روشنی کے تابع نہیں تو اس کی پناہ گاہ کہاں ہے؟ کسی انگوٹھی میں' کسی چمچے کانٹے میں' کسی تانبے کے کٹورے میں' یا کسی تام چینی کی کیتلی میں۔ایک عرصہ غور وخوض کے بعد یہ عقدہ کھلتا ہے کہ اس کی ''پناہ گاہ'' وہی ''کشکول'' ہے جسے ہر آنے والا حکمران توڑنے کا وعدہ کرتا رہا اور توڑ نہ سکا۔

الہ دین کے چراغ والا جن ایک عظیم جن ہے' وہ بھکاریوں کے ہاتھ نہیں آتا کہ ملک کے نام پر بھیک مانگیں اور اسے کہیں کہ اسے سوئٹزرلینڈ میں منتقل کر دو۔اس نے ان تہہ خانوں کو خالی کیا جہاں دولت بے کار پڑی تھی اور وہ گردش میں آئی تو الہ دین کا چین خوشحال ہو گیا۔میں ٹیوب کی روشنی میں یہ سطور لکھ رہا تھا کہ اس نے ایک جھپکی لی اور فضا میں تھرتھراہٹ سی پیدا ہوئی۔ایک گرج دار آواز نے کہا ''آقا! میں حاضر ہوں'' آواز میں اتنی ہیبت تھی کہ میں لرز گیا اور میری زبان لڑکھڑا گئی ''تت تت! تم کون ہو؟''

''میں الہ دین والا جن ہوں جب سے چراغ متروک ہوا ہے' میں نے ٹیوب کو اپنی آماجگاہ بنالیا ہے۔فرمایئے! کیا حکم ہے؟''

''اے شاہ جنات! حکم نہیں استدعا ہے اگر الہ دین کے غار میں کچھ بچا ہو' تو لے آیئے کہ میرے غریب ملک کا خزانہ خالی ہے''۔آقا! مجھے افسوس ہے کہ وہ غار خالی ہو چکا۔وہاں ایک کھوٹی اشرفی بھی باقی نہیں رہی۔کوئی اور خدمت ہو تو فرمایئے میں اسے بجالانے کو تیار ہوں'''' اے شاہ جنات! مجھے ایسی کوئی خدمت یاد نہیں آرہی جو آپ کے شایان شان ہو''۔آقا! سرے محل اور رے فیر فلیٹس کے متعلق کیا حکم ہے؟''

''انہیں وہیں رہنے دو' شاہ جنات کہ ان کی جڑ اس سرزمین پر نہیں لگ سکتی...... ہاں یاد آیا! اس غریب ملک کا اربوں' کھربوں زر مبادلہ سوئٹزرلینڈ کے بینکوں اور لاکروں میں پڑا گل سڑ رہا ہے' اسے سٹیٹ بنک میں منتقل کر دو'' میں نے کہا۔

''میں سوئٹزرلینڈ کے لاکرز آپ کے قدموں میں ڈھیر کر سکتا ہوں لیکن انہیں سٹیٹ بنک میں جمع نہیں کراؤں گا''۔''وہ کیوں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔''اس لئے میرے آقا! کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے جن جو کسی انگوٹھی میں بند ہیں یا چمچے کانٹے میں' یہاں اکثر برآمد ہوتے رہتے ہیں۔وہ انہیں آہستہ آہستہ پھر سوئٹزرلینڈ کے نئے لاکروں میں پہنچا دیں گے''۔

میں پوچھتا ہوں ''اے شاہ جنات! اس ملک میں مہنگائی کا ایک جن ہے' وہ کس انگوٹھی' چمچے' کانٹے' کیتلی کٹورے' چھری کانٹے کا قیدی ہے؟'''' میرے آقا! وہ بوتل کا جن ہے۔کسی

نے لالچ میں آ کر اس کا مہر بند ڈھکنا کھول دیا۔اب وہ بوتل میں واپس نہیں جا رہا‘‘’’اے شاہ جنات!‘‘میں نے اپنی آواز میں خوشامد کی دلگدازی پیدا کرتے ہوئے کہا’’آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔کیا اس جن کو بوتل میں واپس جانے پر مجبور نہیں کر سکتے؟‘‘

’’نہیں میرے آقا!وہ مجھ سے بھی بڑا جن ہے۔کیا آپ نے آئی ایم ایف کا نام نہیں سنا؟اس کے سامنے دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں دست بستہ کھڑی رہتی ہیں۔میں بھلا کس شمار میں ہوں؟‘‘تب ٹیوب نے دو چار جھپکیاں لیں۔میں نے جان لیا کہ لرزتا کانپتا جن اس میں سما گیا ہے اور آئی ایم ایف کے خوف سے میرے تن بدن پر بھی کپکپی طاری ہوگئی!

ہمارے ہاں جب بھی کوئی حکومت بدلتی ہے‘ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ الہ دین کا چراغ بھی لے آئی ہے اور منٹوں سیکنڈوں میں ملک کی تقدیر بدل کر رکھ دے گی‘ہر طرف دولت کی ریل پیل شروع ہو جائے گی۔ہر آدمی محنت کے بغیر خوشحالی کا لحاف اوڑھ کر پلنگ پر سو جائے گا۔ڈالر اور پونڈ درختوں پر لگنے لگیں گے(بیچارے روپے کو تو کسی جڑی بوٹی کا پھل بننے کی توفیق بھی حاصل نہیں ہوگی)سب سے بڑا معجزہ یہ ہوگا کہ مہنگائی کے جن کو اپنے آپ بوتل میں جانا پڑے گا اور حکمران اس کے منہ پر مہر لگا دے گا۔اگر نئی حکومت کے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ آیا ہوتا تو کیا دو سو گیارہ ارب روپے کے قرضے سے تا حال صرف گیارہ ارب روپے ہی وصول ہوتے؟ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ باقی دو سو ارب روپے کے نادہندگان کہاں گئے؟کیا وہ اپنے اپنے جن کے پروں پر سوار ہو کر ملک سے پرواز کر گئے ہیں یا خود جن بن کر اپنی اپنی انگوٹھیوں میں سما گئے ہیں۔دو چار صورتیں بی کلاس میں بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں کہ چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے۔ان کا کھانا گھر سے آتا ہے اور وہ ’’الف لیلیٰ‘‘کے ابوالحسن کی طرح سوتے جاگتے میں دن بسر کرتے ہیں۔کیا لطف انبساط کی زندگی ہے!

اتنا لکھ چکنے کے بعد سوچتا ہوں کہ آیا واقعی الہ دین کا چراغ دنیا سے گم ہو چکا ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ جی نہیں مانتا کہ اسے گم شدہ کہا جائے۔یہ امید کا دیا ہے کہ گم ہو سکتا ہے‘نہ بجھ سکتا ہے۔یہ چراغ اسی دنیا میں کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے۔ذرا غور کرنے پر یہ معمہ اپنے آپ حل ہو جاتا ہے۔یہ چراغ اب کسی ایک الہ دین(فرد)کے ہاتھ نہیں لگتا بلکہ بہت سے الہ دین ایک نصب العین پر نگاہیں جما دیں تو خود بخود ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔اور یہ چراغ اسی سر زمین میں ہے‘جہاں یہ پہلی بار دریافت ہوا تھا!

31 جنوری 2000ء

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

انہیں دنوں ایک خبر نظر سے گزری ہے کہ وطن عزیز میں ماشاء اللہ محکمہ تعلیم کرپشن میں تیسرے نمبر پر آ گیا ہے۔ میں تو بھونچکا سا رہ گیا۔ بھلا محکمہ تعلیم کا کرپشن سے کیا تعلق؟ خبر سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کرپشن کون کرتا ہے؟ استاد یا انتظامیہ کا کوئی فرد؟

یہ سب کو معلوم ہے کہ ہماری بیوروکریسی نے بتدریج انتظامیہ کو استاد پر حاوی و مسلط کر دیا ہے۔ انتظامیہ اتنی طاقتور ہو چکی ہے کہ استاد کو کسی بڑے مسئلے یا فیصلے میں شریک نہیں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ استاد بھی اس پر بڑی بے دلی سے عمل کرتا ہے اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

کوئی زمانہ تھا کہ ایک پورے صوبے کے محکمہ تعلیم کا سربراہ ڈی پی آئی ہوا کرتا تھا۔ خان بہادر شیخ نور الٰہی' رائے صاحب من موہن رام' پطرس بخاری انڈین ایجوکیشنل سروس کے آدمی تھے۔ ان کے بعد ایس ایم شریف پہلے ڈی پی آئی تھے جنہیں صدر ایوب مرحوم کے زمانے میں پہلا سیکرٹری تعلیم بنایا گیا تھا۔ بعد ازاں اساتذہ میں سے کچھ اعلیٰ پائے کے لوگ سیکرٹری ایجوکیشن کے عہدے پر فائز ہوئے مثلاً ڈاکٹر محمد اجمل مخدوم اور پروفیسر رشید احمد۔ ان کے بعد بیوروکریسی نے کسی استاد کو سیکرٹری نہیں بننے دیا (اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو) سیکرٹری تعلیم کا عہدہ تخلیق ہونے سے پہلے اور بعد میں بھی ڈی پی آئی کا عہدہ قائم رہا۔ تعلیمی پالیسی پر بیوروکریسی حاوی ہو گئی لیکن انتظام ڈی پی آئی کے ماتحت تھا۔ اب حال یہ ہے کہ پالیسی کے علاوہ روزمرہ کے انتظامی معاملات بھی سیکرٹری نے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں مثلاً جب ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کا عہدہ قائم ہوا' تو اس کے تقرر کا اختیار سیکرٹری نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک سابق سیکرٹری ایجوکیشن اس معاملے میں خاصے مشہور بھی ہوئے۔

اب ایک صوبے میں دو سیکرٹری ایجوکیشن ہیں' ایک کالجوں کے لئے اور ایک سکول کے لئے۔ دونوں سول سروس کے آدمی ہیں۔ ان کے ماتحت کئی ڈپٹی سیکرٹری اور سیکشن آفیسر ہیں۔ ڈی پی آئی بھی دو ہیں۔ ایک کالجوں کے لئے' ایک سکولوں کے لئے۔ ہر ڈی پی آئی کے ساتھ ایک

ایڈیشنل ڈی پی آئی بھی ہے اور ہر سیکرٹری کے ساتھ ایک ایڈیشنل سیکرٹری بھی اور ہر ڈویژن کا ڈائریکٹر ایجوکیشن الگ ہے۔ اس کے ماتحت کئی ڈپٹی اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوتے ہیں۔ ضلع کی تعلیم کا ذمہ دار ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر ہے' جس کا کبھی ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز نام ہوتا تھا۔ ڈویژن اور ڈسٹرکٹ کی سطح پر زنانہ اور مردانہ ڈبے الگ الگ ہیں۔ ان کے ماتحت اسسٹنٹ ایجوکیشن افسروں کی ایک فوج ظفر موج ہے۔ اتنے سارے افسروں کی نگرانی میں جو نظام چل رہا ہے' اس میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس اور پاکستان ریلویز کا نمونہ صاف نظر آتا ہے۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس تو روٹ سے غائب ہو چکی ہے اور فی الحال ریلوے کی گاڑی چلتی ہوئی نظر آ رہی ہے لیکن تا بہ کے' جس محکمے کے ایک لاکھ ملازمین میں سے چالیس ہزار گھر بیٹھ کر تنخواہ بھی لیتے ہوں اور اوور ٹائم بھی' وہ کب تک پہیے کو ریلوے لائن پر چلتا ہوا رکھے گا۔

محکمہ تعلیم کی ٹاپ ہیوی انتظامیہ اس بجٹ کی کمر توڑ دیتی ہے' جو اس رفاہی محکمے کو ملتا ہے۔ مجھے اعداد و شمار تک رسائی نہیں تاہم یہ صاف ظاہر ہے کہ ترقیاتی کاموں کے لئے کم ہی بجٹ بچتا ہو گا اور کرپشن بھی اسی بجٹ میں ہوتی ہو گی۔ اس پر یہ دعویٰ کہ 1999ء کے آخر تک پاکستان کی خواندگی کی شرح چالیس فیصد ہو گئی ہے۔ اسی رپورٹ میں یہ بھی درج ہے کہ ملک میں پچاس ہزار ایسے سکولوں کو بند کر دیا گیا ہے' جن میں طلبا کی تعداد بیس سے کم تھی۔ گویا ایک لاکھ طلبا بیک جنبش قلم تعلیم سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان سے پہلے ہزاروں گھوسٹ سکول بند کئے گئے اور ہزاروں اساتذہ کو آوارہ روحیں بنا دیا گیا۔ یہ ارواح اگر عالم بالا میں چلی گئی ہیں تو الحمد اللہ۔ اگر روئے زمین پر موجود ہیں تو انہیں قوت لایموت کہاں سے ملتی ہے؟

کسی زمانے میں انسپکشن سٹاف سکولوں کا باقاعدہ معائنہ کرتا تھا۔ سالانہ معائنہ ہوتا تو سکول کو نئی زندگی مل جاتی۔ عمارت کے دیوار و در زندہ ہو جاتے۔ طلباء صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس نظر آتے۔ اب سالانہ یا سرپرائز معائنے کا سلسلہ قریب قریب ختم ہو چکا ہے اور ایجوکیشن آفیسر جو کبھی انسپکٹر ہوتا تھا' دفتر کی کرسی پر بت بن کر بیٹھ گیا ہے اور دفتر میں افراتفری کا یہ عالم ہے کہ فائل اکثر گم رہتی ہے اور معجزاتی طور پر مل بھی جاتی ہے۔ سائل جس طرح کچہری' پاسپورٹ اور اے جی آفس اور ٹیکس وصول کرنے والے دفتروں میں سرگرداں و پریشان نظر آتے ہیں' وہی حال ان کا ایجوکیشن دفتروں میں بھی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ 1983ء میں جب میں ریٹائر ہوا تو سیکرٹریٹ میں میرا فائل کور تو موجود تھا لیکن اس میں گزشتہ بیس اکیس سالہ سروس کا کوئی ریکارڈ لگا ہوا نہیں تھا'

جو میں نے خود مہیا کیا اور اس سے پہلے کے دور ملازمت کی سروس بک غائب تھی جسے میں نے خود دریافت کیا' ورنہ آج 1999ء تک میں ریٹائر نہ ہو سکتا' کم از کم پنشن کی حد تک۔ معلوم نہیں کہ 1999ء میں ریٹائر ہونے والے اساتذہ پر کیا بیتتی ہے۔

اتنی انتظامیہ کے باوجود نہ تعلیم بہتر ہوئی' نہ دفتری انتظام۔ اس وقت پاکستان میں چار لاکھ اساتذہ قوم کو زیور تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں اور حالت یہ ہے کہ بیشتر سکولوں میں ٹاٹ بھی غائب ہیں اور اکثر سکول چادر اور چار دیواری کے بغیر چل رہے ہیں۔ استاد کو صرف تنخواہ سے غرض ہے اور کم تنخواہ کا رونا رویا جا رہا ہے۔ ایسا کوئی زمانہ دکھایئے کہ جب استاد فرش سے اٹھ کر محل میں پہنچا ہو۔ جس ملک میں غریب کو دو وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی' وہاں کا استاد اگر پیٹ بھر کر کھانا کھا لیتا ہے تو اسے بھی غنیمت سمجھے۔ اس وقت اگر محکمہ تعلیم کے ماتھے سے کرپشن کا ٹیکا مٹ سکتا ہے تو یہ کارنامہ صرف اور صرف شاہین صفت استاد ہی انجام دے سکتا ہے۔ افسوس کہ ان میں سے بہت سے شاہینوں نے کرگسیت اختیار کر لی ہے!

8 فروری 2000ء

بھل صفائی

نہروں، مائیزوں، راجباہوں اور کھالوں کی بھل صفائی مکمل ہو چکی ہے۔ یہ منظر ٹیلیویژن کی سکرین پر آتا تھا تو جی خوش ہو جاتا تھا۔ فوجی جوانوں کو کسانوں کے سنگ کسّی اور بیلچہ چلاتے دیکھ کر ولولہ پیدا ہوتا تھا کہ قلم چھوڑ کر کسّی ہاتھ میں لے لو، خواہ ایک دو ٹپ لگا کر بھل کے ڈھیر پر اوندے منہ ڈھیر کیوں نہ ہو جاؤں۔ اب جی چاہتا ہے کہ قلم کو بیلچہ بنالوں اور جہاں جہاں بھل نے آب رواں کے راستے مسدود کر دیئے ہیں، وہاں ٹپ پہ ٹپ لگاؤں اور پانی کو ''ٹیل'' تک پہنچاؤں کہ نیکی، امانت، دیانت، خلوص اور محبت کے جو کھیت بنجر ہو گئے ہیں، وہ پھر سے زرخیز ہو جائیں۔ پتہ نہیں کیوں ہر آب رواں کی ''ٹیل'' پر غریب دہقانوں ہی کے کھیت آب حیات کو ترستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

''بھل صفائی'' پر ان سیاستدانوں نے کہ جن کے اندر کی ''بھل'' ابھی صاف نہیں ہوئی، طرح طرح کے اعتراض بھی کیئے ہیں مثلاً فوج کے سپاہی کا کام بندوق چلانا ہے نہ کہ بیلچہ۔ جب تک وہ بھل صفائی میں مصروف رہیں گے، سرحدوں کے پاسبان کم ہو جائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ انہیں سیاستدانوں سے پوچھا جاسکتا ہے کہ آپ نے اپنے دور اقتدار میں فوج سے ''واپڈا'' کی بھل صفائی کیوں کرائی؟ جب آپ کا نہایت ''ایمانداری'' سے باندھا ہوا بند سیلاب کے ایک ہی ریلے میں بہہ جاتا رہا ہے تو فوج کو مدد کیلیئے کیوں پکارا جاتا رہا۔ اور تو اور گھوسٹ سکولوں کی تلاش میں جب محکمہ تعلیم ناکام ہو جاتا ہے یا کامیاب نہیں ہونا چاہتا تو آپ فوج کو بدروحوں کے پیچھے کیوں لگا دیتے رہے ہیں۔ کیا فوج حاضرات کے عمل میں ماہر ہے؟ اور وہ سڑکیں جہاں سے آپ کو کمیشن ملنے کی توقع نہ ہوتی تھی، وہ فوج کے سپرد کیوں کر دیتے رہے؟ میں ان سیاستدانوں سے کہ جو حوالات سے باہر ہیں، یہ کہتا ہوں کہ آپ لنگر لنگوٹا کس کر فوج کے ساتھ شامل کیوں نہیں ہو جاتے۔ کم از کم ٹیلیویژن پر آپ کی تصویر تو آجائے گی جو ایک مدت سے غائب ہے اور ممکن ہے کہ آپ کچھ عوامی ہمدردی بھی حاصل کر لیں۔

''بھل صفائی'' محکمہ انہار کے فرائض میں داخل ہے۔ اس کیلئے اسے کچھ بجٹ بھی ملتا ہے۔ کارکنان محکمہ انہار اس موسم کا بہت شدت سے انتظار کرتے ہیں جو بھل صفائی کیلئے مخصوص ہے۔ اس بار فوج نے لقمہء تر ان کے منہ سے چھین لیا ہے۔ میں نے گزشتہ نصف صدی میں نہروں کی بندش کے دوران کئی بار سفر کیا ہے۔ نہروں اور راجباہوں کے پلوں پر سے گزرا ہوں۔ کہیں بھل صفائی کا منظر نظر نہ آیا' الا ایک دوبار کہ جب پنجاب کے چیف منسٹر غلام حیدر وائیں مرحوم ہوا کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں میں نے راجباہوں کی بھل صفائی کا منظر دیکھا تھا' جس میں کاشتکار اور سکول کے بچے شامل ہوتے تھے۔ خدمت ملک وقوم کا یہ منظر ان کے بعد کبھی نظر نہ آیا۔ بہر حال مرحوم کو یہ کریڈٹ ضرور ملنا چاہئے کہ انہوں نے محکمہ نہر کی فرضی بھل صفائی کو اصلی بنا دیا یعنی وہ کاغذ سے نکل کر کسّی اور بیلچے کے پھل پر آ گئی۔

بھل صفائی اس زمانے سے ہو رہی ہے جب سے پنجاب اور سندھ میں نہروں کے ذریعے آبپاشی کا نظام وجود میں آیا۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک منظر یاد ہے جب میں چک نمبر 31 نزد چیچہ وطنی میں مقیم تھا۔ یہ چک راجباہ 11-L ٹیل پر واقع ہے۔ جب نہروں کی ''بندی'' ہوئی تو راجباہ سوکھ گیا۔ گاؤں میں ڈھنڈورا پٹا اور اگلے دن چک کے کاشتکار اپنے حصے کے راجباہ کی بھل صفائی میں مصروف نظر آئے۔ یہ انگریز کے زمانے کی بات ہے۔

میں حیران ہوں کہ پاکستان بننے کے بعد اپنی مدد آپ کا جذبہ کیوں باقی نہ رہا؟

آج سے کئی سال پہلے چین نے اپنے دریاؤں کی بھل صفائی کرائی تھی۔ چین کے سفارتخانے سے شائع ہونے والے تصویری رسالے میں اس کے منظر دکھائے جاتے تھے۔ ننھے منے بچے پیالے ہاتھ میں لئے دریا میں اترتے اور تھوڑی سی بھل لے کر بند کی پہاڑی پر چڑھتے اور پیالے خالی کر دیتے۔

ہماری نہریں اور راجباہے تو ایک طرف' ہمارے دریا بھی بھل سے اٹ گئے ہیں۔ ان کا ظرف اتنا چھوٹا ہو گیا ہے کہ بارش معمول سے کچھ ملی میٹر بڑھ جائے تو ان میں سیلاب آ جاتا ہے اور بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایسے ہی بھل منگلا ڈیم اور تربیلا ڈیم کے ظرف کو بھی تنگ سے تنگ تر کرتی چلی جا رہی ہے۔ اگر پختونستان کے خوانین اعظم نے کالا باغ ڈیم تعمیر کرانے کی اجازت نہ دی تو منگلا اور تربیلا کی بھل صفائی بھی لازمی ہے۔

میرے کانّ اس ڈھول کی آواز پر لگے ہوئے ہیں جب دریاؤں اور ڈیموں کی بھل

صفائی ہو رہی ہو گی اور ٹریکٹروں، شاولروں اور بلڈوزوں کے جلو میں صدر محترم سے لیکر بیلدار اور چپراسی تک بھل صفائی میں مصروف ہوں گے۔ جرنیل صاحبان تو اس کار خیر میں یقیناً مصروف کار نظر آئیں گے اور ان کے ساتھ کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور سیکرٹری صاحبان بھی ٹائیاں اتار کر دریاؤں اور ڈیموں میں اتر جائیں گے محمود و ایاز کے ایک ہی صف میں شامل ہو کر ہاتھ سے کام کرنے کا یہ نظارہ کتنا ایمان افروز ہو گا اور اس تصویر میں نرسری کلاسوں کے بچے اپنے پیارے پیارے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے پیالے لئے معصومیت اور بے ریائی کا رنگ بھر رہے ہوں گے تو کتنے اچھے لگیں گے۔ ان کے شانہ بشانہ ستر سال سے لے کر ایک سو پینتیس سال تک کی عمر کے بزرگ بھی علامتی طور پر بیلچے اپنے ہاتھ میں لئے کھڑے ہوں گے تو گویا تصویر کی تکمیل ہو جائے گی۔

یوں لازم ہے کہ پوری قوم کی بھل صفائی ہو۔ خواجہ ہو یا مزدور، وہ خدا ہو یا دہقان، سپاہی ہو یا آئی جی، بیلدار ہو یا چیف انجینئر سبھی بھل صفائی کے محتاج ہیں۔ سب سے زیادہ ضروری ہے کہ نہروں اور راجباہوں کے بعد محکمہ نہر کی بھل صفائی ہو۔ جب بھل صفائی دیانت و امانت کی سطح تک پہنچ جائے گی تو انشاء اللہ ٹیل پر کاشت کرنے والے دہقان کو پانی ضرور ملے گا ورنہ بھل صفائی کے بعد ہر مائنر اور راجباہ کے موگے پھر سے کھلے کر دیئے جائیں گے اور پانی اتنا بچے گا ہی نہیں کہ ٹیل تک پہنچ سکے۔

14 فروری 2000ء

مختصر افسانہ اور ٹیلی ویژن

جب پاکستان میں ٹیلی ویژن کا اجرا ہوا تھا، تو اردو کے مختصر افسانے کو خاص طور پر قابل اعتنا سمجھا گیا تھا۔ بہت سے افسانوں کی ڈرامائی تشکیل ہوئی اور ان کی وجہ سے ٹیلی ویژن کے پروگرام مقبول ہوئے۔ ان دنوں پی ٹی وی ایک قومی وملی ادارہ تھا جس کے پروگراموں میں پاکستان کے کلچر کی تشہیر واشاعت لازمی ہوا کرتی تھی۔ اب یہ ایک نیم خودمختار تجارتی ادارہ بن چکا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا مقصد زیادہ سے زیادہ ریونیو اکٹھا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں پی ٹی وی پر قدیم اور جدید ادبی افسانے کو بہت کم نمائندگی مل رہی ہے اور لمبے لمبے شیطان کی آنت قسم کے سیریل لگائے جاتے ہیں کہ جن کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر۔ شاید ہی کوئی ایسا سیریل ہو جو ناظرین کے ڈرامائی ذوق کی تسکین کر سکتا ہو۔

ان دنوں ڈراما کلاسک کے عنوان سے ایک سیریل چل رہا ہے جس میں کچھ قدیم اردو افسانوں کی ڈرامائی تشکیل پیش کی جاتی ہے لیکن اشتہارات کی پیشکش زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے ایک مختصر افسانے کو دو تین قسطوں تک بڑھانے کے لئے اس بے دردی سے کھینچا تانا جاتا ہے کہ اکثر افسانے کی رگ جاں درمیان ہی میں ٹوٹ جاتی ہے۔ پچھلے دنوں جناب اشفاق احمد کے ''ایک محبت سو افسانے'' کو قند مکرر کے طور پر ٹیلی کاسٹ کیا گیا جن شائقین نے بشمول راقم الحروف اس سیریل کو دیکھا، انہیں یہ نقش ثانی بہت کمزور اور مدہم نظر آیا بلکہ یہ نقش اول کی تحریف محسوس ہوا۔ ممکن ہے کہ نوجوان نسل نے اس سے لطف اٹھایا ہو لیکن میرا خیال ہے کہ نہیں اٹھایا ہوگا کیونکہ پرانی شراب پرانی بوتل ہی میں قیمتی ہوتی ہے۔ شراب وہی تھی لیکن نئی بوتل نے اسے کوئی دلکشی عطا نہ فرمائی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈرامائی تشکیل میں اشتہارات کو کھپانے کے لئے ایک نہایت مختصر پہنائی والے افسانے کو اقساط سے بانٹا گیا اور مختصر ڈرامے والا نقطہ معراج کہیں نظر نہ آیا۔

کبھی کبھار کارکنان پی ٹی وی کو خیال آتا ہے کہ ہم نے تو اردو فکشن کو ٹیلی وژن کی سکرین سے دفتر بے معنی سمجھ کر حرف مکرر کی طرح مٹا دیا ہے تو ''قاسمی کہانی'' کی تیرہ قسطیں فردوس

نظر بن جاتی ہیں۔اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے ڈرامے تو خیر لگتے ہی رہتے ہیں' کبھی کبھار انتظار حسین سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ مرحومین میں سے زیادہ تر اعتنا کے قابل سعادت حسن منٹو' غلام عباس اور ممتاز مفتی کو سمجھا جاتا ہے۔

کلاسیکل موسیقی کی طرح کلاسیکل ڈرامے سے پچھلی دونسلوں کی کوئی دلچسپی نہیں۔ جب راگ رنگ اور ادبی منظر نامہ پیش کیا جاتا ہے' اس وقت ساری دنیا گویئے اور ادبی پیش کار کے سوا گہری نیند کے مزے لے رہی ہوتی ہے۔اب شوخ رنگوں اور شوخ آوازوں کا دور ہے۔ پاپ موسیقی اور پاپ ڈرامے کے اس نقار خانے میں بیچارے ''طوطیوں'' کی آواز کون سنتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ نئی نسل کی موسیقی اور ادب سے یکسر محروم کر دیا جائے۔انہیں کچھ تو شریفانہ انداز کی ادبی ذوقی تربیت کا موقع ملنا چاہیئے۔

پچھلے پچیس تیس سالوں میں افسانہ نگارں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اکثر افسانوں میں نیا پن بھی ہے اور گلیمر بھی۔ رنگ بھی ہے' آہنگ بھی' پچھلی ایک دہائی میں ایسے بہت سے افسانے لکھے گئے ہیں جن میں تارکین وطن کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے اور مشرق و مغرب کا تصادم موجود ہے۔ ہمارے پی ٹی وی کو سیر و سیاحت کا بہت شوق ہے۔ ان افسانوں کے توسط سے وہ ناظرین کو امریکہ' انگلستان' جرمنی' سویڈن' ناروے اور ڈنمارک وغیرہ کی سیر بھی کرا سکتا ہے۔ پچھلی چوتھائی صدی میں مختصر افسانوں کے بہت سے مجموعے شائع ہوئے ہیں جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ادبی رسائل میں بیسیوں افسانے چھپتے ہیں جو چونکا دینے والے ہوتے ہیں اور ان میں وطن عزیز کی مٹی کی خوشبو ہوتی ہے۔ ہر رسالے سے اگر ایک ایک افسانہ بھی ڈرامائی تشکیل کے لئے چنا جائے تو ایک متنوع قسم کا سیریل تیار ہو سکتا ہے۔ان کی پروڈکشن پر زیادہ خرچ نہیں آئے گا اور کچھ اشتہارات بھی مل جائیں گے۔

پی ٹی وی کی سکرین پر اردو کے مختصر افسانے کی عکاسی اس لئے بھی ضروری ہے کہ نئی نسل کے دل میں ادبی رسالے اور کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ادب کی ترویج کا یہ بھی ایک طریقہ ہے اور نہایت موثر طریقہ ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے رسالے اور مجموعے پڑھ کر کون ہے جو مناسب افسانوں کی تلاش کرے۔ میرے ذہن میں اس کے دو حل ہیں۔

1 ......اردو کے نقادوں کا ایک پینل بنایا جائے جو مناسب افسانوں کا انتخاب کرے۔

ادب کے دو جائزہ نگار ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر وسیع المطالعہ نقاد ہیں۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اور پروفیسر رشید امجد شامل کئے جاسکتے ہیں۔ اصغر ندیم سید اردو ادب کے پروفیسر ہیں۔ ہم عصر افسانوی ادب پر ان کی نظر بھی گہری ہوگی۔

2...... افسانہ نگاروں سے کہا جائے کہ وہ اپنے ایسے پسندیدہ افسانوں کی نشاندہی کریں جن کی ڈرامائی تشکیل ہوسکتی ہو۔

کیا ''قاسمی کہانی'' کی طرز پر ان افسانہ نگاروں کے افسانوں پر مبنی سیریل نہیں بنائے جاسکتے جو گوشہ نشین ہیں اور دھانسو قسم کے آدمی نہیں مثلاً رحمان مذنب' اور ''آغا بابر'' کو کیوں نظر انداز کیا گیا ہے؟ کیا ان کے مجموعوں سے ایک ایک منی سیریل بھی تشکیل نہیں پاسکتا؟ حال ہی میں سیالکوٹ کے بزرگ افسانہ نگار آثم مرزا کے افسانوں کا مجموعہ ''پیاس کا سفر'' شائع ہوا ہے جس سے میں چھ' سات ایسے قومی' ملی اور اصلاحی افسانوں کی نشاندہی کرسکتا ہوں جو ایک منی سیریل کی تشکیل کرسکتے ہیں۔

گزشتہ نصف صدی میں پاکستان کے قومی و ملی اقدار اور ان کے عروج و زوال کی جو تصویر افسانوی ادب میں نظر آتی ہے' وہ ان دنوں لگنے والے سیریلوں سے قطعی طور پر منظر عام پر نہیں آتی۔ پتہ نہیں یہ سیریل کس ملک' کس کلچر اور کس طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں؟ پاکستان زیادہ تر جھونپڑیوں میں بستا ہے' محلوں میں نہیں' ہمارا افسانہ زیادہ تر جھونپڑی والوں کی نمائندگی کرتا ہے یا درمیانے طبقے کی اور یہی اصل پاکستان ہے!

19 فروری 2000ء

چاچا بوٹا اور حاجی مولا جٹ ایم پی اے

موٹر وے والے چاچا بوٹا کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے!

آج سے تقریباً تین سال پہلے چاچا بوٹا اور اس کے برادری کے چند سر کردہ چودھریوں نے فیصلہ کیا کہ اس بار ہم حاجی مولا جٹ کی جگہ بابو کرم دین سائیکل والے کو ووٹ دیں گے۔ ممبر بنے یا نہ بنے' اس کی قسمت۔ بیچارہ گیارہ سال سے گاؤں گاؤں سائیکل پر جاتا ہے اور ووٹ مانگتا ہے لیکن ضمانت ضبط کروا بیٹھتا ہے۔ اس بار کم از کم اس کی ضمانت تو ضبط نہیں ہونے دیں گے۔

مولا جٹ کبھی اس علاقے کا مربع' دو مربعے کا مالک ایک معمولی سا زمیندار تھا' ساتھ کے قصبے میں اس نے آڑھت کی دکان کھول لی' کسان دھان اس کے ہاں بیچتے' اڑھائی من کی بوری ٹھونس کر بھرتے لیکن مولا جٹ کے دھرم کنڈے پر دو سوا دو من سے زیادہ نہ نکلتی۔ کہتا'' رستے میں سوکھ گیا ہے'' پھر اس نے ایک شیلر لگوا لیا۔ دھڑا دھڑ دھان خریدتا' شیلر میں چھڑواتا اور باہر کے ملکوں کو بیچتا حالانکہ حکومت نے پابندی لگائی ہوئی تھی کہ کسان اپنا دھان خود نہیں چھڑوا سکتا۔ کاروبار اتنا بڑھا کہ وہ دنوں میں ''شاہو شاہ'' ہو گیا اور اس نے حج بھی کر لیا۔ پھر اس نے سیاست میں حصہ لینا بھی شروع کر دیا۔ گیارہ سال پہلے کے الیکشن میں مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں سے ٹکٹ مانگا لیکن نہ ملا' تو آزاد کھڑا ہو گیا۔ اپنے حلقے کے ایک ایک گاؤں میں پھرا۔ پچھلے پندرہ بیس سالوں سے گاؤں میں' جس جس کے گھر کوئی موت واقع ہو گئی تھی' وہاں فاتحہ پڑھنے گیا۔ الیکشن کے دوران حاجی مولا جٹ کی زبان میں بہت مٹھاس آ جاتی۔ اپنے ڈیرے اور آڑھت پر آنے والے کی بہت خاطر مدارت کرتا لیکن جونہی الیکشن جیت جاتا' اس کی زبان میں پہلے کھٹاس پیدا ہوتی' پھر تُمّے کی طرح کڑوی زہر ہو جاتی اور ڈیرے میں خاک اڑنے لگتی۔ وہ سیاسی پارٹیوں سے بہت منتیں کرواتا اور بہت سی مراعات مانگتا اور جس پارٹی کا پلہ بھاری دیکھتا' اس میں شامل ہو جاتا۔ وہ پیپلز پارٹی کا ایم پی اے بھی رہا اور مسلم لیگ کا بھی۔

پچھلے الیکشن میں جب وہ چاچا بوٹا کے گاؤں نور پور کلاں میں آیا' تو اس نے گاؤں کے دائرے میں بیٹھ کر بڑی میٹھی میٹھی باتیں کیں اور وعدہ کیا کہ نور پور کلاں اور نور پور خورد کو ملانے کے لئے وہ موٹر وے کے نیچے انڈر پاس تعمیر کروا دے گا اور جن جن کسانوں کے ذمے کوآپریٹو بنک کا کوئی قرضہ ہے' معاف کروا دے گا لیکن گاؤں والوں نے اس کی کسی بات پر یقین نہ کیا کیونکہ اس

سے پچھلے الیکشن میں جو وعدے اس نے کئے تھے' ان میں سے ایک بھی پورا نہ ہوا تھا۔ گاؤں کے تم ظریف مراثی نے مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا ''لوگو! حاجی مولا جٹ ممبر گاؤں میں آئے ہوئے ہیں' جس جس نے فاتحہ پڑھوانا ہو' وہ مولوی جی کو اپنا نام لکھوا دے'' لیکن کوئی بھی نام لکھوانے نہ آیا۔ حاجی مولا جٹ گھاگ آدمی تھا۔ وہ گاؤں کے بدلے ہوئے تیور' پہچان گیا تاہم لوگوں سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور موٹر پر بیٹھ کر چلا گیا۔ دو تین روز بعد ایک حوالدار اور دو سپاہی آئے اور چاچا بوٹا کے علاوہ پانچ سات اور باغیوں کو ہتھکڑی لگا کر تھانے میں لے گئے اور حوالات میں بٹھا دیا۔ تھانے دار نے کہا ''چڑیاں باز پر حملہ کریں تو ان کا یہی حشر ہوتا ہے'' چاچا بوٹا نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا '' تھانے دار جی! آخر ہم نے کون سا جرم کیا ہے؟ میں نے کوئی غیر قانونی کام کیا ہے''...... ''میرے پاس تم سب کے وارنٹ گرفتاری ہیں۔ تم زرعی بنک کے نادہندہ ہو''۔ چاچا بوٹا کو دلی اطمینان حاصل تھا کہ جب اس نے قرضہ لیا ہی نہیں' تو ڈر کس بات کا۔ جب بابو کرم دین سائیکل والا ان سے ملنے آیا تو اس نے بتایا کہ حاجی مولا جٹ نے تم سب کے نام سے قرضے لئے ہوں گے اور جعلی انگوٹھے لگوا لئے ہوں گے۔ چاچا بوٹا پھر بھی نہ ڈرا کیونکہ اسے اپنی بے گناہی پر پورا پورا یقین تھا۔ اسے ڈر صرف یہ تھا کہ کہیں لوگ مجھے چاچا بوٹا حوالا تیا کہنے لگیں۔ حوالات میں ان کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ ہوا۔ گھر میں جو دال روٹی ملتی تھی وہ یہاں بھی ملتی رہی۔ البتہ دال کو تڑکا نہ لگا ہوتا' تھانے کا ایک سپاہی سراج دین چاچا بوٹے کا دور پار کا رشتہ دار تھا' وہ اپنے گھر سے انہیں کھانے پینے کو کچھ لا دیتا۔

جب الیکشن میں حاجی مولا جٹ جیت گیا تو انہیں بھی رہائی مل گئی۔ گاؤں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ گاؤں کے سارے ووٹ حاجی کو ملے اور پاجی کرم دین کی ضمانت پھر ضبط ہو گئی۔

پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ چڑوں پر جھپٹنے والا باز جال میں پھنس گیا۔ پتہ نہیں اس نے کون کون سی فرضی فیکٹریاں لگوا کر بنکوں سے قرضہ لیا تھا کہ نادہند ہو کر اسے تھانے کی حوالات میں آ بیٹھنا پڑا۔ بابو کرم دین سائیکل والا گاؤں گاؤں جا کر بتا تا رہا کہ کیا یہ عبرت کا مقام نہیں کہ حاجی مولا جٹ ایم پی اے حوالات کی سلاخوں کے پیچھے ہے۔ جب چاچا بوٹے کو معلوم ہوا' تو اس کا جی چاہا کہ حوالات میں جا کر حاجی مولا جٹ کی مزاج پرسی کرے۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ اس خواہش کے پیچھے انتقام کا جذبہ ہے یا ہمدردی کا' یوں چاچا بوٹا انتقام کے جذبے سے آشنا ضرور تھا' لیکن آج تک اس نے کسی دشمن سے انتقام لیا بھی نہیں تھا۔ اس کے اپنی خواہش کو بہتیرا دبانا چاہا لیکن دبا نہ سکا۔ ایک دن مسجد سے صبح کی نماز پڑھ کر آیا تو گھر والی سے کہا ''ریشم بی بی اے! گھر

میں کتنے انڈے پڑے ہیں؟'' اس نے پوچھا کیا سارے انڈے ایک ہی بار کھا جانے کا خیال ہے۔ ''نہیں! میں حاجی مولا جٹ ممبر سے ملنے تھانے جارہا ہوں۔ اس کے اس کے لئے دیسی انڈے ابال کر اور آدھ کلو دیسی گھی لے جاؤں گا۔ بیچارے کو حوالات میں تڑکے والی دال بھی نہ ملتی ہوگی۔ مجھے حوالات والے دن یاد ہیں'' چاچی نے دیکھا تو دس انڈے موجود تھے۔ اس نے ابال دیئے۔ آدھ کلو گھی ایلومینیم کے ایک ڈبے میں ڈالا۔ اس کے ڈھکنے پر انڈوں کی پوٹلی رکھی۔ چاچے کے کہنے پر پوٹلی میں گری بادام والے گڑ کی کچھ ڈلیاں بھی رکھ دیں اور پسے ہوئے نمک کی ایک پڑیا بھی۔ اگرچہ تھانے کا اکثر عملہ بدل گیا تھا لیکن اس کا دور پار کا رشتہ دار گھامڑ سپاہی وہیں موجود تھا۔ چاچے نے اس سپاہی کی وساطت سے حوالات تک رسائی حاصل کی۔ سلاخوں میں سے کیا دیکھتا ہے کہ حوالات کے فرش پر گدے بچھے ہیں اور ان کے اوپر چٹی سفید چادر اور گاؤ تکیے لگے ہوئے ہیں اور سامنے پھل فروٹ اور مٹھائیوں کے تھال سجے ہوئے ہیں۔ حاجی مولا جٹ اور اس کے تین اور حواری تاش کھیل رہے ہیں اور پیچوان کی منہال اس کے منہ میں ہے اور دیسی تمباکو اور اس پر رکھے دیسی گڑ کی خوشبو مل کر حوالات کی سلاخوں سے باہر آرہی ہے۔ یہ ٹھاٹھ دیکھ کر چاچا بوٹا دم بخود رہ گیا۔ سپاہی نے کہا'' حاجی صاحب! نور پور کلاں کا چودھری محمد بوٹا آپ سے ملنے آیا ہے'' حاجی صاحب نے پتہ پھینک کر سلاخوں سے باہر دیکھا اور بڑی رعونت اور دبدبے سے پوچھا'' اوئے بوٹے! مجھ سے کچھ کام ہے؟''

''نہیں چودھری! بس تمہیں دیکھنے کے لئے آیا تھا'' چاچا بوٹے نے شرمندہ سا ہو کر کہا۔'' دیکھ لیا ہے تو جاؤ......'' اس نے پیچواں کی منہال منہ میں لے کر کہا اور پتہ پھینک دیا۔ چاچا بوٹا نے دل ہی دل میں کہا'' حاجی نے کوئی عبرت نہیں پکڑی۔ پر عبرت تو مجھے پکڑنی چاہیے۔ میں نادہندہ بھی نہیں تھا اور حوالات میں ذلت اٹھاتا رہا۔ یہ نادہند ہے اور حوالات میں بھی اسے عزت حاصل ہے۔ بڑا آدمی ہر جگہ بڑا ہوتا ہے۔ محل ہو یا حوالات۔ اس لمحے چاچا بوٹا ایک کسان سے فلسفی بن چکا تھا۔ اس نے انڈوں، گڑ کی ڈلیوں اور دیسی گھی کے ڈبے والی پوٹلی سپاہی کے ہاتھ میں تھما کر کہا'' سراج دینا! میں جھوٹ نہیں بولوں گا یہ سب کچھ میں حاجی کے لئے لایا تھا۔ اسے تُو قبول کرلے۔ تیرے بچے خوش ہو جائیں گے'' سراج دین سپاہی نے پوٹلی چاچے کے ہاتھ سے جھپٹ لی کہ کہیں اس کا ارادہ بدل نہ جائے اور وہ دیسی گھی کی خوشبو سے ایسا سرمست ہوا کہ چاچے کا شکریہ بھی ادا نہ کرسکا۔

یکم مارچ 2000ء

محمد منور! محمد منور!

عنوان ایک ادھورے مصرعے پر مبنی ہے جس کے خالق جسٹس رستم کیانی مرحوم تھے۔
مجھے مرزا منور کا ہم عصر، ہم عمر اور رفیق کار ہونے کا فخر حاصل ہے۔ پندرہ سال کی رفاقت کے بعد 1983ء کے اوائل میں ہم آگے پیچھے ریٹائر ہوئے تھے۔ پروفیسر جعفر بلوچ نے ہم دونوں کا مشترکہ قصیدہ پڑھا تھا۔ میں نے الوداعی تقریر میں کہا تھا ''میں تو ریٹائر ہو کر ایک لاکھ کا کیا، ایک ہزار کا بھی نہیں رہوں گا۔ البتہ مرزا منور یقیناً سوا لاکھ کے ہو جائیں گے۔'' مرزا منور ان دنوں ''اقبال چیئر'' پر فائز ہو چکے تھے۔

مرزا منور کے علمی و ادبی مرتبہ و مقام کے تعین کے لئے انشاءاللہ بہت کچھ لکھا جائے گا میں صرف اتنے ہی اکتفا کروں گا کہ وہ بہت بڑے غالب شناس بھی تھے اور اقبال شناس بھی۔ تاریخ اسلام پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ خاص طور سے ان تاریخی عوامل پر جو پاکستان کے قیام کا باعث بنے۔ انہیں اقبال اور قائداعظم سے بے پناہ عقیدت تھی۔ مسلم لیگ اور پاکستان کو لازم و ملزوم جانتے تھے۔ ان جیسا پختہ یقین پاکستانی اور مسلم لیگی کوئی کوئی ہوگا۔

1968ء جب ہم گورنمنٹ کالج میں اکٹھے ہوئے تو ملک بشیر، صابر لودھی، پروفیسر مشکور حسین یاد اور پروفیسر اصغر سلیم میر تھے۔ اصغر سلیم میر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ملک بشیر الرحمٰن بھی کب کے دنیائے فانی سے گزر چکے ہیں اور اب مرزا منور بھی داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ ملک بشیر الرحمٰن اور مرزا ہنوز دونوں بزم دوستان آباد رکھنے کا فن جانتے تھے۔ دونوں محفل آرا تھے۔ دونوں کا حلقہ احباب وسیع اور متنوع تھا۔ کچھ دوست دونوں کے مشترک تھے۔ مثلاً شیخ عبدالشکور مرحوم اور حفیظ جالندھری مرحوم۔ دونوں میں سے کوئی بھی آتا تو شعبہ اردو میں رونق لگ جاتی۔ شیخ عبدالشکور سال میں دو تین مرتبہ اپنے ساتھ پکوان بھی لاتے۔ ایک بہت بڑے دیگچے میں کبھی بریانی، کبھی سندھی پلاؤ، کبھی کوئی اور نعمت۔ ایک دو بار قیمے سے بھرے نان بھی لے کر آئے۔ اندرون لاہور رہتے تھے۔ قدیم لاہور کی تہذیب و ثقافت سے پورے پورے آگاہ، زندہ دل اور

خوش لباس، سیکرٹریٹ سے سیکشن آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ سوٹ پہنتے اور بڑے التزام سے ٹائی بھی لگاتے۔ داغ کی غزلیں نہایت سریلی آواز میں گا کر سناتے۔ مرزا منور اور ان میں اکثر لطیفوں اور بذلہ سنجیوں کا تبادلہ ہوتا اور بہت لطف آتا۔ انہیں اپنے خلیفے نامزد کرنے کا بہت شوق تھا۔ گورنمنٹ کالج میں ان کے خلیفہ اوّل ملک بشیر الرحمٰن تھے اور خلیفہ دوم مرزا منور۔ خلیفہ سوم اور چہارم کے متعلق ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا، البتہ سید مشکور حسین یاد کا نام کسی خلافت کے لئے زیرِ غور تھا۔ ملک بشیر الرحمٰن سے نوک جھونک ہوتی تو کہتے ''ملک! یاد رکھو، میں تجھے خلافت سے معزول بھی کر سکتا ہوں''۔ ملک صاحب جواب میں کہتے ''یا حضرت! آپ پردہ پوش ہوں تو مجھے خلافت ملے، معزولی تو بعد کی بات ہے۔'' شیخ مرحوم پردہ پوشی فرما گئے اور ملک بشیر الرحمٰن اور مرزا منور ان کے دو خلیفے بھی واصل بالحق ہو چکے ہیں۔ شکر ہے کہ مشکور حسین یاد کی نامزدگی کا فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔ شیخ عبدالشکور نہایت خوبصورت اردو لکھتے تھے۔ ان کی یادگار ان کی یادوں کا مجموعہ ''سبزہ بے گانہ'' ہے۔ اس کی تعارفی تقریب میں مرزا منور نے کہا تھا کہ اس کتاب سے زیادہ زندہ، متحرک، متنوع اور دلچسپ کتاب اردو ادب میں کم ہی لکھی گئی ہوگی۔ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ افسوس کہ شیخ مرحوم یادوں کا ایک خزانہ بلکہ زمانہ لے کر قبر میں پوش ہو گئے۔

حفیظ جالندھری مرحوم آتے تو مرزا منور انہیں اپنی کرسی پر بٹھا کر صدرِ محفل بنا دیتے۔ وہ اکثر اس خواہش کا اظہار کرتے کہ انہیں کسی کلاس میں اردو پڑھانے کا موقع دیا جائے۔ مرزا منور کہتے ''یا حضرت! اگر آپ ایک بار میری کلاس میں پڑھا آئے تو پھر لڑکے مجھے تو کمرے میں گھسنے نہیں دیں گے۔'' تاہم اردو اعلیٰ کی کلاس کے پانچ سات طالب علم جو سامنے کی کرسیوں پر بیٹھے ہوتے، ان کی طرف اشارہ کر کے کہتے ''حضرت! انہیں پڑھا کر اپنا شوق پورا کر لیجئے۔'' حفیظ جالندھری لڑکوں سے پوچھتے ''کیا تم نے شاہنامہ اسلام پڑھا ہے؟'' کوئی لڑکا بھی ہاں میں سر نہ ہلاتا تو وہ بجھ کر رہ جاتے۔ تاہم کہتے ''دیکھو میں ہوں حفیظ جالندھری شاہنامہ اسلام کا شاعر اور میں صرف ساتویں جماعت پاس ہوں۔''

مرزا منور نہایت شفیق، ہمدرد لیکن مستند استاد تھے۔ ایک بار وہ دھوپ میں کلاس لے رہے تھے کہ پرنسپل اشفاق علی خان کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جتنی بے کسی اور بے بسی کا منظر میں نے مرزا منور کی کلاس میں دیکھا ہے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا۔ میرا بیٹا نصیر عباس

نقوی ان کا شاگرد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مرزا صاحب مرحوم سخت گیر ضرور تھے لیکن مناسب مقام پر لطیفہ بھی کہتے اور کلاس کو بور نہ ہونے دیتے۔

مرزا منور پاکستان پر دل و جان سے فدا تھے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر ان کے رویے سے دلی دکھ اور رنج کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ اس کا ذمے دار ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو گردانتے تھے۔ وہ ایک نستعلیق اور شائستہ کلام آدمی تھے لیکن جب پیپلز پارٹی اور بھٹو مرحوم کا ذکر ہوتا تو بعض اوقات ان کے منہ سے کچھ اور لفظ بھی نکل جاتے۔ ایک بار ان کے ایک دیرینہ پرستار کہیں باہر سے انہیں ملنے آئے تھے۔ ان کی موجودگی میں انہوں نے بھٹو مرحوم پر تنقید کی تو وہ بے اختیار اپنے مرشد پر برس پڑے اور اٹھ کر چلے گئے۔ مرزا منور کہا کرتے تھے کہ ''شیڈیکا'' کا پرانا مریض ہوں۔ اس غم وغصہ کی شدت نے مجھے دمے کا مریض بھی بنا دیا ہے۔

مرزا منور کی تقریر نہایت دلپذیر ہوتی۔ یوم اقبال کے سلسلے کے ایک جلسہ میں میرے ساتھ ایک صاحب بیٹھے تھے، جو مقالے سن سن کر بور ہو رہے تھے۔ جب مرزا منور نے زبانی تقریر کی تو وہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے ''صرف یہی ایک مقرر ہے جس نے اقبال کو سمجھا ہے کیونکہ جس طریقے سے اس نے اقبال کو پیش کیا ہے وہ میری سمجھ میں بھی آ گیا ہے۔'' مرزا مرحوم علامہ اقبال کے حوالے سے اپنی قابلیت اور تبحر علمی کا اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ تفہیم اقبال پر زیادہ زور صرف کرتے۔

ان کی ذات میں نہایت کشش تھی۔ ان سے ملنے والے خواہ ان کے ہم عمر ہوں یا نوجوان، وہ ان کے پرستار تھے۔ اور انہیں اپنا مرشد جانتے تھے۔ مجھے سیکرٹری ایجوکیشن کے دفتر سے اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے پیشگی رقم نکلوانے کے لئے منظوری درکار تھی۔ جن سیکشن آفیسر کے پاس یہ کیس تھا وہ نجانے کیوں ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ کبھی کسی کالج میں مرزا منور کے رفیق کار بھی رہے ہیں۔ میں نے مرزا مرحوم سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ وہ کرشن نگر سے کالج آتے ہوئے انہیں ملے اور مجھے کہا کہ اب آپ جائیں گے تو آپ کو اپنا کیس تیار ملے گا۔ دو تین دنوں کے بعد سیکشن آفیسر صاحب سے ملا تو انہوں نے خشمگیں لہجے میں کہا ''آپ نے مرزا منور صاحب کو کیوں تکلیف دی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ میرے مرشد ہیں اور انہیں چل کر میرے پاس آنا پڑا۔'' میں نے بہت معذرت کی لیکن اس نے یہ نہ بتایا کہ میرا کیس کب

مکمل ہو گا۔ میں مایوس ہو کر اٹھ آیا۔ میں نے مرزا صاحب سے اس کا ذکر نہ کیا کہ انہیں پھر اپنے مرید کے پاس جانا پڑتا اور میرے کیس کی طوالت میں اضافہ ہو جاتا۔

مرزا منور فطرتاً درویش اور بے نیاز قسم کے آدمی تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ''اقبال چیئر'' پر بیٹھنے کو تیار نہ تھے۔ دراصل یہ چیئر جسٹس جاوید اقبال کے پاس تھی اور انہوں نے مرزا صاحب کو مجبور کیا تھا کہ وہ ریٹائرمنٹ سے کچھ عرصہ پہلے ڈیپوٹیشن پر یونیورسٹی میں آ جائیں۔ وہ مرشد زادے کے حکم کو ٹال نہ سکے۔ بعدازاں وہ ایک عرصے تک اقبال اکیڈمی کے چیئرمین بھی رہے اور انہیں اعزازات بھی ملے۔ انہیں جو کچھ بھی ملا وہ میرٹ کی بنیاد پر ملا۔ انہوں نے نہ ان کی خواہش کی نہ ان کے لئے ریشہ دوانی!

10 مارچ 2000ء

بیاسی سالہ شاگرد اور ستتر سالہ استاد

۳۱ جنوری کی بات ہے، کسی اسد اللہ بھٹی نے فون پر گھر کا پتہ پوچھا اور گیارہ بجے دو حضرات مجھ سے ملنے کے لئے غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان میں سے ایک نوجوان تھے اور ایک بزرگ، میری طرح دبلے پتلے لیکن کلین شیو۔ انہوں نے نہ صرف گرم جوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا بلکہ بڑی بے تکلفی سے معانقہ بھی، اس انداز سے کہ جیسے ان سے بہت جان پہچان ہو لیکن وہ میرے چہرے پر نظریں جمائے کسی پرانی یاد کو بازیاب کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ پوچھنے لگے ''کیا آپ نے مجھے پہچانا؟'' میں نے کہا'' چہرہ تو آشنا ہے لیکن نام یاد نہیں رہا'' اس پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بولے'' جب ملاقات ہی ساٹھ اکسٹھ برس کے بعد ہو رہی ہو، تو نام کیا یاد رہے گا اور پہچان کہاں سے آئے گی؟ میں انعام اللہ بھٹی ہوں، کچھ یاد آیا؟'' میں گومگو کے عالم میں تھا کہ خود ہی بولے'' میں پروفیسر ایم ڈی بھٹی مرحوم کا بیٹا انعام ہوں'' مجھے ایک کرنٹ سی لگی اور شاید انہیں بھی کہ ہم دونوں بیک وقت اٹھے اور بغل گیر ہوئے۔ اس بار معانقے میں اجنبیت کی کوئی رمق نہیں تھی'' یہ میرا داماد اسد بھٹی ہے جو پیس میں اکاؤنٹینٹ ہے اور ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہے۔ مجھے آپ سے ملانے کے لئے ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا ہے''۔

میں نے پوچھا'' آپ کو میرا ٹیلی فون نمبر کس سے ملا؟'' بولے کہ وحدت روڈ کالج کے ڈاکٹر جعفر بلوچ سے۔ میرے تجسس کی تسکین نہ ہوئی تو بولے'' آپ نے مرے کالج میگزین میں ایک مضمون لکھا تھا، اس میں والد محترم ایم ڈی بھٹی کے حالات بھی لکھے اور ان میں میرا ذکر بھی موجود ہے''۔ مرے کالج میگزین میں میں نے کوئی مضمون نہیں لکھا تھا۔ ذرا توقف کے بعد مجھے یاد آ گیا کہ کبھی میں نے ''اوراق'' میں اپنے اساتذہ کے ساتھ اپنے روابط لکھے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ مرے کالج میگزین میں وہ حصہ لے لیا گیا جس کا تعلق مرے کالج سے تھا۔ اب میں کچھ گھبرایا'' میں نے اس مضمون میں کچھ شاگردانہ قسم کی شوخیاں بھی کی تھیں۔ ممکن ہے کہ انعام اللہ بھٹی کو کوئی

شوخی ناگوار گزری ہو لیکن انہوں نے کہا ''میری ہمشیرہ لاہور میں رہتی ہیں' انہوں نے مجھے یہ رسالہ دکھایا اور جہاں جہاں آپ نے میری نالائقی کا ذکر کیا ہے' وہاں لکیریں لگا دی تھیں۔ میں نے رسالہ پڑھ کر کہا' نہیں بہن ! یہ تو میری تعریف ہے۔ میں تو ایسا ہی تھا جیسے انہوں نے لکھا ہے اور میں نے تہیہ کرلیا کہ آپ سے ضرور ملوں گا'' مجھے کافی سکون محسوس ہوا۔

اکسٹھ سال پہلے میں نے ۱۹۳۹ء میں میٹرک پاس کیا۔ میرے والد مرحوم پروفیسر ایم ڈی بھٹی صاحب سے شناسائی رکھتے تھے۔ مَرے کالج میں داخلے سے پہلے میرے والد صاحب مجھے ساتھ لے کر ان سے ملنے' ان کے گھر گئے۔ نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔ داخلے کے بعد میں ان سے کالج میں ملا تو مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے اور انعام سے میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا ''انعام ! یہ لڑکا آج سے تیرا ٹیوٹر بنے گا ؟' میں نے اسے نہایت حیران اور خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا کہ انعام کچھ ایسا لڑکا بھی نہیں تھا کہ میرا شاگرد بنتا۔ وہ اچھا خاصا ''آدمی'' لگتا تھا۔ اور ادھر میری مسّیں بھی اچھی طرح سے نہیں بھیگی تھیں۔ انعام میرا شاگرد کیا بنتا۔ البتہ ایک نہایت اچھا دوست ضرور بن گیا۔ مئی جون کے دو مہینوں میں میں کالج سے فارغ ہو کر تحصیل بازار میں واقع پروفیسر صاحب کے مکان میں اسے پڑھانے جاتا رہا۔ دوپہر کا کھانا ان کے ہاں سے کھاتا' پروفیسر صاحب قیلولہ کرتے تو ہم تاش کھیلتے۔ ذرا کھڑکا ہوتا تو تاش کی گڈی کتاب کے نیچے چھپا کر انعام کاپی اور پنسل میرے ہاتھ میں تھما دیتا اور میں کوئی سوال حل کرنے لگتا۔ کبھی کبھار پروفیسر صاحب کمرے میں آتے تو کہتے ''انعام ! اس لڑکے سے کچھ سیکھ لو۔ اگر اگلے سال میٹرک پاس کر لو تو کوئی قیامت تو نہیں آجائے گی''۔ انعام جواب دیتا ''پروفیسر صاحب ! آپ ایک میٹرک کہتے ہیں' میں دس میٹرکیں پاس کرلوں گا'' پروفیسر صاحب مسکراتے ہوئے واپس چلے جاتے تو انعام کہتا ''پورے خاندان کے مقدر میں جو علم لکھا ہے' اس پر تو خود قبضہ کرلیا ہے۔ اب بتاؤ ہمارے لئے کیا باقی رہ گیا ہے'' پروفیسر صاحب آپ بھی ہر سال کوئی نہ کوئی ایم اے کر لیتے تھے۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں ملیریا نے آدبوچا۔ بخار اترنے کے بعد ایسی کسل مندی طاری ہوئی کہ گاؤں کی گلیاں چھوڑ کر شہر یاترا کی ہمت نہ رہی۔ میں تادم تحریر پروفیسر صاحب مرحوم سے شرمندہ ہوں حالانکہ میرا دوست انعام مجھ سے ضرور خوش ہوگا کہ میں کاپی پنسل لے کر اس کے اور اس کے بڑے کاروبار میں حائل نہ ہوا۔ مجھے میرزا ریاض مرحوم نے بتایا تھا کہ انعام اللہ بھٹی سیالکوٹ شہر کے ایک بڑے کاروباری آدمی ہیں اور انعام اللہ بھٹی جو اس لمحے میرے سامنے بیٹھا

ہوا ہے کہہ رہا ہے کہ پروفیسر صاحب میں نے ۱۹۴۰ء میں میٹرک پاس کرلیا تھا۔میں نے خوش ہو کر کہا ''تو گویا میں نے جو دو تین قاعدے حساب الجبرے کے آپ کو سکھائے تھے اور دو چار جیومیٹری کے مسئلے آپ کو یاد کرائے تھے' وہ کام آہی گئے'' اس کے جواب میں وہ ہنس کر کہنے لگے ''پروفیسر صاحب! آپ نے جو کچھ لکھا' وہ ٹھیک ہے۔ مجھے اس کچھ شک نہیں لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں آرہا'' مجھ پر گویا گھڑوں پانی پڑ گیا۔وہ بولے ''اس زمانے کی کوئی تصویر آپ کے پاس ہے' تو دکھایئے'' میں نے بتایا کہ میرے پاس صرف ایک تصویر تھی' ٹیوٹوریل گروپ فوٹو کی' افسوس کے اسے دیمک کھا گئی ہے۔تب میں نے پوچھا ''انعام صاحب! آپ کی عمر کیا ہے؟'' کہنے لگے ''بیاسی سال''

''میری عمر ستتر سال ہے'' میں نے کہا ''گویا آپ مجھ سے پانچ سال بڑے ہیں'' تب میں نے ان کی توجہ مضمون کے اس فقرے کی طرف دلائی ''انعام کچھ ایسا لڑکا بھی نہیں تھا کہ میرا شاگرد بنتا۔وہ اچھا خاصا آدمی لگتا تھا'' اس پر ہم دونوں قہقہہ لگا کر ہنسے اور پھر سے بغل گیر ہوئے۔ بیاسی سالہ شاگرد اور ستتر سالہ استاد کا یہ مصافحہ وہ معانقہ ایسا ہی تھا جیسے بچھڑے ہوئے دو لمحوں کا جو گردش زمان و مکان سے الگ ہو کر پھر ایک دوسرے سے آملے ہوں۔

اگر میں پروفیسر ایم ڈی بھٹی صاحب پر دو چار جملے نہ لکھوں تو یہ کالم نامکمل رہے گا۔ تبحرِ علمی میں پروفیسر صاحب کا ثانی کم کم ہی ہوگا۔اس کے باوجود ان کی طبیعت تازہ گلاب کی مانند تھی کہ خود بھی سرسبز و شاداب ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی اپنی تازگی اور خوشبو سے مستفید کرتا ہے۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ان پر ختم تھی۔ ہمارے آپشنل اردو کے استاد جب کبھی رخصت پر ہوتے تو پروفیسر صاحب ان کا پیریڈ لینے آتے اور ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔علامہ اقبال کے بڑے شیدائی تھے اور میرا خیال ہے کہ ان کا بیشتر کلام انہیں زبانی یاد تھا۔ہم عصر اردو ادب سے انہیں پوری پوری آگاہی تھی۔حافظہ غضب کا تھا' جب بھی آتے کلاس کو ایک تازہ نظم یا غزل ضرور سناتے' اپنی نہیں کسی جدید اردو شاعر کی۔آزاد نظم کے ساتھ پہلا تعارف انہوں نے کرایا تھا۔آزاد نظم اس خوبصورتی سے پڑھتے کہ قافیئے ردیف کی کمی محسوس نہ ہوتی۔انعام اللہ بھٹی کی زبانی معلوم ہوا کہ انہوں نے ستانوے برس کی عمر میں وفات پائی تھی۔

17اپریل2000ء

چاچا بوٹا اور سی ٹی بی ٹی

میں کبھی کبھار افتاں وخیزاں چاچا بوٹا کے گاؤں چلا جاتا ہوں، وہی موٹروے سے پرلی سائیڈ والا گاؤں جسے نور پور کلاں کہتے ہیں۔ چاچا بوٹا مجھ سے مل کر بہت خوش ہوتا ہے اور اس کے پوتے پوتیاں بھی کہ میں ان کے لئے اپنی توفیق کے مطابق بسکٹ، ٹافیاں اور چاکلیٹ لے جاتا ہوں۔ چاچا بوٹا مجھے دیسی چوزے کا شوربا اور چاول کھلاتا ہے۔ صرف شوربا ہی نہیں چوزے کی ٹانگیں بھی اور ساری اچھی بوٹیاں بھی۔ اپنے لئے ''کھنبر ائیں'' رکھ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم تو کھاتے ہی رہتے ہیں حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ دیسی چوزے اور دیسی انڈے بیچ دیتا ہے جو میں ''کوٹھا پنڈ'' کی دکانوں سے خرید لیتا ہوں۔ ''میں'' سے مراد وہ شہری ہیں جو دیسی چوزا کھانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ الحمد للہ کہ جب سے مجھے حکیم نے کہا ہے کہ دمے کے مریض کے لئے دیسی چوزا اکسیر ہے، میں لذت کام ودہن کے لئے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔

جب سے چاچا بوٹا حوالات کی ہوا کھا آیا ہے، وہ کچھ کچھ سیاسی آدمی بن گیا ہے۔ سیاست بعض کی گھٹی میں رچی ہوتی ہے اور بعض اسے ایک دم خرید لیتے ہیں لیکن اکثر کو تھوڑا تھوڑا کر کے ملتی ہے۔ چنانچہ جب سے اخباروں میں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر یہ اعلان ہو رہا ہے کہ اب سیاست گاؤں اور محلے کی بنیاد سے شروع ہو رہی ہے، چاچا بوٹا کی سیاسی رگ پھڑکنے لگی ہے۔ یوں وہ گاؤں کا دانشور تو پہلے ہی سے ہے۔ ان دنوں ''سی ٹی بی ٹی'' کا بہت چرچا ہے ان چار حرفوں میں ایسا قافیہ وآہنگ ہے کہ ہر دیہاتی کی زبان پر چڑھ گئے ہیں لیکن ان کے معنوں پر کوئی کوئی غور کرتا ہے اور غور کرنے والوں میں سے ایک چاچا بوٹا بھی ہے۔ کوئی اس سے پوچھتا ہے کہ چاچا! ''سی ٹی بی ٹی'' کیا ہے؟ تو وہ مزید غور میں مصروف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس بار میں اس کے گاؤں گیا تو بہت خوش ہوا۔ لسی چائے کا پوچھنے سے پہلے بے اختیار بول اٹھا ''لو جی! مسئلہ حل ہو گیا'' مجھ سے کہنے لگا ''جناب! سی ٹی کے معنی تو مجھے معلوم ہیں، بتایئے بی ٹی کا کیا مطلب ہے؟'' میں جواب میں پوچھتا ہوں کہ سی ٹی کا کیا مطلب ہے۔ وہ میری طرف حیران ہو کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے ''سی

ٹی کے معنی آپ کو نہیں آتے ؟ واہ جی واہ! وہی سیٹی جو بچے بجاتے ہیں۔ میرا ایک پوتا سیٹی بجاتا ہے اور دوسرے بچے ناچتے ہیں۔ ویسا ہی ناچ جیسا ٹیلی ویژن پر لڑکے بالے اور لڑکیاں بالیاں کرتی ہیں'' میں نے کچھ دیر سوچ کر کہا'' تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ سیٹی امریکہ کے صدر کلنٹن کے ہاتھ لگ گئی ہے' وہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا اس پر پاپ ڈانس کرے' وہی ڈانس جو لڑکے بالے اور لڑکیاں بالیاں ٹیلی ویژن پر کرتی ہیں''۔ جناب کتنا گورا چٹا صدر ہے' لیکن نام کلٹن ہے۔ کالا کلٹن '' میں کھلکھلا کر نہیں ہنستا کہ ستتر سال کی عمر میں پیٹ کے پٹھے چڑھ جاتے ہیں۔ میں نے ایک مدبرانہ قسم کی مسکراہٹ پر اکتفا کرتے ہوئے کہا'' بھائی! کلٹن نہیں کلنٹن اور کیا پتہ اندر سے کلٹن ہی ہو۔ کالا کلٹن''

'' پر صاحب جی! بات تو سی ٹی بی ٹی کی ہو رہی تھی'' چاچا بوٹا بولا۔ میں نے کہا'' بلاشبہ تم سارے گاؤں کے چاچا ہو لیکن میرے عزیز ہو' اس لئے تم سے پردہ کیا؟ میں ایم اے بی ٹی ہوں لیکن بی ٹی کے معنی مجھے بھی نہیں آتے۔ اتنا معلوم ہے کہ سی ٹی کے بعد بی ٹی کرنی ہوتی ہے تاکہ اوپر کا گریڈ مل سکے...... فی الحال سی ٹی بی ٹی کا مطلب وہی صحیح ہے جو تم کرتے ہو'' چاچا بوٹے نے بوجھ بجھکو قسم کی دانشوری کا اظہار کرتے ہوئے سر ہلایا اور پوچھا'' تو صاحب جی! ہم پہلے سی ٹی کریں گے پھر بی ٹی'''' اس مسئلے پر اخبارات میں جو بیانات چھپتے ہیں اور الیکٹرانک میڈیا پر جو سیمینار ہوتے ہیں' وہ بہت '' کانٹرا ڈکٹنگ اور کان فلکنگ'' ہیں۔ سفید مونچھوں والے اور کلین شیون ریٹائرڈ بیورو کریٹوں' ریٹائرڈ جرنیلوں اور ریٹائرڈ ڈپلومیٹوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دیئے گئے تو سمجھئے کہ پاکستان ہاتھوں سے گیا۔ یہ نہیں بتاتا کہ اس کے بعد ہاتھ میں کیا رہ جائے گا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ دستخط نہ کئے گئے تو صدر کلنٹن ناراض ہو جائے گا۔ ہمیں قرضے نہیں ملیں گے اور وہ ہندوستان کو اس خطے کا پولیس مین بنا دے گا۔ دونوں گروہ ایک ہی بات کرتے ہیں۔ میں بہت کنفیوژڈ ہو چکا ہوں' تمہارا کیا حال ہے؟'''' میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں'' چاچا بوٹے نے کہا اور بیگم کو آواز دے کر کہا کہ صاحب جی کے لئے چائے بنا کر لائے۔ چائے کے دو چار گھونٹ پی کر میں نے کہا'' حکومت اس مسئلے پر ریفرنڈم کرانا چاہتی ہے۔ ہاں یا ناں میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' چاچا بوٹا جو اس سے پہلے میری انگریزدانی سے قطعاً مرعوب نہیں ہوا تھا بلکہ اسے لسّی کے کٹورے کی طرح پی گیا تھا' تھوڑا سا سٹپٹایا لیکن اس کے اندر کا سیاسی بزرجمہر یکایک جاگ اٹھا'' خیال کیا ہے؟ وہی خیال ہے جو سب کا خیال ہے۔ آپ کا بھی' میرا بھی۔ آپ

کا کیا خیال ہے؟'' چاچا بوٹے نے گیند پھر میری کورٹ میں پھینک دیا...... عزیزم! حکومت زودیا بدیر اس کے متعلق پوچھے گی؟ پھر میں اپنے خیال کا اظہار کروں گا'' چاچا بوٹے نے کہا'' تب میں آپ سے پوچھنے آؤں گا۔ صاحب جی! وہ لفظ تو مجھے یاد کرادیجئے جو آپ نے بولا تھا تاکہ میں گاؤں والوں کو اس کے لئے تیار کرسکوں۔''

مجھے محسوس ہوا کہ چاچا بوٹے کو یہ لفظ یاد کرانے بہت ضروری ہیں تاکہ وہ سیاست کی سیڑھی کے پہلے ڈنڈے پر قدم رکھ سکے۔ سو میں نے کہا'' ریفرنڈم کے معنی استصواب اور استصواب کے معنی ہیں۔ پوچھنا''میں فطرتاً اور عملاً مہارنی کرانے والا قدیم طرز کا استاد ہوں۔ مہارنی کرارہا تھا کہ چاچا بوٹے کے پوتے اردگرد آ کھڑے ہوئے اور ہنسنے لگے۔ چاچا بوٹے نے بار بار غلطی کی تو ایک شوخ وشنگ پوتے نے میری چھڑی میرے ہاتھ میں تھما کر کہا'' منشی جی! جب تک دو تین ڈنڈے نہ ماریں گے' بابے کو یہ لفظ یاد نہیں ہوں گے۔ ہمارے منشی جی تو ایسا ہی کرتے ہیں''پوتے کی زبان پر ڈنڈے کا لفظ آیا تو ایک معجزہ رونما ہوا۔ یعنی چاچا بوٹے کی زبان پر ریفرنڈم اور استصواب کے الفاظ رواں ہو گئے۔ اب مجھے معلوم ہے اور خوشی بھی کہ وہ گاؤں والوں پر اپنی دانشوری کی دھاک بٹھادے گا لیکن جب ریفرنڈم کا اعلان ہو گیا تو میں ابھی سے خائف ہوں کہ میں اسے ہاں یا نہ میں سے کونسا جواب دوں گا۔ میں اب بھی کنفیوژڈ ہوں اور جب ریفرنڈم ہوگا تو اس وقت بھی کنفیوژڈ ہی ہوں گا۔ فی الحال تو میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ صدر کلنٹن پاکستان اور ہندوستان سے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کروا کے تاریخ عالم میں اپنا نام لکھوانا چاہتے ہیں اور جموں کشمیر کا مسئلہ جوں کا توں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اگلے صدر امریکہ کے لئے بھی تاریخ میں نام لکھوانے کے لئے کچھ بچ جائے۔

25مارچ2000ء

ایک سپر مین کی آمد

25 جنوری 2000 کا دن پاکستان کی تاریخ میں یادگار قرار پائے گا کہ اس دن ایک سپر مین کا ورود مسعود ہوا۔

اس کی آمد کا اعلان کرنے کے لئے کوئی ''زوراسترا'' پہاڑ سے نہ اترا!
میرا خیال تھا کہ وہ کسی خلائی جہاز سے اترے گا اور اس وقت قیامت کا سماں ہوگا۔ کوئی زلزلہ نہ آیا' نہ معمول کا نظام زندگی تہہ و بالا ہوا۔ اسے اکیس یا اکتیس توپوں کی سلامی بھی نہ دی گئی' نہ اسے ان سڑکوں پر سے گزارا گیا جہاں چھوٹے چھوٹے سپر مینوں کے استقبال کے لئے تشنہ لب تمتمائے ہوئے چہروں والے بچے' رنگ برنگ کی جھنڈیاں ہاتھ میں لئے دو رویہ کھڑے ہوتے ہیں۔ کہیں نیلے پیلے سرخ لباس میں ملبوس لوک ڈانس کرنے والوں کا کوئی گروہ نظر نہ آیا۔ کہیں ڈھول کی تھاپ سنائی نہ دی گئی۔ کہیں کوئی عارف لوہار چمٹا ہاتھ میں لئے سپر مین کی جگنی گاتا ہوا دکھائی نہ دیا۔ حد تو یہ ہے کہ کوئی گھوڑا ناچا' نہ کوئی اونٹ۔

مجھے اس کی زیارت کا بہت شوق تھا اور وہ بھی اپنی سرزمین پر۔ جب میں نے ساڑھ بارہ بجے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے ٹیلی ویژن کا بٹن دبایا' تو چک لالہ کے ہوائی اڈے پر ویرانی کا سماں تھا۔ اتنا اداس' اتنا اجاڑ اور اتنا سنسان سماں کہ اگر کسی ''زوراسترا'' کی آواز گونجتی تو دیر تک پوری فضا لرزہ براندام رہتی۔ پھر ایک چھوٹا سا بے حیثیت سا ہوائی جہاز رن وے پر اترا۔ دیر تک وہ ٹیکسی کرتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا پہیہ پھونک پھونک کر قدم رکھا ہوا اور ہر انچ کے فاصلے پر اسے زمین میں چھپا ہوا کوئی خطرہ نظر آ رہا ہو۔ کہتے ہیں کہ اس کے اوپر فضاؤں یا خلاؤں میں ایک سیارچہ گردش کر رہا تھا جو زمین کے اندر چھپی ہر ''تقدیر'' سے اسے مامون و محفوظ بنا رہا تھا اور میرے ملک کے میراج طیارے اس کے اوپر نیچے اور دائیں بائیں اڑ رہے تھے کہ حفاظت میں کوئی رخنہ باقی نہ رہے۔ دور افغانستان کے پہاڑوں کی کسی کھوہ میں اسامہ بن محمد لادن کو پابہ زنجیر کر دیا گیا۔

ایک جگہ کو گویا محفوظ پا کر پہیا ساکن ہو گیا' ایک سیڑھی زمین پر آ ٹکی اور دو تین پر اسرار سے زیرو زیرو سیون ٹائپ آدمی نیچے اترے۔ تب کیمرے نے کچھ دور فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ہجوم دکھایا۔ یہ پر اسرار مخلوق ان تک پہنچی اور یہ معلوم نہ ہوا کہ وہاں کیا کرتی رہی۔ چند منٹوں کے بعد واپس ہوئی جہاز تک آئی اور اس میں گم ہو گئی۔ تب جہاز پھر ٹیکسی کرنے لگا' ہجوم کے پاس آ کر رک گیا اور اس کی سیڑھی پھر زمین پر آ ٹکی۔ سپر مین نے دو چار سیڑھیاں اتر کر زمین پر قدم رکھا تو ہجوم نے دو بچوں کو آگے بڑھایا۔ ننھے کے سر پر خضر حیاتی طرے دار کلاہ تھی اور وہ دلہا کا سوانگ بھرے ہوئے تھا۔ ننھی کو ایسا لباس پہنایا گیا تھا کہ وہ دلہن لگتی تھی۔ گڑیا سی دلہن' سپر مین نے گڑیا کا گال پیار سے تھپتھپائے اور پاکستان کے علامتی جاگیر دار ننھے سے گلدستہ وصول کیا۔

یا اللہ! یہ طرے دار کلاہ' جو خوشامد اور غلامی کی یادگار ہے' کب ہمارے معاشرے سے رخصت ہو گئی؟

آمدم برسر مطلب! سپر مین نے کچھ لوگوں سے ہاتھ ملائے اور لموزین میں بیٹھ گیا۔ یہ کار بلٹ پروف ہے۔ ممکن ہے کہ اس پر راکٹ اور میزائل بھی اثر نہ کرتے ہوں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ سپر مین اپنی ذات میں بلٹ' راکٹ اور میزائل پروف ہوتا۔ کہتے ہیں کہ یہ سپر مین دنیا کی جس واحد سپر پاور کا سربراہ ہے۔ اس نے فضا میں ایسے سیارے محو پرواز کر رکھے ہیں جو زمین کے چپے چپے کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر لیتے ہیں' وہ پاتال کی خبر لاتے ہیں اور چونا گچ گنبدوں کے اندر کی تصویر بھی لے لیتے ہیں اور سرگوشیوں کو بھی فیتے میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ گویا کسی گھر کی کوئی چار دیواری ان کی دستبرد سے محفوظ نہیں۔ نجانے اسامہ بن محمد بن لادن اس سے بھی بڑا سپر مین ہے کہ تا حال ان سیارچوں کی زد میں نہیں آیا۔

بعد ازاں خبروں میں جو منظر دکھائے گئے' ان میں بھی کوئی گہما گہمی نظر نہ آئی۔ سابق وزیر اعظم بے اختیار یاد آئے کہ ان کے دور میں سپر مین کی آمد نہ ہوئی۔ ورنہ جشن کا سا سماں ہوتا اور پاکستان کو نجانے کیا کچھ ملتا۔ اب تو صرف دھمکیاں ملی ہیں۔ سپر مین نے پاکستان کو صرف پانچ چھ ساعتوں کے قیام کا مستحق جانا۔ یہ بھی اس کی کمال مہربانی ہے کہ اس نے ٹیلی ویژن پر عوام سے مخاطب ہونا پسند فرمایا۔ اس کی تقریر اس کے چہرے کی طرح بڑی دلپذیر اور دلفریب تھی۔ اس میں شہد کی مٹھاس تھی گویا اس کی کڑواہٹ کو شکر میں لپیٹ دیا گیا تھا۔ وہ ہم سے ''السلام علیکم'' کہہ کر

مخاطب ہوا اور تقریر کے انجام پر اس نے پاکستان زندہ باد بھی کہا۔اس نے اقبال اور قائد اعظم کا تذکرہ کیا اس نے کہا ''پاکستان اگر قائد اعظم کے خوابوں اور ادراک کے مطابق ہو گا تو امریکہ پاکستان کے ساتھ چلے گا''

کتنی گہری حکمت ہے اس نصیحت میں!

کیا قائد اعظم کا خواب یہ تھا کہ پاکستان جس ملک سے الگ ہوا' پھر اسی کے استبداد کے سائے تلے آ جائے؟ کیا قائد اعظم جموں کشمیر کی غلامی پر رضا مند ہو گئے تھے؟ کیا جموں کشمیر ہے' ہم قائد اعظم کے فرمان پر عمل کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

یہ سپر مین چاہتا ہے کہ ہم اپنا ماضی بھول جائیں۔ ہر سپر مین یہی چاہتا ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی قوم زندہ نہ رہے جو اپنے ماضی سے وابستہ ہو اور جسے اپنی خودی کا اثبات واستعداد اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو۔ ہر سپر مین ایک ورلڈ آرڈر کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کرہ ارض کا مرکز ومحور بنانا چاہتا ہے۔ وہ قوموں کو ایک ایسی جنت کی نوید دیتا ہے جہاں وہ دودھ اور شہد کی نہریں بہا دینا چاہتا ہے۔اس کے بدلے میں وہ ان کی آزادی کی قربانی مانگتا ہے۔اس سپر مین نے پاکستان کو دھمکی دی ہے کہ اگر وہ اس کے نیو ورلڈ آرڈر کا ایک حقیر سا حصہ نہ بنا تو وہ دنیا میں تنہا رہ جائے گا۔ ہمیں اس دھمکی کو ہوا میں نہیں اڑا دینا چاہیے۔ میں تو کہوں گا کہ ملک کے سیاستدانوں' دانشوروں' علماء اور مشائخ کامل بیٹھ کر اس کے مضمرات پر غور وفکر کرنا اور آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنا لازمی ہے۔ عوام کو اعتماد میں لینے کی ضرورت بھی ہے اور سپر مین کو یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ آسمانوں میں بھی ایک طاقت ہے جس کا اپنا ورلڈ آرڈ ہے اور کوئی سپر مین اسے تبدیل نہیں کر سکتا!

6 اپریل 2000ء

علی بابا اور چالیس چور

ایک عرصہ پہلے کی بات ہے' میرے ایک نوجوان رفیق کار جب شادی کروا کر لوٹے' تو میں نے پوچھا ''عزیزم! کیا آپ کی برات بھی چڑھی؟''

''بڑی دھوم دھام سے' انہوں نے جواب دیا ''میں گھوڑی پر بیٹھا ہوا تھا اور براتی میرے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے علی بابا اور چالیس چور جا رہے ہوں''

اچھا لطیفہ تھا۔ میں نے قہقہہ لگا کر داد دی۔ یوں مجھے محسوس ہوا کہ ''علی بابا اور چالیس چور'' کا یہ انطباق کہانی کے حوالے سے صرف لطیفے کی حد تک ہی موزوں تھا۔ اس میں کچھ عنوان کا بھی قصور ہے۔ بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ علی بابا چالیس چوروں کا سردار تھا۔ کہانی میں تو علی بابا کبھی گھوڑے پر سوار نظر نہیں آتا۔ اس کے پاس صرف دو گدھے تھے' جن پر وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتا تھا اور خود پیدل ساتھ چلتا تھا۔ ممکن ہے کہ جب وہ جنگل کی طرف جا رہا ہوتا ہو گا تو گدھے کی سواری بھی کر لیتا ہو گا۔ کہانی میں ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں۔ کہانیاں اتنی باریک بینی سے کون پڑھتا ہے؟

علی بابا بھی الہ دین کی طرح ایک خوش قسمت بندہ تھا۔ یہ صرف اتفاق تھا کہ اسے طلسماتی غار کا راز معلوم ہو گیا۔ ایک سنہری اتفاق جو کبھی کبھی رونما ہوتا ہے جیسا کہ آج کے زمانے میں کسی بانڈ پر اول انعام نکل آنا' یا کسی بینک اکاؤنٹ پر کار کا مالک بن جانا یا لاٹری نکل آنا۔ ایسے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ کسی علی بابا کسی الہ دین ہی سے ہوتے ہیں۔ اکثریت تو مقدر کا سکندر ہوتی ہے۔ میں بھی اکثریت ہی میں شامل ہوں۔

''علی بابا اور چالیس چور'' کی کہانی میں کئی ایسے مقامات ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتے۔ پہلا قدم تو یہ ہے کہ چالیس چوروں کو جنگل میں چھپا ہوا یہ غار کیسے مل گیا؟ چلیئے مان لیا کہ اتفاق سے مل گیا ہو گا لیکن اس کے دہانے پر طلسماتی دروازہ کس نے لگایا؟ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ لگا لگایا ملا ہو لیکن دروازے کا کوڈ نمبر یعنی ''کھل جا سم سم'' انہیں کس نے دیا؟ کیا اس زمانے کی ساحری

آج کی سائنس سے بھی زیادہ کرشماتی تھی۔ آج کے غاروں کے دہانوں پر جو محافظ ہوتا ہے' اسے کوڈ نمبر دکھائیں یا سنائیں تو دروازے کھلتے ہیں۔ بعض آٹو میٹک بھی ہوتے ہیں کہ کوڈ نمبر دکھانے سے خود بخود کھل جاتے ہیں لیکن ''کھل جا سم سم'' کہنے سے کوئی دروازہ نہیں کھلتا۔ ''الف لیلیٰ'' کے زمانے کا ساحر آواز کی لہروں سے دروازہ کھول لیتا تھا!

دوسرا نکتہ جو میری سمجھ میں نہیں آتا' وہ یہ ہے کہ چالیس چور اپنی لوٹ مار کا پورا سامان اس غار میں بند کیوں کر دیتے تھے اور اسے استعمال میں کیوں نہیں لاتے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ پوٹڑوں کے رئیس ہوں اور بغداد شہر میں ان کی محل ماڑیاں ہوں اور غار کا خزانہ صرف ہوس زر کی تسکین کا باعث ہو۔ زر و جواہر کے ڈھیر اور سرخ دیناروں کے انبار انہیں وہی کیف مہیا کرتے ہیں جو رنگ رنگ کے پھول' ایک مفلس اور قلاش شاعر کو عطا کرتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ چور اور ڈاکو حس شاعری سے بھی محروم ہوں۔

آج کل ایک طبقہ اپنے زیوارت' نوادرات' بانڈ اور سرٹیفکیٹ بنک کے لاکروں میں محفوظ کرا دیتا ہے۔ وہ کبھی کبھار بینک میں جاتے ہیں' لاکر کھلواتے ہیں اور پھر زر و جواہر سونے چاندی اور نوادرات کی زیارت سے آنکھیں سینکتے ہیں اور سرشار ہو کر لوٹ آتے ہیں۔ شادی بیاہ یا منگنی سالگرہ کی تقریبات میں ان کی خواتین رولڈ گولڈ کے لشکاروں اور نقلی موتیوں کے ہاروں کی ''جھنکاروں'' پر گزارا کر لیتی ہیں۔ سال ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے' ایک لڑکی اصلی ہیروں کا ہار پہن کر ایک تقریب میں شامل ہوئی اور کئی کیمروں میں اس کی تصویر محفوظ ہو گئی۔ پھر یہی تصویر اس کے والد گرامی کی کرپشن کے ثبوت میں پیش ہوئی۔ یہ ہیرے کسی لاکر کے غار میں محفوظ رہتے تو وہاں تو کوئی ''علی بابا'' نہ پہنچ سکتا۔ ''علی بابا'' سے یہاں مراد وہ کھوجی ہے جسے انگریزی میں ''ڈی ٹیکٹو'' کہتے ہیں۔

''الف لیلیٰ'' کی اس کہانی میں ''علی بابا'' ایک بڑے آدمی کے روپ میں پیش ہوا ہے کہ جب اس کے دلدر دور ہوئے تو اس نے اور زیادہ کی ہوس سے احتراز کیا اور جو کچھ ملا' اسے صرف کیا' ورنہ بغداد کے کسی بینک کے لاکر میں ڈال سکتا تھا۔ تاہم اس کی عظمت میں کچھ کمی ضرور رہ گئی۔ اسے چاہئے تھا کہ لوٹا ہوا مال ان کے اصل مالکوں تک امانت سمجھ کر پہنچاتا اور ان سے کچھ کمیشن لے لیتا لیکن اسے اتنی مصیبت میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر وہ حکومت کے خزانے میں جمع کروا دیتا تو اسے چور سمجھ کر الٹا جیل میں ڈال دیا جاتا یا بادشاہ وقت اور اس کے وزیر مشیر

اسے مال مفت سمجھ کر بے دریغ اڑاتے اور علی بابا کو تمغائے دیانت داری پر ٹرخا دیا جاتا اور پھر لکڑیاں کاٹنے اور ڈھونڈھنے پر لگا دیا جاتا۔ کیا آج تک کسی تھانے کے طلسماتی مال خانے سے کسی سادھ کو اپنا لٹا ہوا مال واپس ملا ہے؟

کہتے ہیں کہ علی بابا والے کئی طلسماتی غار آج بھی یورپ کے ایک چھوٹے سے ملک میں موجود ہیں جن کی وجہ سے اس ملک کو ہر قسم کی جنگ وجدل سے محفوظ و مامون قرار دیا گیا ہے۔ دنیا کی ساری امن کانفرنسیں اسی ملک میں منعقد ہوتی ہیں اور اس ملک کی ساری خوبصورتی کا راز بھی ان غاروں میں پوشیدہ ہے۔ یہاں برف میں بھی پھول کھلتے ہیں۔ ان غاروں تک پہنچنے کے لئے کوڈ نمبر درکار ہیں۔ معاملہ وہی ''کھل جا سم سم'' والا ہے لیکن یہاں کوئی علی بابا آج تک اتفاق سے بھی نہیں پہنچا۔ پچھلی حکومت کے دوران ایک سینٹر دعویٰ کرتے تھے کہ ایک دو غاروں کے دہانوں تک پہنچ گئے تھے لیکن حیف کہ انہیں نہ کوئی کوڈ نمبر ملا' کوئی برآمدگی کرا سکے۔

میں نے ایک انگریزی افسانے میں پڑھا تھا کہ لاطینی امریکہ کے ایک ملک کا ایک حکمران اپنے سے پہلے حکمران کی دولت کا سراغ لگانے کے لئے اس غار تک جا پہنچا تھا جہاں اس نے لوٹا ہوا مال محفوظ کروایا ہوا تھا۔ خزانے کے محافظ کو اس نے بہت دھمکیاں دیں لیکن اس نے اسے کوڈ نمبر نہ دیا۔ آخر اس نے پستول کی نالی اس کی کنپٹی پر رکھ کر کہا ''بتاتے ہو یا ٹرگر دبا دوں'' اس پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو اس نے اپنا اٹیچی کیس اس کے سپرد کر کے کہا ''سر! میں تو آپ کا امتحان لے رہا تھا' مجھے بھی کسی غار کا کوڈ نمبر الاٹ فرما دیجئے''

تو گویا آج کل کے علی بابا دھونس دھاندلی سے اگر کسی کا لاکر نہیں کھلوا سکتے تو اپنا لاکر کھلوا لیتے ہیں۔ اپنے سابق معزز سینٹر کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا کہ آیا انہوں نے لاکر نہ کھلنے پر اپنا لاکر کر کھلوایا یا نہیں!

13 اپریل 2000ء

اجتماعی خوف اور دعا

''ینگ'' وہ نفسیات دان ہے جس نے اجتماعی نفسیات کا نظریہ پیش کیا۔ میں نے ''ینگ'' کو بہت کم پڑھا ہے اور زیادہ تر ینگ شناسوں سے سنا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ایک ینگ شناس ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''دستک اس دروازے پر'' میں ایک جگہ لکھا ہے ''......اجتماعی دعا کو لو' ایک فرد کی دعا میں بھی اثر ہو سکتا ہے مگر چند لوگ مل کر دعا کریں تو اس کی قوت میں سو فیصد اضافہ ہو جاتا ہے''

اس کی مثال انہوں نے آسٹریلیا میں کھیلی جانے والی ''کرکٹ چیمپئن ٹرافی'' کی دی کہ پاکستان کی ٹیم جو سب ٹیموں سے کمزور تھی' نہ صرف ایک چانس کی وجہ سے فائنل میں پہنچی بلکہ ''دنیا کی مضبوط ترین ٹیم کو ایک ہی دھکے میں گرا دیا......اصل کمال پاکستانی ٹیم کی نہیں بلکہ پاکستانی قوم کی اس دعا کا تھا جس نے اپنی بے پناہ طاقت سے چیمپئن ٹرافی کا رخ ہی تبدیل کر دیا''

یہی کیفیت میں نے 6 اپریل 2000ء سے پہلے کی چھ سات دنوں میں محسوس کی!

میں محسوس کر رہا ہوں کہ 6 اپریل کو ایک بہت بڑے مقدمے کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ فیصلہ بھی ویسا ہی فیصلہ ہو جو ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے کیس میں ہوا کہ پوری قوم ہل گئی اور ابھی تک ہم اس کے اثرات سے آزاد نہیں ہوئے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ پوری قوم میرے ساتھ اس خوف میں شریک ہے۔ بڑی عجیب کیفیت تھی۔ پراسرار سی' گریزپا اور گرفت میں نہ آنے والی۔ اصل میں یہ ایک اجتماعی خوف تھا اور اس خوف سے نجات کے لئے جو دل ہی دل میں دعا مانگی جا رہی تھی وہ میرے دل میں بھی تھی اور ہر اس آدمی کے دل میں جو ریڈیو سے کان لگائے بیٹھا تھا یا ٹیلیویژن سیٹ سے چمٹا ہوا تھا۔ ایک تندوری ہوٹل پر جو مزدور کھانا کھانے آئے تھے' وہ دھندلی سی سکرین والے ایک ٹیلیویژن سیٹ پر نظریں جمائے بیٹھے تھے' جو شیڈ کے ایک کونے میں اونچی جگہ پر رکھا ہوا تھا۔ جب یہ اعلان ہوا کہ میاں محمد نواز شریف کو عمر قید کی سزا ہوئی ہے تو قوم کے دل نے جو سکون کی اجتماعی آہ بھری' میں نے اسے اپنے کمرے میں ٹیلیویژن کے

سامنے بیٹھ کر سنا کیونکہ میرے ہی دل سے نکلی تھی۔

لیکن اگر میاں صاحب کا بھی وہی حشر ہوتا جو ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا ہوا تو پھر بھی کوئی ہنگامہ بپا نہ ہوتا' نہ آسمان روتا نہ زمین' کوئی سڑک پر نہ نکلتا' کوئی خودسوزی نہ کرتا' ممکن ہے کہ کہیں کوئی ٹائر جلا کر فضائی آلودگی کا باعث بن جاتا کچھ لوگ ٹولیاں بنا کر اذانیں دیتے۔ اجتماعی نفسیات میاں صاحب کو اس سے زیادہ اور کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہ ہوتی لیکن کوئی عام آدمی خوش بھی نہ ہوتا۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی سزا پر بھی کچھ نفسیاتی طور پر بیمار مرگ زدہ اور مرگ پسند سیاسی لیڈر ہی خوش ہوئے تھے۔ شاید کوئی سیاسی لیڈر اس کم سزا پر خوش نہ ہوا لیکن اخبارات سے عام تاثر یہی ملا کہ ہر لیڈر نے ان کی جاں بخشی کی سفارش کی۔

کاش یہی لیڈر بھٹو مرحوم کو ہالہ کے پل پر پھانسی دینے کے بجائے ان کی جاں بخشی کی سفارش کرتے!

مجھے معلوم نہیں کہ میاں نواز شریف نے اس فیصلے کو کس آنکھ سے دیکھا ہے اور کس دل سے قبول کیا ہے!

وہ اپنے آپ کو بے گناہ جانتے ہیں لیکن عدالت نے انہیں گناہ کار قرار دیا ہے۔ وہ اسے ''انجینئرڈ'' فیصلہ کہتے ہیں۔ اگر وہ اسے یہ سمجھ کر قبول کرلیں کہ ''از ماست کہ بر ماست''یعنی جو کچھ مجھ پر گزری ہے' وہ میری اپنی ہی غلطی کا نتیجہ ہے تو ممکن ہے کہ انہیں اپنے اندر سے کچھ سکون مل جائے۔ انسان کا دل حکمت کا سرچشمہ ہے جیسے بھی حالات سے انسان گزر رہا ہو' ان سے نبرد آزما ہونے کیلئے اسے اندر ہی سے فلسفہ رہنمائی ملتا ہے۔

اسی کا نام عبرت ہے!

ان کا خیال ہے کہ انہوں نے عوام سے بہت سی نیکیاں کی ہیں۔ عوام ان کے حق میں ضرور آواز بلند کریں گے۔ یہی خیال بینظیر بھٹو کے دل میں بھی ہے کہ ایک سازش کے تحت انہیں معزول کیا گیا ہے' ورنہ وہ تو عوام کی آنکھ کا تارا ہیں' کوئی عوامی آواز نہ بینظیر کے حق میں اٹھی اور نہ میاں صاحب کے حق میں۔ عوام کا اتنا کرم کیا کم ہے کہ ان کی اجتماعی خواہش کے اعجاز نے انہیں تختہ دار تک نہ پہنچے دیا۔ ممکن ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صدر کلنٹن نے ان کی سفارش کی یا برطانیہ کے وزیراعظم نے' سفارش ضرور کی ہوگی لیکن جس سفارش پر غیب سے عملدرآمد ہوا وہ عوام کی سفارش تھی' اجتماعی سفارش!

اس وقت میاں صاحب قید تنہائی میں ہیں۔ مجھے اس کا بہت دکھ ہے۔ تنہائی اور غریب الوطنی میں گھنی چھاؤں کی ضرورت ہوتی ہے اور گھنی چھاؤں بھی اپنے اندر ہی سے ملتی ہے۔ اللہ کرے کہ انہیں یہ گھنی چھاؤں مل جائے اور اس شجر حکمت کے سائے تلے بیٹھ کر وہ سوچیں اور جتنے سال وہ برسر اقتدار رہے ہیں، انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے گردش میں لائیں اور خود فیصلہ کریں کہ ان سالوں میں خالصتاً عوام کی انہوں نے کون کون سی خدمت کی؟ کیا کبھی انہوں نے ملک وقوم کی بہبود اور بہتری کیلئے اپنے اقتدار الگ ہو کر کچھ سوچا اور جو سوچا اس پر کس حد تک عمل کیا؟ کیا اقتدار پر انہوں نے اپنے کاروبار کو قربان کیا؟ اس بار اقتدار ملنے پر انہوں نے قوم سے جو وعدے کئے تھے کیا وہ پورے ہو گئے اور کتنے؟ ٹیلیویژن پر مجھے ان کی جذباتی تقریریں یاد آرہی ہیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر ایک شہید کا ساعزم بھی نظر آتا تھا، بعد میں وہ کہاں گیا؟ انہوں نے بہت شاہانہ قسم کے منصوبے سوچے، ان پر کہاں تک عملدرآمد ہوا؟ ایک موٹروے اور چند دیگر سڑکیں ان کی خدمات کے کھاتے میں لکھی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان میں سے کتنی ہیں جنہوں نے عوام کے زخمی تلوؤں کو سہلایا؟ ان کے دور میں کتنے عوامی ہسپتال کھلے؟ کیا گاؤں گاؤں میں ڈسپنسریاں قائم ہوئیں اور سکول کھلے؟ کارخانے لگے اور بیروزگاری کا مسئلہ حل ہوا؟ وہ خود ایک مزدور کے بیٹے ہیں اور اس پر انہیں فخر بھی ہو گا لیکن بھلا سوچیں تو کہ انہوں نے بندہ مزدور کی تلخی حیات بھی کتنی شیرینی پیدا کی؟ اگر میاں صاحب اس نہج پر سوچیں گے تو انشاء اللہ ان کی قید کے دن کم بھی ہو جائیں گے اور سکون سے بھی گزر جائیں گے کیونکہ اجتماعی دعا ان کے شامل حال رہے گی! انشاء اللہ!

16 اپریل 2000ء

پانچواں طبقہ

کبھی پاکستان میں صرف تین طبقے ہوتے تھے' بڑا' درمیانہ اور چھوٹا۔ بڑے طبقے میں بڑے بڑے زمیندار شامل تھے یا چند گنے چنے دکاندار قسم کے لوگ۔

صنعت کاروں کا طبقہ ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ درمیانے طبقے میں زیادہ تر سفید پوش قسم کے لوگ شامل تھے' ملازم' چھوٹے دکاندار یا مربع دو مربعے کے مالک کاشتکار۔ مزدور' کسان اور کاریگر جو دونوں طبقوں سے زیادہ محنت سے حلال کی روٹی کماتے تھے' چھوٹے طبقے میں شمار ہوتے تھے۔ بعض دیہات میں یہ لوگ کاشتکاروں سے زیادہ خوشحال تھے۔

شہروں' قصبوں اور دیہات میں بڑی بڑی حویلیوں کے پہلو بہ پہلو عام آدمیوں کے گھر بھی تھے۔ بڑے بڑے زمینداروں کے سوا حویلیوں والے انہیں نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ تعزیتی صف پر سبھی مل کر بیٹھتے تھے اور فاتحہ پڑھتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے۔ تب اضافی بستیاں تعمیر ہونے لگیں جن میں ساڑھے تین مرلے سے لے کر چار چار کنال کے پلاٹ' گنگو تیلی کو راجہ بھوج سے الگ کر دیا گیا ہے۔ کبھی گنگو تیلی راجہ بھوج کے محل میں پہنچ جایا کرتا تھا۔ اب اگر وہ ایسی جرات کرے تو اس کے سر پر کھوررکھ دیا جاتا ہے۔ اسلام آباد اس کی بہترین مثال ہے کہ جہاں سات مرلے سے کوئی مکان کم نہیں لیکن چار چار کنال کے محلات بھی ہیں اور دونوں میں کوئی تہذیبی اور ثقافتی رابطہ نہیں۔ ان محلات میں رہنے والے اپنی بودوباش میں کسی اور ہی ملک بلکہ سیارے کی مخلوق نظر آتے ہیں۔

لاہور میں گلبرگ' ماڈل ٹاؤن' ڈیفنس اور فیصل ٹاؤن وغیرہ اس طبقاتی تفاوت کا بہترین نمونہ۔ ان کی سیر کر کے آدمی اب بھی گوالمنڈی چلا جائے تو وہ حیران رہ جائے گا کہ وہ واقعی لاہور سے لاہور آیا ہے ان دنوں میں سے کون سا اصلی لاہور ہے اور اندرونی لاہور کی گلیوں میں چلا جائے تو اسے یوں لگے گا جیسے قدیم تاریخ کے کسی صفحے میں گم ہو گیا ہے۔ میں جس زیر تعمیر بستی میں رہتا ہوں' اس کا ایک طبقہ پانچ پانچ مرلوں کے مکانوں میں رہتا ہے۔ یہ بلاک قریب قریب پورا

تعمیر ہو چکا ہے۔ اس سے اونچا طبقہ دس دس مرلے کے مکانوں میں رہتا ہے۔ اس سے اوپر وہ طبقہ ہے جس کے پاس ایک ایک کنال کے مکان ہیں اور نہایت قلیل مگر جلیل طبقہ وہ ہے جو دو کنال کے مکانوں میں رہتا ہے۔ یہ بلاک ابھی بہت کم آباد ہوا ہے۔ یہ لوگ ہیں بھی بہت کم آمیز۔ جس طرح آٹے میں نمک کم کم ہی محسوس ہوتا ہے' اس طرح اس بلاک کے مکین بھی اپنے آپ کو کم ہی محسوس کراتے ہیں۔

میرے ایک دیرینہ واقف کار جو بیسویں گریڈ سے ریٹائر ہوئے دو کنال کے ایک مکان میں رہتے ہیں' جو دو منزلہ بھی ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ ان کے بیٹے بیٹیاں' پوتے دو ہتے' پوتیاں دو ہتیاں' انگلستان اور مریکہ چلی گئی ہے۔ ان کے ڈرائینگ روم میں کوئی پن بھی فرش پر گرے تو اس کو گونج پورے مکان میں سنائی دیتی ہے۔ ''پن ڈراپ سائیلنس'' کے معنی مجھے اس دن معلوم ہوئے جب میں ان کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اپنے سینے میں سانس کی خرخراہٹ ایسے محسوس ہوتی تھی جیسے کوئی حالت نزع میں ہو۔

اگرچہ ابھی تک کئی پلاٹ خالی ہیں تاہم پانچ مرلے اور دس مرلے کے بلاکوں میں خاصی رونق ہے۔ بستی کی مارکیٹ بھی یہیں واقع ہے اور مسجد بھی۔ ایک کنال کے بلاکوں میں بھی لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں' اگرچہ آبادی کم ہے۔ میرے ایک عدیم الفرصت دوست ایک کنال کے مکان میں رہتے ہیں۔ فون پر وقت طے کر کے ان سے ملنے جاتا ہوں۔ ان کے مکان کا لان مجھے بہت پسند ہے۔ یہاں گھاس بھی بہت شاداب اور دبیز ہے اور آج کل بہار بھی آئی ہوئی ہے۔ چنانچہ پھول کھل رہے ہیں۔ سویٹ پنیر سے بھینی بھینی خوشبو بھی آتی ہے اور ایک درخت پر گلدم بھی چہکتا ہے۔ وہ مجھے اپنے شعر سناتے ہیں اور مجھے اپنی نثر یاد نہیں رہتی کہ انہیں سنا سکوں۔ وہ فائدے میں ہیں اور میں بھی گھاٹے میں نہیں رہتا کہ رنگ اور آہنگ سے محفوظ ہوتا رہتا ہوں۔ اس کے پیچھے کوئی احساس کمتری کارفرما نہیں یا وہ تمنائے رفعت کہ لے اڑتی ہے قطرے کو۔ یوں دس مرلے والوں سے زیادہ قریب ہیں۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ پانچ مرلے والوں کے پاس اکثر موٹر سائیکل ہیں اور دس مرلے والوں کے پاس کاریں کیونکہ ان کے گیراج میں کار سما جاتی ہے۔ پانچ مرلے والے مکانوں کے سامنے بھی کہیں کہیں کار کھڑی ہوتی ہے لیکن پرانی تر پرانی کہ اس پر ڈینٹ بہت پڑے ہوئے تھے۔ دس مرلے والوں کی کاریں نسبتاً کم عمر نظر آتی ہیں۔ کاروں

کے اعتبار سے کنال اور دو کنال والے بھی کچھ زیادہ فوقیت نہیں رکھتے۔ میں نے کہیں کوئی مرسیڈیز یا بی ایم ڈبلیو نہیں دیکھی۔

پانچ مرلے کے مکین سیاسی اعتبار سے بہت فعال اور پر جوش ہیں۔ اگر کبھی اس بستی میں ذرا عوامی قسم کے الیکشن ہوئے تو انشاء اللہ پانچ مرلے والے دس مرلے والوں کے تعاون سے جیت جائیں گے۔ صدر بھی ان کا ہو گا اور نائب صدر بھی۔ شاید سکریٹری کا عہدہ ایسی بستیوں میں دوامی و مستقل ہوتا ہے۔ میں نے کبھی تحقیق نہیں کی کہ میرا کسی بستی میں کوئی ووٹ نہیں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں، ایک تماشائی کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔

ایک روایت ہے کہ اس بستی میں پہلا مکان 1987ء میں تعمیر ہوا۔ گزشتہ تیرہ سال سے تعمیر و تخریب ساتھ ساتھ جاری ہیں۔ ایک طرف کوٹھیاں استوار ہو رہی ہیں، دوسری طرف سڑکوں کا چورا ہو رہا ہے۔ خالی پلاٹوں میں گائیں بھینسیں چرتی ہیں اور شاپنگ بیگ اڑتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پارکوں میں کرکٹ خوب کھیلی جاتی ہے اور بڑی گراؤنڈ کے متعلق ابھی تک طے نہیں ہو سکا کہ وہ پارک ہے یا پلے گراؤنڈ ہے اگر پارک ہے تو اس میں نہ گھاس اگتی ہے، نہ پھول کھلتے ہیں اور گراؤنڈ ہے تو وہاں دھول اڑتی ہے۔ ابھی تک بستی میں سرکاری طور پر کوئی سکول قائم نہیں ہوا اور سکول اتنے ہیں کہ ہر دوسرے تیسرے مکان پر کسی اکیڈمی کا پھریرا اڑ رہا ہوتا ہے۔ ایک عمارت پرائمری سکول کی تعمیر بھی ہوئی ہے لیکن بستی کے پوش علاقے میں ہے اور وہاں جہاں بستی کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ عمارت پانچ مرلے والے بلاک میں بنتی تو اس وقت اس میں ایک انگلش میڈیم سکول کھلا ہوتا اور نہایت کامیابی سے چل رہا ہوتا۔ فی الحال اس سکول کو ''گھوسٹ سکول'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔

اس کالم کا عنوان ''پانچواں طبقہ'' ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ طبقہ کون سا ہے اور کہاں بستا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس طبقے کے لئے کوئی بلاک مخصوص نہیں۔ یہ ہر بلاک میں ہے اور کہیں بھی نہیں۔ یہ طبقہ نعوذ باللہ لامکان ہے۔ گھر اس کا نہ دلی صفاہاں، نہ سمرقند۔ گویا یہ نہ زمین پر رہتا ہے نہ ہوا میں۔ اس کی روزی بھی شاخ آہو پر ہے کہ بہت تگ و دو کے بعد اسے ملتی ہے۔ یہ مرغابی اور تلیر کی طرح نقل مکانی کرنے والے پرندے ہیں۔ یہ طبقہ کسی زیر تعمیر مکان کے سامنے والے پلاٹ میں پہلے اینٹوں کی جھگی اسارتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس مکان کے اندر چلا جاتا ہے

جس کو نہ کوئی دروازہ لگا ہوتا ہے اور نہ کھڑکی۔ سردیوں میں برفانی ہواؤں کا لطف اٹھاتا ہے اور گرمیوں میں مچھروں کے نغمے سنتا ہے۔ جب مکان میں کھڑکی دروازے لگ جاتے ہیں تو کسی اور زیر تعمیر عمارت کے سامنے جھگی بنالیتا ہے۔ مرغابی اور تلیر تو واپس اپنے وطن چلے جاتے ہیں لیکن اسے ایک دفعہ شہر کی چاٹ لگے جائے تو پھر شہر ہی کا ہو جاتا ہے۔ یہ محرومین کا طبقہ ہے۔ اسے کوئی شہری حقوق حاصل نہیں۔ پچھلی مردم شماری میں انہیں اعداد و شمار کا حصہ نہیں بنایا گیا ہے۔ جس گاؤں سے وہ آتے ہیں، وہاں بھی ان کی مردم شماری نہیں ہوتی۔ ان دنوں میں اس طبقے کے بچوں کو پتنگ لوٹتے ہوئے دیکھتا ہوں یا لوٹی ہوئی پتنگ اڑاتے ہوئے حالانکہ بسنت کب کی گزر چکی ہے۔ اس طبقے کا کوئی بچہ سکول نہیں جاتا۔ اس کا ذمے دار کون ہے؟ میں بھی ہوں، آپ بھی ہیں اور وہ جوان بستیوں میں ٹاٹ، تختی اور سلیٹ والے سکول تعمیر نہیں کرتے!

26اپریل2000ء

ڈیڑھ فرلانگ لمبا فٹ پاتھ

میں جس بنک سے پنشن لیتا ہوں وہاں سے ایم ایچ ہیئر کٹنگ سیلون کا فاصلہ ڈیڑھ فرلانگ سے زیادہ نہیں، لیکن میرے لئے سولہ سال پہلے جب میں نے پہلی پنشن لی تو اسی فٹ پاتھ کی وساطت سے ایم ایچ ہیئر کٹنگ سیلون میں پہنچا اور اپنی نوازئیدہ ریش مبارک کا پہلا خط بنوایا۔ اس دن اس خستہ حال ٹوٹے پھوٹے تنگ سے فٹ پاتھ پر چلنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہ آئی حالانکہ کئی نالیاں مجھے پھاندنی پڑی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ ابھی اس علاقے میں زیادہ آبادی نہیں ہوئی تھی، فٹ پاتھ خالی تھا اور سڑک پر دورویہ ٹریفک آسانی سے گزر رہی تھی۔

پھر ایک دن ایسا آیا کہ فٹ پاتھ غائب ہو گیا۔ اچانک نہیں، آہستہ آہستہ یعنی فٹ پاتھ کے کنارے پر دکانیں بننے لگیں۔ جگہ جگہ تجاوزات ہو چکے تھے اور مجھے بار بار سڑک کے کچے حصے پر اترنا پڑتا تھا۔ کوئی ٹرک دندناتا کر میرے پاس سے گزر جاتا تو میں کانپ جاتا، کوئی رکشا شور مچاتا ہوا مجھے آلیتا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور کانوں میں دیر تک شائیں شائیں ہوتی رہتی۔

ان سولہ سالوں میں دو مرتبہ سڑک کے دونوں کناروں کے تجاوزات ہٹائے گئے اور میرا پاؤں فٹ پاتھ پر آ گیا۔ کچھ عرصہ پہلے سڑک کو نئے سرے سے بنایا گیا اور اسے وسیع کیا گیا۔ سڑک پر بچھا ہوا تارکول اور کنکریٹ کا کارپٹ سیمنٹ سے بنے ہوئے صاف ستھرے فٹ پاتھ سے آلگا تو مجھے ایسا لگا کہ میں جو پیدل آدمی ہوں، وی آئی پی لوگوں کی صف میں شامل ہو گیا ہوں لیکن دو چار مہینوں ہی کے بعد پھر میرا ایک پاؤں فٹ پاتھ پر اور دوسرا سڑک پر آ گیا۔

ان دنوں ایم ایچ ہیئر کٹنگ سیلون سڑک کے عین کنارے پر واقع تھا۔ محمد حنیف ہیئر ڈریسر پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اخبار ضرور منگواتا ہے۔ اس علاقے کے (کبھی حاضر اور کبھی سابق) کونسلر اس کے سیلون پر شیو بنوانے آتے تھے۔ ان کی وجہ سے سیلون میں خاصی رونق ہو جاتی اور سیاست پر گرما گرم گفتگو ہوتی۔ میں خاموش بیٹھ کر سنتا۔ محمد حنیف کو بھی سیاست سے خاصی دلچسپی

ہے۔ یہ کونسلر خاصے عوامی، ہمدرد اور خادم قوم قسم کے انسان معلوم ہوئے۔

ایک بار جب میں فٹ پاتھ پر چڑھتا' اترتا' سڑکوں' بسوں اور ویگنوں سے بچتا بچاتا' پٹرولیم فیوم پھانکتا اور ٹریفک کے شوروغل سے مخبوط الحواس سیلون میں داخل ہوا تو محمد حنیف نے پوچھا ''شاہ جی! خیر تو ہے؟'' میں نے سانس بحال کر کے فٹ پاتھ اور رکشوں کا ذکر کیا تو حاضرین نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اثنائے گفتگو میں کسی نے اس زمانے کی حکومت کے کچھ کارناموں کی تعریف کی تو میں بے اختیار ہو کر بول اٹھا ''میں تو اس حکومت کو اچھا کہوں گا جو فٹ پاتھ خالی کروادے اور رکشاؤں کو سائیلنسر لگوادے' حاضرین میری اس بات پر ہنسے۔ کونسلر صاحب نے میری بات کی تصدیق کی حالانکہ ان کا تعلق بھی اسی حکومت سے تھا۔

نومبر 99ء کے پہلے ہفتے کی کسی تاریخ کو جب میں نے بنک سے پنشن لے کر فٹ پاتھ پر پاؤں رکھا تو مجھے منظر کچھ بدلا بدلا سا معلوم ہوا۔ چند قدم چلنے کے بعد میری چھڑی نے فٹ پاتھ کو کھٹکھٹا کر کہا ''بابا جی! آپ خالی فٹ پاتھ پر چل رہے ہیں''۔ رستے میں بس سٹاپ سے ملحق میرے برخوردار اور میرے دوست پہلوان محمد صادق پان فروش کی اتنی چھوٹی سی دکان ہے کہ جس میں وہ اپنے پورے تن وتوش کے ساتھ بیٹھتا ہے تو دکان لبالب بھر جاتی ہے۔ میں نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر بڑے سکون سے اس کی خیر خیریت معلوم کی۔ اس نے مجھے پان کی پیشکش کی تو میں نے بتایا کہ میرے دانت نقلی ہیں اور وہ اب صرف کیلا چبا سکتے ہیں (محمد صادق کبھی پھل بیچا کرتا تھا) میں نے پوچھا ''برخوردار! آپ کے ابا جی سے ملاقات نہیں ہوتی؟'' اس نے کہا ''وہ چلے گئے'' میں نے پوچھا ''اپنے گاؤں؟'' وہ بولا نہیں ''نہیں جی! اور اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے کہا ''ہم بھی زود یا بدیر وہاں پہنچنے والے ہیں برخوردار! ہم آپ کا سلام انہیں ضرور پہنچا دیں گے'' محمد صادق ہنسا۔ اگر فٹ پاتھ خالی نہ ہوتا تو مجھے اتنی لمبی' پرمغز اور لطیف گفتگو کون کرنے دیتا؟

ایم ایچ ہیئر کٹنگ سیلون ایک بغلی گلی کے آخر میں چلا گیا ہے۔ میں ابھی اس کی لوکیشن سے پورا پورا واقف نہیں ہوا اسلئے اپنی ہی رو میں منہ اٹھائے اکثر آگے نکل جاتا ہوں اور محمد حنیف آواز دے کر مجھے روکتا ہے۔ اس دن عین اس کے سیلون کے سامنے جب کھڑا ہوا' تو وہ کچھ حیران سا ہو گیا۔ ''برخوردار! آج میری ایک شرط پوری ہو گئی ہے۔ مجھے فٹ پاتھ خالی ملا لیکن ابھی رکشوں کو سائیلنسر نہیں لگے۔'' میں نے چھوٹتے ہی کہا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا' پھر اسے یاد آ گیا کہ میں نے

اچھی حکومت کیلئے دو معیار مقرر کر رکھے ہیں۔فٹ پاتھ کا انخلا اور رکشا کی زبان بندی۔

بیماری کے باعث اگلے دو مہینے پنشن لینے نہ گیا۔ مارچ کے پہلے ہفتے کے کسی دن پنشن لے کر فٹ پاتھ پر آیا تو منظر پھر بدلا ہوا پایا یعنی فٹ پاتھ پھر غائب ہو گیا تھا۔ کہیں اس پر بینچ لگے ہوئے تھے اور چائے پینے والے لوگ خوش گپیاں کر رہے تھے۔ کہیں کاغان اور سوات کے دیودار کی بڑی بڑی گیلیاں راستہ روک پڑی تھیں کہ جن کے اوپر سے پھلانگنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ کہیں فٹ پاتھ کے ساتھ سڑک پر اینٹوں کی دیوار کھڑی تھی کہ جس کی اوٹ میں ایک ٹرالی پچھلے پاؤں سڑک پر آنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ ایک رکشا میرے کان میں پھٹ پھٹایا تو میں ''ترِبک'' گیا۔ اگرچہ ٹرالی نے میرا لحاظ نہ کیا لیکن ملک الموت نے مجھے اٹھا کر دو قدم دور پھینک دیا۔ گویا مولا علیؑ کا یہ قول ثابت ہو گیا کہ موت انسان کی سب سے بڑی محافظ ہے۔ ایک بغلی گلی کے سامنے مٹی کے دو پہاڑ عین سڑک پر کھڑے تھے اور آخر کار اسے گلی کے اندر تعمیر ہونے والے مکان یا دکان تک پہنچا رہے تھے۔ ایک دکان کے سامنے ایک ریڑھا کھڑا تھا جس کا گھوڑا بہت بیتاب اور بے چین ہو کر راہ گیروں سے اپنی بے بسی اور مظلومیت کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ ایک ٹرک ایک دکان پر بوریاں اتارنے کیلئے اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر رہا تھا۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ کنڈکٹر نے کمال مہربانی سے مجھے آگے گزر جانے کی اجازت دے دی۔ محمد صادق کو دیکھا ضرور لیکن دھکم پیل میں اس سے صاحب سلامت نہ ہو سکی۔ وہ یہی سمجھتا ہو گا کہ میں اس کے ابا مرحوم کو اس کا سلام پہنچا کر وہیں برزخ میں مقیم ہو گیا ہوں۔

ایم ایچ ہیئر کٹنگ سیلون کے سامنے سے پھر بے خبر گزر گیا تو محمد حنیف لپک کر آیا اور مجھے بازوؤں سے تھام کر کرسی پر بٹھا دیا۔ میرے حواس بجا ہوئے تو میں نے پاتال میں ڈوبی ہوئی آواز میں جو مجھے بھی سنائی نہ دی کیونکہ میں نے آلہ سماعت نہیں لگایا ہوا تھا' کہا ''محمد حنیف! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی کوئی حکومت نہ فٹ پاتھ خالی کرا سکتی ہے' نہ رکشے کو سائیلنسر لگوا سکتی ہے۔'' اس نے سر ضرور ہلایا لیکن مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ میری بات کی تصدیق کی یا تردید۔

2 مئی 2000ء

شیخ چلی سے ایک ملاقات

اخبار کے ایک صفحے پر ایک اشتہار نظر سے گزرا:

''نئی صدی...... نئے مواقع...... حکومت کے جاری کردہ انعامی بانڈز میں سرمایہ کاری کیجئے اور جیتئے کروڑوں روپے کے ہزاروں انعامات''۔ جدول میں مختلف بانڈوں کی مالیت اور انعامات کی تفصیل درج تھی۔ ان پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ سب سے کم مالیت کا بانڈ دوسو روپے کا ہے۔ چالیس ہزار کا بانڈ خریدنے کی توفیق نہیں، میں نے سوچا کیوں نہ دوسو روپے کے پچاس بانڈ خریدلوں۔ پچاس بانڈوں کا پیکٹ وزن اور قد وقامت میں چالیس ہزار کے ایک بانڈ سے کہیں بڑا ہوگیا۔ پیکٹ دیکھ کر محسوس ہوگا کہ میں بھی ایک ننھا منا سرمایہ دار بن گیا ہوں۔ اس کے باوجود کہ میں ایک پرانا فرسودہ پنشنی ہوں، دوسو روپے کے پچاس بانڈ خریدنے کی بحمد للہ مجھے استطاعت حاصل ہے اور بانڈ تعداد میں زیادہ ہوں تو کبھی کبھار کسی بانڈ پر چھوٹا موٹا انعام نکل آنے کا چانس بھی ہوتا ہے اور کیا پتہ کسی بانڈ پر پہلا انعام نکل آئے...... ایک لاکھ روپے کا انعام...... ایک لاکھ روپے!...... آج کل ایک لاکھ روپے کیا کیا حقیقت ہے؟ لیکن نہ ہونے سے کچھ ہونا اچھا ہی ہوتا ہے۔ ایک لاکھ روپے بنک میں جمع ہوں تو ذاتی حیثیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ بنک والے ایسے اکاؤنٹ ہولڈر کو معززین کی فہرست میں شامل کرلیتے ہیں۔ ستتر سال کی عمر میں طبیعت کئی بار اچانک بگڑ جاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی ہسپتال میں جانا پڑ جائے (خدا کرے کہ وہ سرکاری ہسپتال نہ ہو) تو ایک لاکھ میں کم از کم ہفتہ دس دن تو بستر بیماری پر چین سے گزر سکتے ہیں اور اگر دن پورے ہوجائیں تو آدمی بڑے سکون سے اس کی دی ہوئی جان اسے لوٹا سکتا ہے اور پرائیویٹ ہسپتال میں مرنے کا اعزاز بھوکٹ میں مل جاتا ہے۔

لیکن جب تک جان ہے، جہان بھی ہے۔ کیوں نہ مثبت انداز میں سوچا جائے کیونکہ ایک لاکھ میں سے چالیس چالیس ہزار کے دو بانڈ خرید کر بھی بیس ہزار بچ سکتے ہیں جو بنک میں جمع کرائے جاسکتے ہیں۔

گزشتہ زندگی پر نظر دوڑاتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بیچارے مسلمان کو کبھی اس نے غیبی اور اچانک عنایات کا اہل نہیں ہوتا۔ یعنی کبھی کسی خرابے سے اشرفیوں کی ایک دیگ تو کیا' ایک کھوٹا پیسہ بھی عطا نہیں فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک سچے مسلمان کی طرح خون پسینہ بہا کر صرف اتنی روزی کمائی ہے کہ سر پر چھت بھی رہی ہے' بدن پر کپڑا بھی اور پیٹ میں روٹی بھی......

لیکن اگر چالیس ہزار کے ایک بانڈ پر پانچ کروڑ کا پہلا انعام نکل آئے تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی...... میں اب بھی مسلمان ہوں' پھر بھی مسلمان ہی رہوں گا یعنی سب سے پہلے اس رقم کا خمس نکالوں گا۔ پانچ کروڑ کا پانچواں حصہ یعنی ایک کروڑ روپے......سات صفروں کے بعد ایک۔ جب میں ان سات صفروں کی منزلیں طے کر کے اس ایک تک پہنچا تو کسی نے میرے دل وجگر پر ہاتھ ڈال کر انہیں بھینچ ڈالا...... پھر میرے پاس کیا رہ جائے گا؟ صرف چار کروڑ روپے۔ بقول غالب پاکستان کے تیرہ کروڑ باشندوں میں ؎

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

میں ایک کروڑ روپیہ یتیموں' مسکینوں' اسیروں' بیواؤں اور محتاجوں میں بانٹ بھی دوں تو کسی کی حاجت روا نہیں ہوگی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک راستہ میں نے نکال لیا۔ کیوں نا میں ایک ٹرسٹ بنا دوں اور اس رقم کو بچت کی کسی سکیم میں جمع کرا دوں' خود واحد سول (Sole) ٹرسٹی بن جاؤں۔ سال کے سال دس بارہ لاکھ روپے نفع ملے گا۔ اپنے گاؤں جاؤں گا اور یتیموں' بیواؤں اور مریضوں میں تقسیم کروں گا' کچھ ذہین طلبا کے وظائف مقرر کردوں گا' کچھ روپیہ بلا امتیاز فرقہ مساجد میں دوں گا' کچھ امام بارگاہوں کو اور کم از کم ایک ایک لاکھ ایدھی کو اور عمران کو......اور میری فیاضی یعنی فل ان تھراپی کی دھوم مچ جائے گی۔ باقی چار کروڑ بچت کی مختلف سکیموں میں جمع کرا دوں گا اور ان کی آمدنی سے بقیہ زندگی مزے میں گزار دوں گا۔ میں نے آج تک کبھی لمبی زندگی کی دعا نہیں مانگی کہ یہ ہنود و یہود کا وطیرہ ہے لیکن اب لمبی زندگی کی دعا خود بخود زبان پر آ جائے گی کہ اتنا روپیہ اللہ نے دیا ہے تو اس کا کچھ فائدہ بھی تو اٹھانا چاہیے...... جب سے جیمز ہلٹن کا ناول ''لاسٹ ہورائزن'' (کھویا ہوا افق) کا ترجمہ اردو میں کیا ہے'' شانگری لا'' میرے ذہن میں بسا رہتا ہے۔ سکردو' گلگت' شگر بلتستان' ہنزہ' نگر' کاغان' ایبٹ آباد یا مری میں کہیں تو ''شانگری لا'' مل جائے گا۔ چلئے ایک کاٹیج کی صورت میں ہی سہی۔ جی تو چاہتا ہے کہ مری کا گورنر ہاؤس خرید لوں

لیکن چار کروڑ پتی کے لئے ضروری ہے کہ لاہور کے کسی پوش علاقے میں کم از کم ایک کنال کا بنگلہ ہو۔ سٹیٹس کو مین ٹین کرنے کے لئے ایک کار بھی درکار ہوگی۔ درمیانے درجے کی سہی لیکن نئی ہونی چاہئے۔ فرنیچر' قالین' ٹی وی' فرج' وی سی آر اس پر مستزاد۔ پھر بھی خاصی رقم بچ جائے گی۔ دو رہائش گاہوں کی دیکھ بھال کے لئے نوکر چاکر اور کار کے لئے ڈرائیور بھی درکار ہوگا۔ ایک کروڑ اگر بچت کی کسی سکیم میں جمع ہو تو اس کی آمدنی سے کاروبار زندگی بخوبی چلایا جا سکتا ہے۔ ایک کروڑ شرع کے مطابق چار بیٹوں اور ایک بیٹی میں تقسیم کروں گا' وہ خوش ہو جائیں گے...... کیا وہ واقعی خوش ہو جائیں گے؟...... کیا وہ نہیں کہیں گے کہ ابا جی دولت پر سانپ بن کر بیٹھ گئے ہیں؟...... نہیں جی! میری اولاد بہت تابع فرمان ہے' وہ ایسا سوچے گی بھی نہیں...... اگر کبھی ان کی زبان پر ایسی بات آئی بھی' تو میں کہوں گا ''عزیزان من! اگر زندگی کے بقیہ دو چار سال عیش و عشرت میں گزار لوں' تو اس کیا ہرج ہے؟'' اگر وہ کہیں گے کہ ابا جی! آپ کے یہ عیش کرنے کے دن نہیں' مصلے پر بیٹھ کر چلّے کاٹنے اور عاقبت سنوارنے کے دن ہیں تو اس مسکت دلیل کا کیا جواب دوں گا۔ میں سوچنے لگا اور سوچ میں گم ہو گیا۔

اتنے میں مجھے یوں لگا جیسے پلنگ کی پائتی کی طرف بچھی ہوئی کرسی پر کوئی چپکے سے آ کر بیٹھ گیا ہے...... گردن پھیر کر دیکھا تو مہمان کچھ مانوس سا نظر آیا...... چگی داڑھی...... ناک طوطے کی چونچ...... گھٹنا نما پاجامہ...... سلیم شاہی جوتیوں کی ایڑیاں بیٹھی ہوئیں...... آدھا سر منڈا ہوا جہاں جگہ جگہ روئی کے 'پھنبے' لگے ہوئے...... میں نے پوچھا ''میرے ہاں قدم رنجہ فرمانے کا سبب؟'' آواز آئی ''ایک اناڑی حجام نے آدھے سر میں کپاس کاشت کر دی' اب ایک اور اناڑی حجام کے پاس جا رہا تھا کہ روٹی اور کپڑے میں خود کفیل ہونے کے لئے دوسرے آدھے سر میں گندم کاشت کروا لوں کہ آپ کو ہوائی انڈے سیتا ہوا پایا۔ سوچا ہم خیال ہیں' کچھ عرصہ صحبت سے مستفید ہو لوں''۔

میں نے پوچھا ''جن ہوائی انڈوں کو آپ سی رہے تھے' ان کا کیا بنا؟''

''جیسا کہ ان کا انجام ہوتا ہے' بیچ چوراہے میں گر کر ٹوٹ گئے''

پھر اچانک مجھے کرسی خالی نظر آئی!

11 مئی 2000ء

کس مُپرسی سے کس مُپرسی تک

اخبار میں اکثر یہ خبر چھپتی رہتی ہے کہ فلاں فنکار کس مپرسی کی حالت میں وفات پا گیا۔ بہت دکھ ہوتا ہے لیکن اس فنکار کی زندگی پر ایک نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا آغاز بھی کس مپرسی سے ہوا تھا۔ تاہم درمیان میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا کہ اس نے بہت کمایا اور اڑایا' مقبول بھی بہت ہوا اور اس کے گلے میں پھولوں کے ہار نہیں' نوٹوں کے ہار ڈالے گئے۔ یہ زریں دور گزر گیا تو معلوم ہوا کہ کس مپرسی' نے پھر اچانک اسے آلیا۔ اس کا ذمے دار اکثر حکومت کو ٹھہرایا جاتا ہے کہ اس نے اس کا وظیفہ مقرر نہ کیا۔ حالانکہ حکومت تو ہر اس کسان اور مزدور کی کس مپرسی کی ذمے دار بھی ہے جو کھیت میں کام کرتے کرتے یا اینٹیں ڈھوتے ڈھوتے نحیف و نزار ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کتنوں کو وظیفہ ملتا ہے یا اولڈ ایج پنشن حالانکہ یہ ملک وقوم کی اقتصادی عمارت کے بنیادی ستون ہیں۔

حال ہی میں ایک گلوکار پٹھانے خان نے وفات پائی ہے۔ انہوں نے زندگی بھر بڑی محنت کی' ان کی گائیکی کی شہرت ہوئی' ان کے گائے ہوئے صوفیانہ کلام کے ریکارڈ بھرے گئے اور کیسٹ بھی' کئی دل ان سے روحانی سکون حاصل کرتے تھے۔ حکومت نے بھی انہیں نوازا لیکن پٹھانے خان کی بیٹی نے کہا ہے کہ انہوں نے کس مپرسی کی حالت میں وفات پائی۔ میرا خیال ہے کہ پٹھانے خان مرحوم نے اپنی زندگی کا آغاز بھی کس مپرسی کی حالت میں کیا ہو گا۔ درمیانی زمانے میں انہوں نے یقیناً کچھ کمایا ضرور ہو گا یا وہ اتنا کم تھا کہ روزانہ زندگی کی کفالت بھی نہ کر سکا پٹھانے خان مرحوم نے درویشی میں جو کچھ ملا' اسے اڑا دیا۔ ان دنوں کے لئے کچھ نہ بچایا جنہیں انگریزی میں برسات کے دن کہا جاتا ہے' کیونکہ فنکار دل کے بہت کھلے ہوتے ہیں۔ روپے پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ وہ آنے والے زمانے سے ڈرتے بھی نہیں یا خدا پر ان کا یقین بہت مضبوط ہوتا ہے کہ آج دیا تو کل بھی ضرور ملے گا!

ایک عرصہ ہوا' سنٹرل ٹریننگ کالج میں پرنسپل صاحب نے ازراہ ہمدردی ایک گلوکار کو

اساتذہ طلبا کے سامنے ایک پرفارمنس کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ماسٹر صاحب پچاس بچپن کے پیٹے میں ہوں گے، کلین شیون، کھلتا ہوا رنگ، لڑکپن میں تھیڑوں میں لڑکی کا پارٹ ادا کیا کرتا تھا۔ گاتا تھا تو سامعین مست ہو جاتے تھے۔ دو چار غزلیں ٹھیک ٹھاک گائیں، منہ میں کچھ دانت غائب تھے اس لئے کوئی نہ کوئی سر دانتوں کی قید سے آزاد ہو کر پھس سے نکل جاتی تھی یا بہت تیکھی ہو جاتی تھی۔ پرفارمنس کے بعد اساتذہ اور طلبا نے ان کی کچھ خدمت کی۔ میں نے بھی ایک روپیہ چندے میں دیا۔ ماسٹر صاحب نے جھٹ سے ڈھولکی والے کو بھیج کر دو چار گلوریاں پان کی اور دو چار پیکٹ کیپسٹن کے منگوائے۔ گلوری منہ میں ڈال کر بھک بھک سگریٹ اڑانے لگے۔ اس دن میں نے کالج سے واپسی پر ولز کی ایک ڈبیا نہ خریدی کہ جیب خالی تھی۔ تاہم فن کے لئے اتنی معمولی سی قربانی کا مجھے کوئی افسوس بھی نہیں تھا۔ کچھ دنوں بعد دیکھا کہ ماسٹر صاحب ایک فٹ پاتھ پر پرفارمنس دے رہے ہیں اور نہایت قلیل تعداد میں قدر دان ان کے سامنے بچھی چادر پر اکنیاں دونیاں پھینک رہے ہیں۔ یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ میں نے انہیں 'پکار' کے ایک سائڈ ہیرو اور ''پرکھ'' کے ہیرو ماسٹر صادق حسین کی طرح پلازا سینما کے بینچ پر مفلوج حالت میں بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ تاہم اس چھوٹے سے واقعے میں ''کس مپرسی سے کس مپرسی تک'' کی پوری داستان کا آغاز بھی موجود ہے، درمیان بھی اور انجام بھی۔

ایک گلوکار کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ایک پرفارمنس کا ایک لاکھ روپیہ معاوضہ طلب کرتے ہیں۔ اس میں یقیناً کچھ مبالغہ ہوگا۔ میں نے چالیس سال نوکری کی، انکم ٹیکس دینے کا اعزاز بھی حاصل کیا لیکن اپنی سروس کے عروج پر بھی اتنی تنخواہ نہ ملی کہ سال بھر میں ایک لاکھ بن جاتی۔ ان گلوکار کا کچھ بائیو ڈیٹا کسی اخبار یا رسالے میں دیکھا تھا۔ ان کا تعلق گانے بجانے والے طبقے سے ہے۔ قدرت نے آواز سریلی دی تھی۔ پھر ریاضت بہت کی اور اس عروج پر پہنچے۔ میری ان سے گزارش ہے کہ موم بتی کو ایک ہی سرے سے روشن رکھیں کہ ان کا آغاز ''کس مپرسی'' سے ہوا، اللہ کرے کہ انجام پر کسی کے دست نگر نہ ہوں!

یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ فنکار (خاص طور پر اداکار اور گلوکار) اپنی قدر افزائی میں کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ دامے، درمے، سخنے اس کی جتنی بھی حوصلہ افزائی کی جائے، اس کا جی نہیں بھرتا۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ دنیا نے اس کی قدر نہیں کی۔ وہ اگر ہندوستان میں ہوتا یا ہوتی تو دیوتا دیوی کی طرح اس کی پوجا کی جاتی۔ (کیا کیا جائے کہ مسلمان اپنی آستین میں بت ضرور رکھتا ہے لیکن پوجتا نہیں

کہ اسے حکم اذاں بھی ہے' لا الہ الا اللہ) ہندوستان کے کسی مندر میں بھی تا حال کسی اداکار یا گلوکار کا بت بنا کر نہیں رکھا گیا۔ دلیپ کمار کی مثال تو سامنے کی بات ہے۔ دیوداسی لتا منگیشکر تو اس قابل ضرور ہیں کہ ان کا بت کسی مندر میں سج رہا ہوتا۔

31 مارچ 2000ء کے نوائے وقت صفحہ آٹھ کی ایک سرخی ملاحظہ ہو۔

''جتنا گایا' اتنا صلہ نہیں ملا'' مہدی حسن

میں یہ سرخی پڑھ کر حیران بھی رہ گیا اور دکھی بھی ہوا کہ زمانہ کتنا قدر ناشناس اور نا قدردان ہے جو مہدی حسن سے بھی انصاف نہ کر سکا۔ اس مہدی حسن سے جس کے گلے میں بقول لتا منگیشکر بھگوان بولتا ہے (گاتا نہیں) جس کی گائی ہوئی ایک غزل ''گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے'' نے ایک زمانے کو مسحور کیا اور کئی بنجر زمینوں میں پھول کھلائے میں جب بھی یہ غزل سنتا ہوں' مجھ پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ اس غزل کا انہیں اتنا صلہ ملا ہو گا کہ فیض احمد فیض کو اپنی شاعری کا زندگی بھر نہ ملا ہو گا۔

حیف کہ انہوں نے جتنا گایا اس کا انہیں صلہ نہ ملا!

اسی خبر کا ایک حصہ ہے'' رومانیت پسند ہوں...... رومانی طبیعت کا مالک ہوں کیونکہ رومان کے بغیر زندگی ادھوری رہتی ہے۔'' حافظ شیرازی نے '' ایک کالے تل'' پر اپنے ایک ''رومان'' کو سمرقند و بخارا پیش دیئے تھے۔ نجانے مہدی حسن اپنی زندگی کی تکمیل کیلئے اپنے کس کس ''رومان'' کو ہیرے جواہرات میں تولتے رہے ہوں گے اور رہیں گے۔ ایسی صورت میں تو قارون کا خزانہ بھی مکتفی نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو اس خبر میں کس مپرسی' کی سرسنائی دے رہی ہے!

18 مئی 2000ء

نور پور کلاں کا پرائمری سکول

نور پور کلاں میں دیکھنے کو چاچا بوٹا کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کوئی باغ ہے نہ کوئی راغ' درخت بھی ٹاویں ٹاویں نظر آتے ہیں اور پرندوں میں اپنے دوست کوے ہی سے زیادہ ملاقات ہوتی ہے۔ بلبل ہزار داستاں تو مجھے کسی گاؤں میں نغمہ سرا سنائی نہیں دی۔ کبھی گاؤں کے کھیتوں میں آم اور جامن کے درخت ہوتے تھے' تو برسات میں کوئل بھی کوکتی ہوگی۔ لیکن جب کبھی میں نور پور کلاں جاتا ہوں' چاچا بوٹا چاہتا ہے کہ میں اس کے گاؤں کے قابل دید مقامات کی سیر ضرور کروں۔ پچھلی بار وہ مجھے چودھری لال دین نمبردار کی حویلی میں لے گیا۔ یہ حویلی آثار الصنادید میں شمار ہو سکتی ہے۔ دیواروں کو کلر کھا گیا ہے اور سیم نے بنیادوں کو زمین میں دھنسا دیا ہے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کو گھن لگا ہوا ہے۔ صرف ایک دو کوٹھڑیاں محفوظ ہیں۔ جہاں چودھری لال دین رہتا ہے اور حقہ پیتا ہے۔ اس نے مجھے بھی از راہ مہمان نوازی حقے کی نے پیش کی لیکن میں نے انکار کر دیا' اس بناء پر کہ ایک عرصے سے اس سے ناتا توڑ چکا ہوں۔

اس بار چاچا بوٹا مجھے اپنے گاؤں کے پرائمری سکول میں لے گیا۔ سب سے پہلی چیز جس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچی' وہ سکول کے صحن میں ایستادہ اوکاں کا درخت تھا۔ میں نے خوش ہو کر کہا ''اوکاں کا بوڑھا درخت!'' چاچا بوٹا بولا ''اس کا ایک ساتھی قبرستان میں بھی کھڑا ہے''۔ قبرستان کا لفظ سن کر میں چونکا۔ سکول کی عمارت اور کیمپس پر نظر ڈالی تو وہ بھی مجھے قبرستانی فضا کے حامل نظر آئے۔ ''لوگ کہتے ہیں قبرستان والے درخت پر ایک روح رہتی ہے۔ میرا اس سے ٹاکرا تو نہیں ہوا لیکن اتنا یقین ہے کہ کوئی نیک روح ضرور رہتی ہے۔ اگلی بار آپ کو قبرستان کی سیر کرائیں گے۔'' چاچا بوٹا بولا مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے بات بدلنے کے لئے پوچھا ''کیا آج سکول میں چھٹی ہے؟'' وہ بولا ''نہیں جی! ابھی سکول لگنے کا وقت نہیں ہوا''۔ میں نے جھنجھلا کر کہا ''سورج تو سوا نیزے پر آ گیا ہے اور تم کہہ رہے ہو' ابھی سکول لگنے کا وقت نہیں ہوا''۔

''صاحب جی! منشی اللہ دتہ زخمی دو تین کوس دور سے آتے ہیں۔ سائیکل بھی ان کی پرانی ہے' اکثر رستے میں جواب دے دیتی ہے۔''

''صاحب جی! سمجھا بھی کریں۔ وہ زخمی نہیں' ان کا نام زخمی ہے''

''نام زخمی ہے'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ابھی چاچا بوٹے نے جواب نہیں دیا تھا کہ دور سے ایک آدمی سائیکل کو گھسیٹتا ہوا نظر آیا۔ جب قریب آیا تو معلوم ہوا کہ آدمی بھی پرانا ہے اور سائیکل بھی پرانی اور آدمی زخمی بھی ہے کہ اس کے ایک ہاتھ پر رومال تو خیر کیا ہو گا؟ چیتھڑا لپٹا ہوا تھا۔ چودھری بوٹا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا'' صاحب جی'' آدمی نے سائیکل پٹخ دیا اور سکول کی ایک کوٹھڑی کی طرف بھاگا۔ میں سمجھ گیا۔ میں اونچی آواز میں پکارا'' منشی اللہ دتہ زخمی صاحب! میں شلوار والا صاحب نہیں۔ میرا مطلب ہے' آپ شلوار پہنے بغیر بھی مجھ سے ہم کلام ہو سکتے ہیں۔'' وہ لوٹ آئے تو میں نے ان سے مصافحہ کرنا چاہا۔ وہ بولے'' مصافحے والا ہاتھ زخمی ہے جناب! رستے میں سائیکل کا ڈھرا ٹوٹ گیا تھا اور میں گر پڑا تھا'' تب انہوں نے زخمی ہاتھ سے اوکاں کی ایک شاخ سے لٹکے ہوئے ٹل پر دو تین کاری ضربیں لگائیں۔ تو میں نے محسوس کیا کہ درس و تدریس کی فضا لرزہ بر اندام ہو گئی ہے۔ مختلف کونوں سے ڈرے سہمے' نیم خفتہ' نیم بیدار' بیزار سے لڑکے اکا دکا برآمد ہونے لگے۔ کوئی گاؤں کی کسی گلی سے اُکا' کوئی کماد کے کھیت کے پیچھے سے' کوئی اس مینڈھ پر چلتا ہوا نظر آیا' کوئی اس مینڈھ پر۔

جب چالیس پچاس لڑکے اکٹھے ہو گئے تو وہ خود بخود لائنوں میں آ کھڑے ہوئے۔ دو لڑکوں نے دعا کہلوائی۔ دعا دعا ہی ہوتی ہے' کوئی ضروری نہیں کہ اسے سلامت علی نزاکت علی ہی مل کر کہلوائیں۔ لڑکوں نے ٹاٹ جھاڑے' تو غبار کی تلخ نمکینی نے میرے سانس کی حالت بگاڑ دی۔ میں نے کھانستے ہوئے پوچھا'' پچھلے سال آپ کو جو کرسیاں ڈیسک ملے تھے' وہ کہاں گئے''؟

''چودھری اکرم صاحب بیمار ہیں۔ عرضی بھیجی ہے' لکھتے ہیں۔ نزلہ بھی ہے' زکام بھی ہے' دردِسر بھی ہے' زخمی' ہمارے حال کی تم کو خبر بھی ہے۔'' زخمی صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میری بات ٹال دی۔

''ماسٹر اکرم شاعر ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی! وہ شاعر کیا ہوں گے؟ وہ چودھری آدمی ہیں۔ یہ شعر ماسٹر محمد حسین مجروح کا ہے جو آج اے ای او صاحب کے ہیڈ کوارٹر انہیں اپنا کلام سنانے اور ان سے ان کا کلام سننے گئے ہوئے ہیں۔''

''اور گھائل صاحب کوئی مشاعرہ پڑھنے گئے ہوں گے؟'' میرے منہ سے بے اختیار

نکل گیا۔ اللہ دتہ زخمی صاحب نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا ''اس نام کا کوئی ٹیچر میرے ماتحت کام نہیں کرتا جناب!...... پتا نہیں مولانا نور دین صاحب کو کیوں دیر ہو گئی؟ وہ تو بہت باقاعدہ آدمی ہیں۔ ساتھ کے چک میں امام مسجد بھی ہیں۔ کہیں کوئی جنازہ نہ آ پڑا ہو۔'' معاً ایک لڑکے نے ایک رقعہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انہوں نے پڑھ کر کہا ''میں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جنازہ پڑھ کر آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔'' اتنے میں چوتھے استاد بھی آ گئے۔ وہ جوان آدمی تھے۔ آنکھوں پر دھوپ کی عینک لگی ہوئی تھی اور بلا ضرورت' کپڑے ڈھنگ کے پہنے ہوئے تھے۔ کسی جھجھک کے بغیر مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولے ''میرا نام محمود ہے۔ محمود چوہان' میں ایف اے پی ٹی سی ہوں اور بی اے کی تیاری کر رہا ہوں۔'' میں نے خوش ہو کر پوچھا ''اس کے بعد کیا ارادے ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا ''پولیس میں ڈائریکٹ انسپکٹر بھرتی ہونے کا خیال ہے۔''

''ماشاء اللہ! بڑا نیک ارادہ ہے۔'' میں نے کہا پھر زخمی صاحب سے پوچھا ''پانچویں ماسٹر کون ہیں؟''

''وہ حاجی مولا بخش ایم پی اے کے منشی ہیں۔ وہ مہینے کے مہینے قبض الوصول پر دستخط کرتے اور تنخواہ وصول کرتے ہیں۔'' زخمی صاحب نے جواب دیا۔ میں مارے حیرت کے گونگا ہو گیا تو انہوں نے نے بات کہ آگے بڑھایا ''جب سے کچھ سختی شروع ہوئی ہے' وہ مہینے کے مہینے ایک دن سکول آ جاتے ہیں' ورنہ پہلے تو قبض الوصول مع تنخواہ ان کے گھر بھیجنا پڑتی تھی۔'' اس کے بعد چاچا بوٹا اور زخمی صاحب نے بہت اصرار کیا کہ میں سکول کے کمروں کا اندر سے معائنہ کروں لیکن میں ٹوٹے پھوٹے کمروں کو باہر ہی سے دیکھ کر مطمئن ہو گیا تھا۔ سکول کی کچی چار دیواری جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ لوگ سکول کے صحن سے بلا تکلف گزر رہے تھے۔ میں نے چاچا بوٹا سے کہا ''عزیزم! جب نئے سیٹ اپ میں تم یونین کونسل کے ممبر بنو گے تو سکول کی چار دیواری ضرور پکی کروا دینا کہ بقول شاعر

دیوار کیا گری میرے کچے مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستہ بنا لیا

چاچا بوٹا تو خاموش رہا لیکن زخمی صاحب نے کھل کر داد دی۔ معلوم ہوا کہ وہ اگر شعر نہ بھی کہتے ہوں' تو نہ سہی شعر فہم ضرور ہیں!

23 مئی 2000ء

کُھرجی سے ڈِگی تک

شفقت حسین نقوی میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔ وہ عمر میں مجھ سے سات آٹھ سال چھوٹے ہیں۔ اس لئے دسویں جماعت میں انہیں میری شاگردی کا یا مجھے ان کی استادی کا شرف حاصل رہا ہے۔ جب وہ میرے شاگرد تھے، میں انہیں اردو یا انگریزی میں کسی موضوع پر مضمون لکھنے کو کہتا تھا، تو وہ بہت گھبراتے تھے اور کہتے ''بھائی جان! کچھ اشارے بھی تو دیجئے''۔ ان دنوں جب میں ان سے ملنے ان کے گاؤں گیا تو انہوں نے مجھ سے ایک عجیب فرمائش کی ''بھائی جان! ایک کالم میرا بھی لکھ دیجئے'' میں نے کالم نویسانہ رعونت سے کام لیتے ہوئے کہا ''ہر شخص کو اپنا کالم آپ لکھنا چاہیے''۔ وہ بولے ''میرا یہ مطلب نہیں تھا، موضوع میں دوں گا، کالم آپ لکھیں''۔ میں نے کچھ گھبرا کر کہا'' بتایئے! کالم کا موضوع کیا ہے؟'' وہ بولے ''خرجی سے ڈگی تک''۔ اب میں گھبرایا بھی اور سٹپٹایا بھی۔ ذرا غور کرنے پر ''خرجی'' اور ''ڈگی'' کے معنی تو میری سمجھ میں آ گئے لیکن ان کے درمیان ربط میری گرفت میں نہ آ سکا۔ میں نے کہا ''برخوردار! کچھ اشارے دیجئے۔ پھر سوچوں گا کہ اس موضوع پر کالم لکھا جا سکتا ہے یا نہیں''۔ انہوں نے جو اشارے دیئے، وہ مجھے کافی بامعنی معلوم ہوئے اور میں نے یہ کالم مکمل کر لیا۔

انہوں نے بتایا کہ ایک زمانہ تھا، پٹواری گھوڑی پر سوار ہو کر اپنے حلقے کی گرداوری پر نکلتا تھا۔ پگڈنڈی پر ٹھمک ٹھمک چلتی ہوئی گھوڑی کسی راہی کو دیکھتی، تو اپنے آپ کھڑی ہو جاتی کیونکہ اکثر راہگیر پٹواری سے ملاقات کے خواہاں ہوتے تھے۔ گھوڑی کی پیٹھ پر خرجی ضرور لٹکی ہوتی۔ کسی کسان کی مسور یا ماش کی فصل اچھی ہوتی تو وہ ایک پوٹلی دال کی پٹواری کی خرجی میں ڈال دیتا اور گھوڑی آگے چل پڑتی۔ گڑ گنا، چھلی تکا، گنا ٹوٹا، پیاز، تھوم، مرچ، جوار، باجرہ، موسم کی سبزیاں، کھیرا ککڑی، تربوز خربوزہ سبھی اس زنبیل میں سما جاتے۔ کوئی کسان کھیت میں چارا کاٹتا ہوا دکھائی دیتا تو پٹواری ایک پولا بندھوا کر آگے رکھ لیتا۔ یوں اس کے پاس دو دھیل گائے بھینس کٹیا، بچھیا کے علاوہ ایک عدد گدھی بھی ضرور ہوتی اور ایک کاما بھی جو چارا ڈھو کر لاتا۔ کوئی سائل اس کے پاس

فرد لینے کو آتا تو پٹواری اسے نمکین لسی ضرور پلاتا۔ 'فرد' کی سرکاری فیس مقرر ہے۔ اس میں ایک چوتھائی پٹواری کا ہوتا اور اب بھی ہے۔ کسی زمانے میں سرکاری فیس روپیہ دو روپے ہو گی۔ اب ممکن ہے دس روپے ہو۔ سائل اپنی خوشی سے پٹواری کو روپیہ دو روپیہ فاضلہ دے دیتا۔ انتقال اراضی کی بھی سرکاری فیس ہوتی لیکن پٹواری کو اس سے دگنی تگنی رقم وصول کرنی پڑتی کہ اس کی تصدیق میں گرداور' نائب تحصیلدار اور تحصیلدار بھی شامل ہوتے۔ اسے رشوت نہیں سمجھا جاتا تھا' یہ ایک ایسا سماجی نظام تھا جس پر صدیوں کی مہر تصدیق لگی ہوئی تھی۔

جب پاکستان وجود میں آیا تو متروکہ زمینوں کی الاٹمنٹ نے پٹوار کے نظام کو خاصا دگر گوں کر دیا لیکن پھر بھی اس زمانے کا پٹواری عوام دوست رہا اور مردم آزار نہ بنا۔ گزشتہ بیس پچیس سال سے جہاں اور بہت سے انقلاب آرہے ہیں (زوال وانحطاط بھی ایک انقلابی عمل ہے) وہاں پٹوار کا دستور بھی بدل گیا ہے۔ پرانی نسل کا عوامی پٹواری ریٹائر ہو گیا اور جوان نسل کے عوام بیزار پٹواری نے اس کی جگہ لے لی۔ وہ گھوڑی سے اترا اور موٹر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ مزید ترقی ہوئی تو کار تک پہنچ گیا اور خرجی کی جگہ ڈگی نے لے لی۔ خرجی سے ڈگی تک کا سفر فرد اور انتقال کے ذریعے طے ہوا۔ فرد دیکھنے میں ایک معمولی کاغذ ہے لیکن قیمت کے لحاظ سے سونے کا ''پتر'' ہے اور انتقال تو سونے کی کان ہے۔ یہاں شفقت حسین نے انتقال کی پیچیدگیوں پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی لیکن میرا سیدھا سادہ حافظہ انہیں محفوظ نہ رکھ سکا۔ اتنا یاد رہ گیا کہ جن علاقوں میں صنعتی زون بن رہے ہیں یا نئی بستیاں تعمیر ہو رہی ہیں یا سڑکوں کے کناروں کی زمینیں بک رہی ہیں' وہاں لوگ زمین کی رجسٹری نہیں کرواتے' انتقال اراضی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ رجسٹری کی فیس انتقال سے کہیں زیادہ ہے۔ پٹواری اس صوت حال کا بہت فائدہ اٹھا رہا ہے۔ وہ مشتری اور بائع دونوں کو لوٹتا بھی ہے لیکن انہیں زبانی کلامی خوش بھی رکھتا ہے کہ حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ زیادہ نقصان سرکاری خزانے کا ہوتا ہے۔ کاغذات میں زمین کی قیمت کا تخمینہ کم درج کرتا ہے اور خریدار سے وصول کی ہوئی اصل فیس بھی جمع نہیں کراتا۔

پٹواری کہتا ہے کہ میں مجبور ہوں۔ میرے اوپر جو افسر لگے ہوئے ہیں' وہ ایم این اے اور ایم پی اے حضرات کی عیاش اولاد ہیں۔ مجھے ان کے شاہانہ اخراجات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس میں کچھ حیثیت میں نے بھی بنا لی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔ کار اور ڈگی تک پہنچنے کے بعد پٹواری نے بنگلہ بھی بنوا لیا اور کرسی نشین بھی ہو گیا۔ کبھی پٹوار خانے میں دری بچھتی تھی اور پٹواری

اس پر بیٹھ کر کام کرتا تھا۔اب قالین بچھا ہوتا ہے اور اس پر دو تین بزرگ بیٹھے ہوتے ہیں۔کسی کی عینک کی ایک کمانی پر دھاگا لپٹا ہوتا ہے، کسی کی آنکھوں پر سبز دھجی لٹکی ہوتی ہے کہ ابھی ابھی موتیا بند کا اپریشن ہوا ہے۔یہ پنشنی پٹواری ہیں۔اپنے کام مین بہت ماہر' آج کے پٹواری کو تو شاید فرد بھی تیار کرنا نہیں آتا۔گویا آج کے پٹواری کے ہاتھ میں قلم نہیں اور کلاشنکوف بھی نہیں' صرف پٹوار ہے جو اس کی طاقت بھی ہے اور اس کے وسیع اختیارات کی ضامن بھی۔

''لارڈ کرزن نے شاید اسی لئے پٹواری کو ''آل مائٹی'' کہا تھا''۔میں بول پڑا۔شفقت نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں' پٹواری واقعی قادر مطلق ہے۔ایک پٹواری کے اوپر جو تحصیلدار تھا' وہ پرانا سکہ تھا' قاعدے قانون کا پابند اور روایتی انداز کا دیانت دار بھی۔نائب تحصیلدار ایک ایم پی اے کا بگڑا ہوا بیٹا تھا۔وہ اس تحصیلدار سے بہت تنگ تھا کیونکہ وہ اس کے تصدیق کردہ انتقال خارج کردیا کرتا تھا۔پٹواری کی روایت ہے کہ میں نے نائب تحصیلدار کے کہنے پر نہ صرف اس کی دیانت داری کی دھول جھاڑی بلکہ ایک کیس میں اسے پھنسا دیا۔ایم پی اے کی سفارش پر وزیر مال نے اسے جبری ریٹائر کروادیا۔تھوڑی سے پنشن ملی جس میں اس کا گزارہ نہیں ہوتا تھا۔''میں دل کا بہت نرم ہوں''۔پٹواری نے کہا ''میں اس کے گھر گیا اور ''آفر'' کی کہ اگر سر! چاہیں تو آپ میرے سٹاف میں شامل ہو سکتے ہیں۔میں آپ کو معقول تنخواہ دوں گا''۔میں نے شفقت سے پوچھا ''کیا اس شریف آدمی نے پٹواری کی آفر قبول کرلی؟'' وہ بولے ''پٹواری نے تو یہی کہا تھا' خدا جانے سچ بولتا ہے یا جھوٹ۔یوں بھائی جی! ایک دیانت دار شخص کا یہ انجام تو ہونا چاہیئے؟'''' واقعی نہیں ہونا چاہیئے۔انشاءاللہ بہت جلد زمانہ بدلے گا''۔میں نے جواب دیا لیکن مجھے اپنی آواز میں یقین کی پختگی محسوس نہ ہوئی۔

ایسا معلوم ہوا جیسے میں اپنے آپ سے جھوٹ بول رہا ہوں!

2 جون 2000ء

آئینے کو لپکا ہے

میر تقی میر کا ایک شعر درج ذیل ہے۔

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

اس شعر کی تشریح لازمی ہے' اگرچہ خدشہ ہے کہ اس طرح یہ کالم کچھ ادیبانہ اور کچھ معلمانہ بن جائے گا۔ جن ادب نواز قارئین کو شعر کا چسکا ہے' وہ تو اس سے ضرور محظوظ ہوئے ہوں گے۔ عام قاری کی خدمت میں عرض ہے کہ میر صاحب اس شعر میں اپنی وفاداری کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میری نگاہوں کا مرکز تو ایک ہی شخص ہے' البتہ آئینے کو پریشاں نظری کی چاٹ لگ گئی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر آن اس میں کسی نئے چہرے کا عکس پڑتا رہے یعنی وہ ایک چہرے پر قانع نہیں رہا۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ اپنے پاگل پن کے دوران وہ چاند میں اسی ایک چہرے کو دیکھتے رہے' شاید انہوں نے اسی ایک چہرے کو اپنے آئینہ قلب میں عکس بند کرلیا تھا۔ غالب نے اس کیفیت کو دماغ کے خلل کا نام دیا ہے اور میر تقی میر خود بھی اس کا ابطال کرتے ہیں' فرماتے ہیں۔

تاکنا جھانکنا کبھو نہ گیا
دل سے شوق رخ نکو نہ گیا

''رخ نکو'' سے مراد ''خوبصورت چہرہ'' ہے۔ لفظ ''کبھو'' (کبھی) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر انہوں نے خاصی کہولت بلکہ پیرانہ سالی کے عالم میں لکھا' کبھی انہیں چاند میں جو چہرہ نظر آیا کرتا تھا' اب انہیں! اس چہرے کو ہر چلمن کے عقب میں تلاش کرنا پڑ رہا تھا۔

لیکن تاکنا جھانکنا ایک معیوب فعل بھی تو ہے' کاش وہ آج کے زمانے میں پیدا ہوتے۔ علامہ اقبال نے جس بے حجابی کے دور کا استقبال ان الفاظ میں کیا تھا۔ کہ ''عام دیدار یار ہوگا''، ہم اس سے کئی فرسنگ آگے چلے گئے ہیں۔ اب ''عام دیدار یار'' کے لئے کسی گلی بازار میں

بھی نہیں جانا پڑتا۔ بس ٹیلی ویژن آن کر کے بیٹھ جایئے' گلی بازار خود آپ کے پاس چلے آئیں گے۔ میں نے چلمن اور حجاب کا دور بھی دیکھا اور بے حجابی کا بھی۔ فلم بھی دیکھی اور سٹیج ڈرامہ بھی لیکن آئینہ دل کو پریشان نظری کا لپکا نہ لگنے دیا۔ اب اپنی پیرانہ سالی کے دور میں کھلے بندوں اعتراف کرتا ہوں کہ میں پریشان نظری کا شکار ہو چکا ہوں۔ جو وقت مجھے مصلے پر گزارنا چاہئے تھا وہ میں ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ کر گزارتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ مجھے ڈرامہ دیکھنے کا بہت شوق ہے جب تک ڈرامہ ڈرامہ رہا' میں چہروں سے زیادہ کہانی اور کردار پر نظر رکھتا لیکن جب سے ہمارا ٹیلی ویژن کمرشل ہوا ہے لمبے لمبے اکتا دینے والے سیریز کا رواج بڑھ گیا ہے۔ اور ڈرامے میں کوئی مزہ نہیں رہا۔ کل چینل پر ایک سیریل کی چھیاسویں قسط بھی دیکھی۔ میں اسے ''رولا گولا'' سیریل کہتا ہوں جس میں تین چار خواتین بھونڈے انداز میں شور مچاتی ہیں اور اسے مزاح کا نام دیا جاتا ہے۔

تقریباً ہر سیریل میں ایک جیسی کہانی ہوتی ہے' اور ایک جیسے مکالمے مثلاً اب مجھے حسینہ معین اور اصغر ندیم سید کے مکالموں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اور چہرے بھی ایک جیسے یعنی اتنے جانے پہچانے کہ انہیں بار بار دیکھنے کی ہوس باقی نہیں رہتی مثلاً ماریہ واسطی اور سعدیہ امام کو اتنے سیریلز میں بار بار دیکھا ہے کہ مجھے ماریہ واسطی' سعدیہ امام اور سعدیہ امام' ماریہ واسطی معلوم ہونے لگی ہیں۔

یہ سیریل اشتہارات کے سہارے چلتے ہیں۔ کبھی مجھے اشتہارات کی کثرت پر اعتراض تھا اور ایک کالم میں نے ''ڈرامہ کم اور اشتہارات زیادہ'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈرامہ اور بھی کم اور اشتہارات اور بھی زیادہ ہو گئے۔ اتنے زیادہ کہ اب میں اشتہارات دیکھنے کیلئے ڈرامہ دیکھتا ہوں۔ اس ترقی معکوس کا ذمہ دار وہی آئینے والا لپکا ہے' ہر اشتہار میں کوئی نہ کوئی چہرہ نیا ہوتا ہے۔ اور اپنی سی ندرت کا حامل بھی مثلاً وہ چہرہ جو ایک جوان رعنا کے دانتوں کی چمک دیکھ کر اتنا مبہوت ہوتا ہے کہ ایک ستون سے ٹکرا جاتا ہے اور غش کھانے کی بجائے خوبصورت دانتوں کی نمائش اتنے حسین انداز سے کرتا ہے آئینے پر نقش ہو جاتا ہے کبھی لونگ کا لشکارا' مشہور تھا اب دانتوں کا لشکارا' شہرت پا رہا ہے لیکن استعاروں میں تذکیر و تانیث بدل گئے ہیں۔ لونگ کے لشکارے کا شکار ہیروئن ہوتی ہے۔ کپڑے دھونے والے پاؤڈروں کے ایک اشتہار میں جو حسینہ کپڑے دھو رہی ہوتی ہے وہ کہتی ہے ''اب نہیں چلے گا چکر'' اتنا حسین و جمیل فقرہ اس کے مقابل

کے ہیرو پر اتنا اثر کرتا ہے کہ وہ نہایت بھونڈے مگر والہانہ انداز میں ایک دو چک پھیریاں لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔وہ اشتہارات جن میں خوردنی تیل کو موضوع بنایا جاتا ہے ان میں ایک بوڑھا ضرور ہوتا ہے اور باقی اس کے بیٹے بیٹیاں پوتے اور پوتیاں ہوتے ہیں۔میز تلے ہوئے گوشت‘ پلاؤ‘ قورمے اور کبابوں‘ کی ڈشوں سے لدا ہوتا ہے۔وہ سبھی بزرگ کا اشارہ ملتے ہی ڈشوں پر یوں ٹوٹ پڑتے ہیں‘ جیسے کسی بوڑھے ببر شیر کا کنبہ اپنے شکار پر پل پڑا ہو۔اس منظر میں بھی کوئی نہ کوئی دلکش چہرہ ایسا ہوتا ہے۔جس کے دانتوں تلے مرغ کی ٹانگ ہوتی ہے اور پھر بھی آئینے میں نقش ہو جاتا ہے۔

اگر چہ یہ کالم صرف چہروں‘ تک محدود رہنا چاہئے تھا۔لیکن اس طرح اشتہارات سے پورا پورا انصاف نہ ہوسکتا اچھی بات کی تحسین لازمی ہے۔سچی بات تو یہ ہے کہ ان دنوں پی ٹی وی کے مختلف چینلوں پر لگنے والے سیریل نہ صرف یکسانیت بلکہ جمود کا شکار ہو چکے ہیں۔لیکن اشتہارات میں تنوع اور رنگارنگی میں اضافہ ہو رہا ہے موضوع نیا‘ کردار نئے‘ مکالمے چست‘ جن میں نہ فلسفہ آرائی ہوتی ہے نہ دانش وری کا اظہار‘ نہ رومان ہوتا ہے‘ نہ ارمان‘ کہانی ایک آدھ منٹ میں مکمل ہو جاتی ہے آغاز‘ انجام‘ نقطہ‘ عروج سب کچھ موجود‘ ادھر سیریل ہیں کہ شیطان کی آنت بن کر چھ چھ مہینوں پر مسلط ہو جاتے ہیں۔اور آخری قسط میں اگلے چھ ماہ کی کہانی مکمل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اور پھر بھی حسن تکمیل ندارد‘ اتنے عرصے میں سیریل کے سارے چہرے بوسیدہ اور عمر رسیدہ ہو جاتے ہیں۔چونکہ آئینے کی طرح مجھے نئے نئے تر و تازہ چہرے دیکھنے کا چسکا لگ گیا ہے۔اس لئے ان دنوں اشتہارات ہی میرے شوق پریشان نظری کا مداوا بن گئے ہیں۔”

زندہ باد پی ٹی وی“

8 جون 2000ء

ایک سفر کی روداد

28 اپریل کو ٹھوکر نیاز بیگ کے راؤنڈ اباؤٹ سے ہم چھ لین والی کشادہ سڑک پر آئے تو مشیر عباس نے پوچھا۔ ''کیا یہ موٹروے ہے؟'' نصیر عباس نے جو کار ڈرائیو کر رہا تھا جواب دیا'' نہیں! موٹروے کالا شاہ کاکو بائی پاس سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن سڑک کا اتنا حصہ بھی تعمیر کے اعتبار سے موٹروے سے کسی صورت کم نہیں''۔

مشیر عباس گذشتہ دس سال سے لندن میں رہتا ہے۔ اس نے انگلستان کی موٹرویز پر سفر کیا ہے اس نے اپنے ملک کی اس سڑک کو کسی صورت میں بھی یورپی موٹرویز سے کم نہ پایا۔ یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی وہ ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے میری طرف مڑ کر کہا۔'' ابا جان! اس سڑک پر ٹریفک بہت کم ہے موٹرویز پر تو بمپر سے بمپر ملے ہوتے ہیں'' میں نے جواب دیا بیٹا! ابھی ہم موٹروے کلچر تک نہیں پہنچے لیکن سڑک بہت ''سینک'' ہے جب تم راولپنڈی جاؤ گے تو دیکھو گے کہ قدم قدم پر منظر بدلتے ہیں۔ انشا اللہ! یہ سفید ہاتھی کبھی نہ کبھی صرف اپنا خرچ پورا کرے گا بلکہ ملک کو بہت وافر ریونیو بھی دے گا۔ مشیر عباس دو سال کے بعد پاکستان آیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ پاکستان میں جگہ جگہ نئی بستیاں بہت تعمیر ہو رہی ہیں۔ بلند و بالا عمارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں دولت بہت ہے جو اینٹ اور سیمنٹ کی صورت میں سر اٹھا رہی ہے اور پاکستان کے اخبار کہتے ہیں کہ حکومت کا خزانہ خالی ہے۔

دور دور تک گندم کے سنہری کھیتوں کی کٹائی ہو رہی تھی۔ گندم کے گٹھڑ (بھریاں) کھیتوں میں جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ویٹ تھریشر چل رہے تھے اور بھوسا اڑ رہا تھا کہیں کہیں جھلونگیاں باندھے ہوئے سلا چگنے والیاں بھی نظر آئیں البتہ کھلیان کہیں نہیں لگے تھے اور نہ ان پر پھلے چل رہے تھے۔ مجھے اپنا ناول ''میرا گاؤں'' یاد آ گیا ہے جسے البم بنا کر میں نے تصویروں کو محفوظ کر لیا تھا۔ میں نے دونوں بھائیوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے کہا'' اردگرد کے نظارے بھی تو دیکھو کیا تمہیں ان میں اپنا بچپن نظر نہیں آ رہا'' مجھے نہیں معلوم کہ وہ اپنے بچپن تک

پہنچے یا نہیں لیکن میں ضرور پہنچ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو ''پھلے'' پر بیٹھے ہوئے دیکھا میرے سر پر کھدر کا صافہ تھا اور دھوپ تیز تھی چک پھیریاں کھاتے کھاتے میں سو گیا تھا لیکن بیل دائرے میں گھوم رہے تھے۔

جب میری آنکھ کھلی تو کار جی ٹی روڈ کے کنارے پاپلر اور سفیدوں کے بخیل سایوں کے نیچے کھڑی تھی جو سمٹ کر ان کے تنوں سے لپٹ رہے تھے۔ کبھی یہاں شیشم کے گھنے سائے ہوتے تھے بڑے فیاض کشادہ اور مسافر نواز' ٹھوکر نیاز بیگ سے کالا شاہ کاکو کے بائی پاس تک سڑک کے دونوں کنارے درختوں سے خالی ہیں جب سڑک پر سایہ نہ ہو دھوپ بھی تیز ہو اور لو کے جھکڑ بھی چل رہے ہوں۔ اس پر سفر کرتے ہوئے اچانک جی اداس ہو جاتا ہے۔ جی ٹی روڈ پر نظاروں کی جو سکرین چلتی ہے وہ کناروں کی بے ہنگم آبادیوں کی وجہ سے کٹ پھٹ جاتی ہے۔ کہیں کہیں شٹالے' مکی یا جوار کے کسی سرسبز کھیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اور نوخیز پودوں کی خوشبو مشام نواز ہوتی ہے کہ کوئی آبادی آ جاتی ہے اور اڑتے ہوئے لفافوں کے ساتھ بدبو کے ریلے مسافر کا استقبال کرتے ہیں۔ راستے کی آبادیاں اتنی گنجان ہو چکی ہیں کہ جی ٹی روڈ ان میں بھنچی چلی جا رہی ہے بھنچے ہوئے دل میں کشادگی کا ایک لمحہ اس وقت آیا جب میں نے سوچا کہ اس سال گندم کا ''بمپر کراپ'' ملک کی تقدیر بدل دے گا۔

ننڈی پور کے ریسرچ سٹیشن سے آگے سفیدے کے درختوں کے نیچے جگہ جگہ بہت سے ڈبے پڑے ہوئے دیکھے۔ معلوم ہوا کہ یہ شہد کی مکھیوں کے ڈربے ہیں۔ میں حیران تھا کہ ان مکھیوں کو شہد کہاں سے ملتا ہوگا تب اچانک کٹے ہوئے کھیتوں میں ایک نہایت سرسبز کھیت نظر آیا تو میں سمجھ گیا کہ یہ سورج مکھی کا کھیت ہے۔ اس علاقے میں سورج مکھی بہت کاشت ہوتا ہے جب پودوں پر سنہری پھول لگیں گے تو مکھیاں ان پر منڈلائیں گی۔ رس چوسیں گی اور سنہری شہد ذخیرہ کریں گی اور انسان ان کی محنت کا ثمرہ ان سے چھین لے گا۔ میں نے مشیر عباس سے کہا ''ان نظاروں کو اپنی یادوں میں محفوظ کر لو کیا پتا جب تم اگلی بار آؤ تو تمہیں کھیتوں میں کمبائنا ہارویسٹر کام کرتے ہوئے نظر آئیں لیکن بہت سے کھیت مزدور تمہیں بے کار پھرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ اور سلا چگنے والیاں گرے پڑے خوشوں سے محروم ہو جائیں گے۔ اور کیا معلوم کسی چڑیا' فاختہ اور کبوتر کو بھی گرا پڑا دانہ نہ مل سکے'' ڈسکہ اب مکمل صنعتی شہر بن گیا ہے۔ البتہ اس کی منڈی میں آڑھت کی دکانوں میں سنہری گندم کے ڈھیر بھی دکھائی دے۔ ڈسکے کی صنعت زیادہ تر زراعت

سے وابستہ ہے۔ گھوئینکے سے آگے سڑک کے دونوں کناروں پر سپورٹس کا سامان بنانے والے کارخانوں کی خوبصورت عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو دبر جی ارائیاں تک چلا جاتا ہے۔ آڈہ، بیٹر، سدرہ بدرہ، پکی کوٹلی، میانی، سیداں والی، برج اور بٹر کے دیہات کی نہایت زرخیز زرعی زمین کو سیالکوٹ کا صنعتی زون نگلتا چلا جارہا ہے۔ کبھی نالا ''ایک'' میں بہت صاف ستھرا پانی بہتا تھا اور اب وہ ڈرینج بن چکا ہے اس کے کنارے لوکاٹ، امرود اور آڑو کے باغات ہوتے تھے جو کٹ چکے ہیں۔ نالا ایک کے پل سے جو بائی پاس شروع ہوتا ہے۔ وہ اب بائی پاس نہیں رہا کہ سیالکوٹ اس سڑک کے دونوں کناروں پر آباد ہو گیا ہے۔

اسی بائی پاس سے ہم سیدھے چھاؤنی میں جا داخل ہوئے چھاؤنی میں سول آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور کشادگی کی وہ فضا جس سے میرا بچپن اور لڑکپن مشن سکول سیالکوٹ چھاؤنی میں آتے جاتے مانوس تھے اب کم ہی محسوس ہوئی۔ میرے بیٹوں، ظہیر، صغیر، نصیر اور مشیر کو بھی کشادگی کی اس نعمت سے کچھ حصہ ضرور ملا تھا۔ چھاؤنی کی ٹھنڈک سڑک پر کہ جو کبھی بہت ٹھنڈی تھی اب بھی میں نے اپنے ماضی کی ٹھنڈک محسوس کی۔ نصیر عباس، اور مشیر عباس، بیہڑے کے ان درختوں کو تلاش کرنے لگے جو کبھی انہیں اور ان سے پہلے مجھے بھی سایہ مرحمت فرماتے تھے اور نیچے گرے بیہڑوں کی لذیذ گریاں بھی بیہڑے کے کچھ درخت اب بھی موجود ہیں۔

نالا ''پلکھو'' چھاؤنی اور میرے گاؤں بھڑتھ کے درمیاں حدّ فاصل ہے۔ اس کے پل پر چند لمحوں کے لئے نصیر عباس نے کار روکی اور مجھے یوں لگا جیسے سیالکوٹ شہر چھاؤنی کے اوپر سے گزرتا ہوا پلکھو کی حد کو پھلانگ گیا ہے۔ اور بھڑتھ، بھوتھ، کھروٹا اور رحیم پور کھچیاں ایک ہو گئے ہیں۔ توپ خانہ پلی سے سید پور، گوندل، اور مرالہ جانے والی سڑکوں پر کئی قسم کے کارخانے لگ گئے ہیں۔ جن میں نمایاں چمڑے کی جیکٹیں، رائیڈنگ سوٹس، اور دستانے بنانے والے کارخانے ہیں کچھ ٹینریاں بھی کام کرنے لگی ہیں۔ ٹینریاں میرا ماتھا ٹھنکا بھڑتھ اور اس کے مضافات کا پانی نہایت ٹھنڈا ہاضم اور شیریں ہے اور اب اس میں پولیوشن کے جراثیم داخل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ مزید براں سیالکوٹ کا صنعتی زون جموں وکشمیر کی ورکنگ باؤنڈری سے اب دواڑھائی میل دور رہ گیا ہے اور یہ امر بھی میرے لئے وجہ تشویش بن گیا تھا!!

14 جون 2000ء

نور پور کلاں میں شٹر ڈاؤن ہڑتال

پچھلے دنوں چاچا بوٹے کا خط آیا تھا کہ اس بار نور پور کلاں آئیں تو اپنے ساتھ چائے کی پتی کا ایک ڈبا ضرور لائیں کیونکہ ہٹی والے شیخ نے شٹر ڈاؤن ہڑتال کر دی ہے! جی چاہتا تھا کہ نور پور کلاں پہنچ کر ہٹی والے شیخ کی ہڑتال کا منظر دیکھوں لیکن اتنی سخت گرمی میں سفر کیسے کرتا۔ اس ہڑتال سے مجھے ایک اچھے کالم کی خوشبو بھی آ رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ شیخ نے ہڑتال کیوں کی؟ ہڑتال تو بڑی بڑی مارکیٹوں میں ہوئی تھی۔ ہماری بستی میں تو کسی سٹور پر تالا نہیں پڑا تھا۔

چاچا بوٹا کو لاہور آ کر تفصیل بتانی پڑی۔

معلوم ہوا کہ شیخ برکت اللہ نے عمر سیلیا کی کال پر ہڑتال نہیں کی تھی' بلکہ گاؤں والوں کے رویئے کے خلاف شٹر گرایا تھا۔ جن لوگوں کی گندم اپنے سال کے اخراجات سے وافر ہوئی ہے' وہ پاسکو والوں کے ہاں جا کر بیچ رہے ہیں۔ جن چھوٹے کاشتکاروں کے پاس فالتو گندم بہت کم ہے وہ اپنی چھوٹی موٹی ضروریات پوری کرنے کے لئے شیخ کی ہٹی پر تھوڑی کر کے بیچ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ساڑھے سات روپے کلو کے حساب سے تو انہیں پیسے نہیں دیتا بلکہ چھ ساڑھے چھ روپے بھی پورے نہیں دیتا۔ اپنی چیزوں کا بھاؤ از خود بڑھا تا رہتا ہے۔ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ تول میں بھی ڈنڈی مارتا ہے اور حساب کتاب میں بھی گاؤں کے غریب طبقے میں وہ ''اللہ راسی'' عورتیں بھی ہیں جنہوں نے چلچلاتی دھوپ میں گرا پڑا سٹہ چنا اور کوٹ کر سال چھ ماہ کے لئے گندم جمع کر لی۔ شیخ ان پر بھی رحم نہیں کھاتا۔ چاچا بوٹا کو ہر سال اس کی شکایتیں ملتی تھیں۔ لیکن وہ ٹال جاتا رہا لیکن جب سے اسے امید لگی ہے کہ نئے سیاسی سیٹ اپ میں وہ یونین کونسل کا ممبر بن جائے گا' اس نے غریبوں اور بے کسوں کی طرف داری شروع کر دی ہے۔ کچھ دخل اس میں بابو کرم دین سائیکل والے کا بھی ہے جس نے چاچا بوٹے کے ذہن میں بٹھا دیا ہے کہ شیخ برکت استحصالی طبقے کا نمائندہ ہے۔ ابھی تک 'استحصالی' کا لفظ چاچا لوٹے کی زبان پر نہیں چڑھا تاہم وہ اس کے معنوں سے خوب واقف ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس نے شیخ کی دوکان پر مستقل ڈیرا لگا

لیا ہے۔ یا پکٹنگ' شروع کر دی۔ وہ گاہک کو ساڑھے چھ روپے فی کلو دلواتا اور تول میں پلڑا نہ جھکنے دیتا۔ شیخ برکت کا باپ شیخ رحمت پرانی طرز کا اچھا آدمی تھا۔ مناسب نفع کماتا' غریب محتاج کا دید لحاظ بھی کرتا' مسجد کا چراغ وہی روشن رکھتا اور چٹائیاں بھی ڈلوا دیتا۔ ہر جمعرات کو سائیں کڑیاں والے کے مزار پر جا کر اکنی دونی والی خیرات بھی کرتا لیکن شیخ برکت نے صرف اپنا پیٹ بھرا۔ دکان پکی کروائی' گلی میں تجاوز کر کے پکا تھڑا بنایا۔ اس پر کرسیاں بنچ رکھے۔ سردیوں میں چائے اور گرمیوں میں شربت کا کاروبار بھی شروع کیا۔ کسی کارخیر کے لئے لوگ اس سے چندہ مانگنے آتے تو کاروبار میں مندے کا رونا روتا۔ یوں اس نے اپنی جوانی اور ادھیڑ عمر ایک دھوتی بنیان میں گزار دی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر مندے میں رہا ہے۔ مکان پکا بنوا لیا ہے لیکن آنگن خالی رہا ہے۔ ایک بھانجے کو اس نے لے پالک بنایا۔ وہ ایف اے پاس کر کے دکان پر آ بیٹھا۔ اس نے دکان پر شٹر لگایا اور ایک فریزر میں کوکا کولا' پیپسی وغیرہ کی بوتلیں بھی رکھیں۔ نور پور خورد چونکہ لاہور سے نزدیک ہے اس لئے بھانجے نے وہاں۔ ''ماماں بھانجا سپر سٹور'' کھول لیا ہے۔ اس کا رویہ بھی استحصالی ہے لیکن دھوتی بنیان والا استحصالی رویہ نہیں۔ کوئی میلا ٹھیلا ہو کبڈی کا کھیل ہو یا دنگل یا والی بال کا میچ' وہ گاؤں کے نوجوان طبقے کی مالی سرپرستی کرتا ہے اور انہیں خوش رکھتا ہے۔ اس رویئے میں اس کے کچھ سیاسی عزائم بھی شامل ہیں اور بابو کرم دین سائیکل والے نے اپنی بالغ نظری کی بنا پر انہیں بھانپ لیا ہے۔

بابو کرم دین نور پور کلاں آیا تو اسے معلوم ہوا کہ چاچا بوٹے نے '' پکٹنگ '' لگائی ہوئی ہے۔ وہ بھی دکان پر پہنچ گیا اور بنچ پر بیٹھ گیا۔ دونوں کو اکٹھے دیکھ کر شیخ برکت کو پسینے آنے لگے۔ تاہم اس نے بابو کرم دین کو شربت پانی کی بابت پوچھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بابو کرم دین اچانک بولا '' شیخ برکت! تمہیں معلوم ہے کہ تم استحصالی طبقے میں شامل ہو چکے ہو؟ اس نے پوچھا '' کیا مطلب ہے تمہارا بابو کرم دین؟ '' تم نے لوٹ مار میں حد کر دی ہے۔ کسی بیوہ کسی یتیم' کسی غریب' کسی محتاج کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ مسجد میں چراغی بھی نہیں ڈالتے؟ '' شیخ کے ہاتھ میں ترازو تھا' اس کا ہاتھ جو کانپا تو پلڑا جھک گیا لیکن اپنی طرف کا۔ جلد ہی اس نے اپنے حواس پر قابو پا کر ترازو کو تو سیدھا کر لیا پر منہ سے کچھ نہ بول سکا۔

'' تم نے اس گاؤں میں بہت کچھ کمایا۔ بتاؤ اس کا کتنا حصہ رفاہی کاموں پر صرف

کیا؟'' بابو کرم دین نے پوچھا'' شیخ نے کوئی جواب نہ دیا' تو بابو نے اپنی بات جاری رکھی'' الٹا تم نے گلی میں تجاوز کرلیا اور تم حکومت کو کوئی ٹیکس بھی نہیں دیتے'' شیخ برکت نے چمک کر کہا'' کون کہتا ہے میں ٹیکس نہیں دیتا؟ سال کے سال میری طرف سے ڈسٹرکٹ کونسل میں تم دو سو روپے جمع کرواتے ہو؟'' بابو کرم دین نے اپنے ترکش کا آخری تیر چھوڑا'' اتنے بڑے کاروبار کے صرف دو سو روپے سالانہ ٹیکس؟'' تمہاری'' ٹرن اوور'' دیکھ کر تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہیں جنرل سیلز ٹیکس لگنا چاہیے''

''جنرل سیلز ٹیکس'' شیخ برکت کی آواز گویا دوسری دنیا سے آئی۔ ترازو اس کے ہاتھ سے گر گیا اور گندم کے ڈھیر پر ڈھیر ہو گیا۔ ایک گاہک بڑھیا نے اسے پانی پلایا۔ ہوش میں آیا تو اس نے دکان کا شٹر گرادیا اور خانہ نشین ہو گیا۔ اس کا بھانجا نور پور خورد میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ماماں شٹر ڈاؤن ہڑتال سے گاؤں والوں کو زیر کرلے گا۔ گاؤں والوں کو خاص طور پر غریب طبقے کو نون' تیل' مرچ' مسالے' گڑ چینی کی بہت تکلیف ہو گئی۔ مٹی کے تیل کی گاؤں میں بہت کھپت ہے کیونکہ درخت کٹ جانے کی وجہ سے ایندھن کی قلت ہے اور گھر گھر تیل والے چولہے جلتے ہیں۔ لوگ چاچا بوٹے اور بابو کرم دین سائیکل والے کو کوسنے لگے کہ یہ سب کچھ ان کا کیا دھرا ہے۔ کچھ لوگوں کو ساتھ ملا کر اہل دیہہ کو راضی کیا گیا کہ گاؤں میں کواپریٹو سٹور کھول لیا جائے۔ یہ خبر بھانجے نے سنی تو وہ فوراً نور پور کلاں پہنچا۔ اس نے کہا کہ ہم تو گاؤں والوں کے خادم ہیں۔ میں'' شٹر اپ'' کراؤں گا لیکن ایک شرط پر کہ چاچا بوٹا اور بابو کرم دین ماماں جی سے کہہ دیں کہ فی الحال جنرل سیلز ٹیکس والا معاملہ ملتوی ہو گیا ہے۔

کل مجھے چاچا بوٹے کا جو خط ملا ہے اس میں تحریر ہے کہ شیخ برکت نے شٹر اٹھالیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ اب سے مسجد کی بجلی کا بل وہی ادا کیا کرے گا۔'' لیکن بیواؤں' یتیموں' غریبوں اور مسکینوں کے استحصال کے متعلق اس نے کیا وعدہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ چاچا بوٹے کے خط کے کسی لفظ نے بول کر میرے سوال کا جواب نہ دیا۔

21 جون 2000ء

اللہ میگھا دے

آج آسمان پر کچھ بادل چھائے ہیں' کچھ برسے بھی' لیکن کیا برسے؟ سمندر سے پیاسے کو شبنم کے چند قطرے ملے۔ البتہ موسم میں خنکی آ گئی ہے۔ کبھی انہیں ایام میں ہاڑ کی پہلی بارش ہوا کرتی تھی جسے پنجابی میں ''پہل چھلا'' کہتے ہیں۔ مجھے اپنے بچپن' لڑکپن اور جوانی کے کئی ''پہلے چھلے'' یاد آتے ہیں۔ آسمان پر یکا یک بادل چھا جاتے' غیظ میں آیا ہوا آفتاب کسی کالی بدلی کا نقاب اوڑھ لیتا اور لو کے چلتے جھکڑ تھم جاتے۔ اچانک تڑ تڑ موٹے موٹے قطرے گرتے اور جلتی بلتی مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی۔ پھر موسلا دھار بارش ہوتی اور گاؤں کے گلی کوچے ندی نالے بن جاتے۔ اس کے بعد کچھ دن بارش کے بغیر گزر جاتے اور پھر خلیج بنگال سے اٹھنے والی پانی سے لدی پھندی ہوائیں ہمالیہ کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی کوہ قراقرم تک پہنچ جاتیں۔ اور ٹکرا کر لوٹتیں تو ہم کہتے بادل ٹلہ بالناتھ سے آ رہا ہے۔ پھر اتنی مہلت بھی نہ ملتی کہ بھینس کو کلے سے کھول کر دالان میں لایا جا سکے۔ گویا ساون لگ جاتا۔

لیکن اب جہاں زمانہ بدلا ہے قدرت کا نظام بھی بدل گیا ہے۔ اب پہلے چھلے نہیں پڑتے۔ اب مون سون ہوائیں اپنی چھاگل میں خلیج بنگال کا پانی بھر کر نہیں لاتیں' اب تو ہوا کا دباؤ کم یا زیادہ ہونے سے بارشیں ہوتی ہیں۔ فی الحال میدانوں اور صحراؤں کے لئے یہی پیشین گوئی ہے کہ موسم گرم اور خشک رہے گا اور بلوچستان' تھرپا کر اور چولستان کو کوئی نوید نہیں ملی کہ وہاں کی مخلوق کے ترسے ہوئے ہونٹوں پر آب حیات کا کوئی قطرہ ٹپکنے والا ہے اور میں آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بار بار کہتا ہوں ''اللہ میگھا دے!'' اور تب مجھے چند آیات یاد آ جاتی ہیں:

''خدا ہی وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ تو وہ بادلوں کو اڑائے اڑائے لئے پھرتی ہیں۔''

''پھر وہی بادل کو جس طرح چاہے' آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور کبھی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے''۔

''پھر تم دیکھتے ہو کہ بوندیاں اس کے درمیان سے نکل پڑتی ہیں۔ جس پر چاہتا ہے' برسا

دیتا ہے۔تو وہ لوگ خوشیاں منانے لگتے ہیں۔ اگر چہ یہ لوگ ان پر نازل ہونے سے پہلے بالکل مایوس تھے“۔(سورہ روم۔پارہ 21 آیات 49,48)

ان آیات میں ایک الوہی مژدہ ہے‘ان کے لئے جو”بالکل مایوس“ ہو چکے ہیں۔ہاڑ کی یہ پہلی بارش پیش خیمہ ہے ان ہواؤں کا جو خلیج بنگالہ سے روانہ ہو چکی ہیں اور بادلوں کو اڑائے اڑائے پھر رہی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب ان کی چھاگل سے زمین کی پیڑی جمے ہونٹوں پر پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ کریں گی اور خشک پہاڑوں کے چشمے ابل پڑیں گے‘ کنویں بھر جائیں گے‘ تالاب پر ہو جائیں گے‘ کاریزیں جاری ہو جائیں گی‘ چوٹیوں سے رود ہائے کوہی دندناتی ہوئی آئیں گی اور جل تھل ہو جائے گا۔گھاس زمین کی عریانی کو ڈھانپ لے گی۔صحرا میں سبزہ ہی نہیں‘ پھول بھی کھلیں گے۔سیب اور انار کی خشک شاخوں پر سبز پتے آئیں گے اور پھر اپنے موسم میں کمی پورے پر سرخ پھول کھلیں گے اور کسی پر سفید اور اللہ کی مخلوق کو پانی ملے گا تو ان کے چہرے تروتازہ ہو جائیں گے۔

گزشتہ تین سالوں سے بلوچستان کے اکثر علاقوں‘ سندھ کے کچھ اضلاع مثلاً تھر پار کر اور پنجاب کے چولستان کے آسمان بادلوں سے مسلسل خالی نظر آرہے ہیں‘ یا بادل آتے ہیں تو اوپر ہی اوپر سے بن برسے گزر جاتے ہیں۔کبھی سکول میں جغرافیے کے استاد بتایا کرتے تھے کہ مون سون کا ایک لشکر بحیرہ عرب سے بھی اٹھتا ہے اور وہ سندھ اور بلوچستان کے اوپر سے گزر کر کوہ قراقرم سے آٹکراتا ہے اور خلیج بنگالہ سے آنے والے لشکر میں شامل ہو جاتا ہے۔جی چاہے تو سندھ کے اوپر کہیں کہیں چھلک جاتا ہے لیکن بلوچستان کا کوئی اونچا پہاڑ نہیں آتا کہ اس کی پانی سے بھری یلغار کو روک سکے۔کبھی ہزاروں سال پہلے یہ ہوائیں بلوچستان کے کسی اونچے پہاڑ سے ٹکرا کر اپنی چھاگلیں بلوچستان کی سرزمین پر خالی کر دیا کرتی تھیں۔پھر کوئی ایسی موسمی تبدیلی آئی کہ ان کا رخ ذرا سا بدل گیا۔

تو میری دعا ہے کہ اے اللہ! اس لشکر ربانی کے رخ کو پھر ذرا سا بدل دے‘ زاویے کا ایک درجہ ہی سہی‘ تو اپنے قانون کا تابع نہیں اگر چہ تو کسی کے لئے اپنا قانون نہیں بدلتا۔اس سال سے یہ قانون بدل دے اور ہوا کے دوش پر یہ مژدہ لکھا ہوا دکھائی دے کہ بحیرہ عرب سے اٹھنے والی مون سون ہواؤں نے سندھ اور بلوچستان کی مردہ زمینوں کو زندہ کر دیا ہے۔آمین!

مجھے معلوم ہے کہ بہت سی تدبیریں تو نے بندوں پر چھوڑ دی ہیں۔ وہ بارش نہیں برسا

سکتے لیکن اس پانی کو تو ذخیرہ کر سکتے ہیں جو دریاؤں کے راستے سمندر میں جا گرتا ہے۔ ہم نے بلوچستان میں کوئی تالاب نہیں بنایا۔ ٹوٹی ہوئی کاریزوں کی کبھی مرمت نہیں کی۔ کنویں نہیں کھودے۔ ٹیوب ویل نہیں لگائے۔ کسی رود کوہی کے آگے بند نہیں باندھا۔ چولستان کی طرف کوئی نہر بہا کر نہیں لے گئے۔

ہمارا ہمسایہ ہے کہ بتدریج ہمیں کوہ ہمالیہ سے جنم لینے والے دریاؤں کے پانی سے محروم کرتا چلا آ رہا ہے۔ راوی، بیاس اور ستلج تو ہم نے اس کے قبضہ ءاقتدار میں دے دیے ہیں۔ اب وہ ہمیں چناب اور جہلم کے پانیوں سے بھی محروم کرنا چاہتا ہے۔ لے دے کے ایک سندھ ہمارے پاس باقی رہ گیا ہے۔ اگر اس پر اب تک کالا باغ ڈیم بن گیا ہوتا تو سندھ کی سرزمین کا کوئی ٹکڑا پانی کو نہ ترستا اور کوئی نہر تھرپار کر بھی سیراب کر رہی ہوتی۔ 2000-2001 کے بجٹ میں تو کالا باغ ڈیم کا نام سننے میں نہیں آیا اور یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ پانی کا مسئلہ حل کرنے کے لئے موجودہ حکومت نے کالا باغ ڈیم کا کون سا نعم البدل تلاش کر لیا ہے۔ اور کچھ تو نہیں پہلی حکومتوں کی طرح قوم کو کوئی ''سبز باغ ڈیم'' ہی دکھا دیا جاتا۔

اللہ کرے کہ خوانین چارسدہ کا دل ہی پسیج جائے۔ انہوں نے بھی ٹیلی ویژن پر بلوچستان اور سندھ کی خشک سالی کے منظر دیکھے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے دل پتھر کے نہیں اور بعض پتھروں سے تو شیریں چشمے بھی پھوٹ نکلتے ہیں!

6 جولائی 2000ء

دو وفادار خواتین

ظاہر ہے کہ پاکستان کی دو وفادار خواتین سے میری مراد بے نظیر بھٹو اور کلثوم نواز ہیں۔ دونوں کے لئے میرے دل میں نرم گوشہ موجود ہے۔ یوں اس کالم کا عنوان ''پاکستان کی دو شیر دل خواتین'' بھی ہو سکتا ہے لیکن پاکستان میں شیر دل خواتین تو اور بھی بہت سی ہیں۔ مثلاً عاصمہ جیلانی اور جگنو محسن، عاصمہ جیلانی تو سال کے سال واہگہ اٹاری بارڈر پر جا کر پاکستان اور ہندوستان کی سرحدوں پر خط تنسیخ پھیر آتی ہیں اور اس خوشی میں ''ککلی'' ڈالتی ہیں۔ میں ان کی حق تلفی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

بے نظیر بھٹو اور کلثوم دونوں اپنے شوہر نامدار کی وفادار بلکہ عاشق زار ہیں لیکن ابتداء زمانہ سے بے نظیر بھٹو کی وفاداری میں کچھ 'دودھ پینے والے مجنوں' کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اردو بولتے ہوئے تذکیر و تانیث کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتی ہیں۔ مثلاً انہیں لیلیٰ نظر آتا ہے اور مجنوں نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان کا لیلیٰ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہے اور وہ علامہ اقبال کے ایک مصرعے کے مطابق کہ ''مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے'' صحرا تو نہیں ایک شہر چھوڑ کر ایک اس سے بڑے شہر کے جنگل میں گم ہو گئی ہے جسے لندن کہا جاتا ہے اور وہاں کسی عافیت کدے سے اپنی وفاداری کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔

دونوں وفادار خواتین کے خاندانی و ثقافتی پس منظر میں بہت فرق ہے۔ بے نظیر جدی پشتی وڈیروں کی شیر دل بیٹی ہیں اور کلثوم نواز کی جد پشت میں وڈیرا کوئی نہیں۔ نامی گرامی پہلوان ہیں لیکن دونوں سیاست اور حکومت کو اپنا موروثی حق جانتی ہیں۔ دونوں وطن کی محبت کا دم بھرتی ہیں لیکن پانی اپنے نصف بہتروں کا۔ دونوں نے اپنے وطن کی محبت کو اپنے ذاتی غم کے تابع کر دیا ہے جو خاصی فطری سی بات ہے۔ ذات اور فطرت سے بلند اور ماورا ہونا کمزور انسان کے بس کی بات نہیں۔ دونوں پڑھی لکھی ہیں۔ ایک آکسفورڈ یا کیمبرج کے کسی کالج سے فارغ التحصیل ہیں اور دوسری ایف سی کالج لاہور سے۔ بے نظیر بھٹو انگریزی فر فر بولتی ہیں اور یورپ اور امریکہ کی

یونیورسٹیوں اور کلبوں میں ان کی انگریزی کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔اس دھاک کا ہدف بیچارہ ’’پاکستان‘‘ بنتا ہے۔وہ اردو بھی بول لیتی ہیں۔کلثوم نواز کی انگریزی میں نے نہیں سنی۔

دونوں کے نصف بہتر زیر حراست ہیں۔اس لئے وہ ’ہم درد‘ بھی ہیں۔کلثوم نواز کے ساتھ بے نظیر کا کوئی بہناپا نہیں تھا کیونکہ ان کا سرتاج ان کے سرتاج کا قیدی تھا اور ایک بار ظالم پولیس نے ان پر اتنی سختی کی تھی کہ درد کی شدت سے انہوں نے اپنی زبان کاٹ لی تھی۔ایسی صورت میں بھلا بہناپا کیا خاک ہوتا؟ لیکن انقلاب زمانہ دیکھئے کہ اب وہ ایک دوسری کی طرف خواہرانہ ہاتھ بڑھا رہی ہیں۔دونوں مل کر بقول ان کے ایک ’غاصب‘ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہیں۔بے نظیر بھٹو نے نواز شریف کے دور اقتدار میں کئی بار اپنی ’عوام‘ کو پکارا تھا لیکن لبیک کی کوئی مضمحل سی آواز بھی جواب میں نہ اٹھی تھی۔کلثوم نواز نے مسلم لیگ کے شہسواروں اور جیالوں کو کال دی تو آزمائے ہوئے دست و بازو کندھوں سے اوپر بلند نہ ہو سکے۔اب وہ بھی مایوس ہو کر ’’عوام‘‘ کو کال دینے کا سوچ رہی ہیں۔فی الحال تو صرف پیر بنیامین رضوی اور کرامت اللہ نیازی نے ہاتھ کھڑے کئے ہیں۔تاحال کلثوم نواز وفاداری بشرط استواری میں بے نظیر بھٹو سے کہیں آگے ہیں۔ وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان کا دکھ نیا نیا ہے۔بے نظیر بھٹو کا دکھ پرانا ہو کر گھس پٹ گیا ہے۔انہیں عدالت کے ایک فیصلے نے پانچ سال کے لئے اپنے محبوب کے ساتھ یکجائی کا موقع فراہم کیا تھا۔لیکن وہ لندن کی عافیت بخش فضاؤں کو چھوڑ کر پاکستان نہیں آنا چاہتیں۔بچے بھی ان کے خوردسال ہیں اور کسی بھائی کا سایہ بھی ان کے سر پر نہیں۔ایسی افتاد خدا کسی دشمن پر بھی نہ ڈالے۔لیکن کلثوم نواز کا بڑا بیٹا بھی تو پس دیوار زنداں ہے۔غم ان کا بھی بہت شدید ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ایک خبر چھپی تھی کہ آصف زرداری اپنی ائر کنڈیشنڈ قید سے اتنا تنگ آچکے ہیں کہ اپنا سارا مال و متاع قومی خزانے میں جمع کرانے کو تیار ہیں۔بے نظیر کی طرف سے اس پیشکش کی تائید نہیں ہوئی۔انہوں نے اپنے اپنے خفیہ خزانوں کے کوڈ نمبر دینے کا کوئی اعلان نہیں کیا۔شاید انہیں امید ہے کہ کوئی غیبی طاقت انہیں پاکستان میں لا کر اس کی ’’ڈوبتی کشتی‘‘ کی پتوار ان کے ہاتھ میں تھمانا چاہتی ہے۔حالانکہ قدرت دوبار یہ پتوار ان کے ہاتھ میں تھما کر ان کی ناخدائی کو آزما چکی ہے۔یوں جب سے ان کے ہاتھ سے یہ پتوار چھنی ہے انہوں نے یورپ اور امریکہ کے گلی کوچوں میں بیچارے مظلوم پاکستان کی تشہیر بھی بہت کی ہے۔وہ اپنی محرومیوں اور دکھوں کا پاکستان سے انتقام لیتی ہیں تو میرا دل دہل جاتا ہے۔ابھی کلثوم نواز اس منزل پر نہیں

پہنچیں۔ناتجربہ کاری کی وجہ سے کوئی ایسا ویسا جملہ ان کی زبان سے نکل جاتا ہے تو پھر اس کی تردید کر دیتی ہے البتہ وہ یہ سمجھتی ہیں کہ پاکستان کی تقدیر نواز شریف سے وابستہ ہے۔ وہی اس کے نجات دہندہ بن سکتے ہیں۔ تاہم انہوں نے نواز شریف کی رہائی کے لئے شریف خاندان کی دولت قربان کرنے کا کبھی کوئی عندیہ نہیں دیا۔ انہیں خود یہ تمنا نہیں کہ پاکستان کی وزارت عظمیٰ انہیں سونپ دی جائے۔(یوں وہ آہستہ آہستہ مسلم لیگ کی قائم مقام صدارت کی طرف بڑھ رہی ہیں) دل میں ان کے بھی یہی خیال ہے کہ حکومت موروثی ہوتی ہے اور بھٹو خاندان کی طرح شریف خاندان بھی حکومت کے لئے پیدا ہوا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے' کلثوم نواز کی رگوں میں ماں کی طرف سے رستم زماں گاماں مرحوم کا خون موجزن ہے' اس لئے کبھی کبھی وہ دھمکی بھی دیتی ہیں کہ فوجی حکمران عزت سے بیرکوں میں واپس چلے جائیں تو بہتر ہے ورنہ ...... ورنہ ہم ان کے خلاف ملک گیر تحریک چلائیں گے۔ پچھلے دنوں انہوں نے پاکستان کے ایک ٹیکس خور اور قرض نادہندہ استحصالی طبقے کی شٹر ڈاؤن ہڑتال کی حمایت کی لیکن افسوس کہ عوامی تائید حاصل نہ ہونے کی وجہ سے شٹر پھر اپ ہو گئے ہیں۔ بے نظیر نے احتجاجاً دوپٹہ سر سے اتار دیا ہے۔ جینز بھی پہننے لگی ہیں اور تسبیح ان کی وزارت عظمیٰ کو نہ بچا سکے تو ''گھڑ بی بی'' بننے کا فائدہ؟ ہمارے ملک کی بدنصیبی ہے کہ جب تک کسی شخص کو حکمرانی حاصل رہے اس کی نیک اور اور حلال کی کمائی کی باز پرس نہ ہو وہ ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے مارتا ہے اور اگر حکومت چھن جائے یا مال کے چھننے کا اندیشہ ہو تو اس کے لئے خدانخواستہ پاکستان مردہ باد ہو جاتا ہے۔ بے نظیر بھٹو اس منزل پر پہنچ چکی ہیں لیکن شکر ہے کہ ابھی کلثوم نواز کے لب و لہجے میں پاکستان ''زندہ باد'' محسوس ہوتا ہے لیکن وفاداری ان کی بھی پاکستان سے زیادہ اپنے اسیر و بے بس نصف بہتر سے ہے۔

11 جولائی 2000ء

یو ایف او اور این جی او

کبھی ہم ''یو ایف او'' کا ترجمہ اڑن طشتری کرتے تھے۔ کتنا رومانٹک ترجمہ تھا! انہی دنوں ایسی نیم سائنسی فلمیں بھی کثرت سے بنتی تھیں جن میں ایک اڑن طشتری زمین پر اترتی اور اس سے سبز رنگ کی ایک پستہ قد نہایت کریہ المنظر غیر ارضی مخلوق برآمد ہوتی۔ اس مخلوق کو ''ایلی انز'' کہا جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں ماتھے پر لگی ہوتیں۔ ہم اس اڑن طشتری کو ''یو ایف او'' سمجھتے اور کبھی اس کے معنوں پر غور نہ کیا۔ ایک عرصے بعد معلوم ہوا کہ یہ تو ''آن آئی ڈینٹی فائیڈ آبجیکٹس'' کا مخفف ہے۔ یعنی وہ چیزیں جن کی شناخت نہ ہو سکی۔ اس کے باوجود اس مخفف میں کچھ اسرار باقی رہا۔

کبھی سائنس دانوں کا خیال تھا کہ کوئی غیر ارضی مخلوق ہم سے ہم کلام ہونے کے لئے ہمیں سگنل بھیجتی رہتی ہے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ یہ سگنل کائنات کے ان نیوٹران سیارچوں کی طرف سے آتے ہیں جو نبض کی طرح ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔ ''یو ایف او'' کا اڑن طشتری والا پراسرار امیج اس وقت پاش پاش ہوا جب معلوم ہوا کہ امریکہ کا ادارہ ناسا خلائی تسخیر کی راہ ہموار کرنے کے لئے کچھ سیارچے خلا میں بھیجتا رہا ہے' جو اڑن طشتری سے مشابہ تھے۔ اڑن طشتری کے موضوع پر ناول لکھے گئے اور کچھ لوگوں نے اپنے چشم دید واقعات بیان کئے کہ انہیں خلائی مخلوق سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ انہیں خلائی مخلوق اڑن طشتری پر بٹھا کر اپنے سیارے کی سیر و سیاحت کے لئے گئی۔ غالب اس زمانے میں زندہ ہوتے تو وہ بھی کسی اڑن طشتری کا مہمان بننے کی خواہش رکھتے کہ:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

زمین پر رہ کر انہیں ''کواکب'' کی بازی گری کا جو تجربہ حاصل ہوا تھا اس کی تصدیق ساتویں آسمان پر جا کر ہو جاتی کہ:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

گزشتہ دنوں ایک اور مخفف ''این جی او'' کو بہت فروغ ملا۔ اس کے ساتھ کوئی رومانٹک تصور تو وابستہ نہیں ہوا البتہ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی کوئی ''بازی گر'' قسم کی چیز ضرور ہے کہ جس کے پیچھے کوئی اسرار چھپا ہوا ہے۔ حال ہی میں معلوم ہوا کہ یہ ''نان گورن مینٹل آرگنائزیشن'' کا مخفف ہے۔ یعنی وہ تنظیمیں جن کا تعلق حکومت سے نہیں۔ ''یہ تو میرے دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف موجود ہیں۔'' میں نے سوچا یہ اڑن طشتریاں ان رفاہی اداروں کا نام ہیں جو نظر تو کچھ اور آتے ہیں اور اندر سے کچھ اور ہیں اور ان پر جو مخلوق سوار ہے اس کی آنکھیں اس کے ماتھے پر دھری ہوتی ہیں اور ان پر ایک ایسا چشمہ بھی لگا ہوا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ غیر ارضی معلوم ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ پاکستان کے بہت سے لوگوں کا گزارہ این جی اوز پر ہے۔ صرف گزر اوقات ہی نہیں، بنگلے بھی استوار ہوتے ہیں اور کاریں بھی فراٹے بھرتی ہیں۔ یہ مخلوق نظر آتی۔ ان دنوں البتہ کچھ مخلوق ''آئی ڈینٹی فائی'' ہوئی ہے۔ ہمارے معطل سیاست دان کہتے ہیں کہ موجودہ حکومت این جی اوز کی ہے۔ ایک وزیر کی این جی او نے 28 مئی کو پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کے خلاف مظاہروں میں شرکت کی۔ اخبار تو کہتے ہیں کہ عاصمہ جیلانی جس کے برتے پر ہندوستان جا کر ککلی اور لڈی ڈالتی ہیں وہ بھی ایک ''این جی او'' ہی ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن برملا کہتے ہیں کہ جس حکومت میں صیہونی این جی اوز کام کر رہی ہوں، اسے دینی مدارس کی چار دیواری کے اندر جھانکنے کی جرات کیوں ہو۔ حکومت پوچھتی ہے کہ ان مدارس کو اتنا فنڈ کہاں سے ملتا ہے کہ مولوی حضرات پجارو پر اڑے پھرتے ہیں اور ان کے دائیں بائیں آگے پیچھے مسلح باڈی گارڈ ہوتے ہیں۔ ایسی شان سے تو کبھی راجوں مہاراجوں کی سواریاں نکلا کرتی تھیں۔

اکثر این جی اوز عوام کے چندے پر چلتی ہیں۔ آج سے آٹھ دس سال پہلے فٹ پاتھوں پر ریڈ کراس اور انسداد تپ دق والے ادارے انعامی ٹکٹ فروخت کرتے تھے۔ ''سیف گیمز'' نے بھی کروڑوں کے ٹکٹ بیچنے اور کمپیوٹر پر انعامات نکالے اور ٹی وی پر ان کی تشہیر کی۔ بعد میں اس پر خورد برد کے بہت سے الزامات لگے اور جلد ہی خورد برد ہو گئے۔ ایک مارکیٹ کی ایک دکان پر ایک رفاہی ادارے کا بورڈ لگا دیکھا۔ اندر دو تین کھڈیاں کھٹ کھٹ چل رہی تھیں جن کے سامنے دو تین لڑکے سٹول پر بیٹھے ہوئے ہاتھ پیر چلا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ معذور ہیں۔ اس کے

باہر بھی لاٹری کے ٹکٹ بیچے جا رہے ہیں۔ کچھ دنوں بعد میں نے دیکھا کہ وہاں کڑاہی گوشت کی دکان کھل گئی ہے۔ دکاندار سے پوچھا کہ رفاہی ادارہ کدھر گیا تو اس نے جواب نہ دیا۔ پاس کھڑا ایک لڑکا بولا ''بابا جی! جنہوں نے رفاہی ادارہ کھولا تھا کہ انہیں پٹرول پمپ لگانے کی اجازت مل گئی ہے۔'' میں نے پوچھا ''ان بیچارے معذور لڑکوں کا کیا بنا جو کھڈیوں پر بیٹھے ہوئے تھے؟'' لڑکے نے ایک آنکھ میچ کر مسکراتے ہوئے کہا ''ان میں سے ایک آپ کے سامنے کھڑا ہے بابا جی!''

لوگ کہتے ہیں کہ ''ایدھی فاؤنڈیشن'' بھی ایک طرح کی این جی او ہے۔ مولانا عبدالستار ایدھی نے جب اس کا آغاز کیا تھا تو ان کے سر پر جو ٹوپی تھی اور ان کے جسم پر جو کپڑے تھے، وہی اب تک ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے کپڑے بدل لئے ہیں لیکن ٹوپی نہیں بدلی۔ وہ خستہ حال سے درویش ہیں، جو مال روڈ پر کھڑے ہو کر چندہ (اور بقول ان کے بھیک) مانگتے ہیں تو نوٹوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں لیکن اب وہ کار سے اترتے ہیں تو ہیلی کاپٹر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ شوکت خانم میموریل کینسر ہسپتال بھی ایک ایسا ہی رفاہی ادارہ ہے جو چندے پر چلتا ہے۔ کیا اسے بھی این جی او کہا جا سکتا ہے؟ اس کے انداز دریوزہ گری میں سلطانی' کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ کبھی عمران خان چندہ اکٹھا کرنے کی مہم پر نکلتے تھے تو شہزادوں کے انداز میں ان کا جلوس نکلتا تھا اور بچے، جوان اور بوڑھے ان پر نوٹوں کی بارش کرتے تھے۔ میں ان دونوں اداروں کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ میں تو صرف ان ''این جی اوز'' کی ماہیت دریافت کرتا چاہتا ہوں، جن کی طرف مولانا فضل الرحمان اشارے کرتے رہتے ہیں!

19 جولائی 2000ء

پانچ کلے نہری اور دس گھماؤں بارانی زمین

جب ٹیلی ویژن پر یہ خبر سنی کہ پنجاب کے بجٹ میں پانچ کلے نہری زمین اور دس گھماؤں بارانی زمین پر زرعی ٹیکس لگ گیا ہے تو میرے پاؤں تلے کی گز بھر زمین سرک گئی کہ مجھے آئندہ بجٹ میں اس پر بھی ٹیکس لگنے کا خطرہ محسوس ہوا۔

میں پانچ نہری کلوں کے مالکوں سے بھی واقف ہوں اور دس گھماؤں بارانی زمین کے مالکوں سے بھی۔ بجٹ میں زمین کی تیسری کیٹگری کا ذکر نہیں۔ اسے کبھی چاہی زمین کہا کرتے تھے' اب اسے ٹیوب ویل سیراب کرتے ہیں اور باران رحمت بھی۔ مجھے معلوم ہے کہ پانچ کلے نہری اور دس کلے بارانی کے مالک اس کی آمدنی سے اپنے کنبے کی کفالت نہیں کر سکتے۔ وہ دن رات محنت کرتے ہیں تو انہیں روٹی مل جاتی ہے لیکن وہ بچوں کو تعلیم نہیں دلوا سکتے۔ جس گاؤں میں پرائمری سکول ہے' وہاں بھی وہ اپنے بچوں کی کتابوں' کاپیوں اور پنسلوں کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ جن حضرات نے یہ بجٹ بنایا ہے' وہ پانچ کلے نہری اور دس گھماؤں بارانی زمین کے گھرانوں کا بجٹ بنا کر دکھا دیں۔ عام طور پر مشہور تھا کہ نہری علاقوں میں گزارہ یونٹ کو گھٹا کر اس سطح پر لایا گیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ بجٹ بنانے والے سب شہری بابو تھے جنہیں کبھی دیہات میں جانے کا اتفاق بھی نہیں ہوا ہو گا اور یوں بھی بیچارہ کسان تو تالاب کی مچھلی ہے کہ جسے نہایت آسانی سے ٹیکس نیٹ میں پھنسایا جا سکتا ہے!

ستم یہ ہے کہ جس کے پاس تین ایکڑ باغ ہے' وہ بھی زرعی ٹیکس سے نہیں بچ سکا۔ فرض کیجیے' اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی زمین نہ ہو تو کیا تین ایکڑ کا باغ اس کے گھر کی کفالت کر سکتا ہے کہ اس پر زرعی ٹیکس بھی لگا دیا جائے!

ذوالفقار علی بھٹو نے تو ساڑھے بارہ ایکڑ زمین کا مالیہ بھی معاف کر دیا تھا جو بعد ازاں بحال ہو گیا۔ کیا پانچ ایکڑ زمین کا مالیہ معاف ہے؟ یا دس ایکڑ بارانی زمین کا بھی؟ نہری زمین پر آبیانہ بھی تو ایک قسم کا ٹیکس ہی ہے۔ چلیئے! اسے ٹیکس شمار نہ کریں لیکن پانی سستا ضرور ملتا ہے' مفت

میں تو نہیں ملتا۔ پھر زرعی ٹیکس کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ زرعی ٹیکس صرف بڑے زمینداروں پر لگنا چاہئے۔ اس سے وہ غریب نہیں ہوں گے۔ عیاشیوں میں کچھ فرق ضرور آ جائے گا کوئی بات نہیں کہ جس زمین پر وہ کوئی محنت نہیں کرتے' اس کے بیشتر ثمرات ان کے حصے میں آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ حصہ اگر رفاعہ عامہ پر خرچ ہو جائے تو ممکن ہے کہ اس کا ثواب ان کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جائے! قرآنی حکم تو یہ ہے کہ دولت کو صرف ''بین الاغنیا'' گردش میں نہیں رہنا چاہئے!

ان کے برعکس پانچ کلے نہری زمین اور دس گھماؤں بارانی زمین کا مالک کھائے گا کیا اور ٹیکس کے لئے بچائے گا کیا؟ اگر ایک طرف گندم کی فی من قیمت میں اضافہ ہوا ہے تو دوسری طرف چینی' چائے' گھی' مٹی کے تیل اور دوائیوں کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ بجلی کے بلوں میں بھی اضافہ ہونے والا ہے۔ آئندہ کپاس اور دھان کی فصل کے لئے کھاد اور کیڑے مار دوائیں بھی گراں قیمت پر دستیاب ہوں گے۔ چھوٹے کسان کی کمائی میں تو ساجھی بھی بہت ہے۔ نائی' موچی' لوہار' ترکھان' مراثی' ڈوم ڈھاڈی' فقیر فقرے سبھی اس کے کھلیان میں اپنا فصلانہ وصول کرتے ہیں۔ جب وہ منڈی میں پہنچتا ہے تو آڑھتی اسے تین سو روپے فی من قیمت ادا نہیں کرتا اور تولا ڈنڈی مار کر ایک من سے ایک دو کلو ضرور مار لیتا ہے۔ پھر پٹواری' سپاہی' زرعی فیلڈ ورکر' نہر کے بیلدار اور پنسال نویس وغیرہ کو بھی تو اس نے خوش کرنا ہوتا ہے۔ اور سیئر اور ایس ڈی او (نہر) تحصیلدار اور ضلعدار کا نام جان بوجھ کر میں نے نہیں لیا کہ وہ بڑے آدمی ہیں۔

نور پور کلاں کے میرے عزیز دوست چاچا بوٹے کی دس ایکڑ نہری زمین دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے چار ایکڑ موٹر وے کے اس طرف ہیں اور پانچ ایکڑ ادھر۔ ایک ایکڑ موٹر وے میں آ گیا ہے۔ کچھ زمین تھور اور سیم کی زد میں بھی ہے۔ اس کا ایک بیٹا ادھر کاشتکاری کرتا' ایک ادھر' دونوں بال بچوں والے ہیں۔ زمین چاچا بوٹے کے نام ہے۔ اب اسے چار سو پچاس روپے زرعی ٹیکس ادا کرنا پڑے گا۔ اگرچہ یہ اس کے لئے فخر کی بات ہے کہ وہ اپنے سابق ایم پی اے سے جو سالانہ پانچ سو روپے سالانہ انکم ٹیکس ادا کرتا ہے' صرف پچاس روپے پیچھے رہ گیا ہے لیکن اسے اپنے سب سے بڑے پوتے کو آٹھویں جماعت سے اٹھوانا پڑے گا کہ گھر کا بجٹ متوازن کرنے کے لئے شہر میں جا کر محنت مزدوری کرے۔

ایسے ہی میرے آبائی گاؤں کے ایک نمبر دار چودھری احمد دین کو بھی زرعی ٹیکس ادا کرنے کا اعزاز حاصل ہو گیا ہے وہ دس بار گھماؤں بارانی زمین کا مالک ہے۔ اس نے ٹربائن بھی

لگوائی ہوئی ہے اور گندم اور دھان کاشت کرتا ہے۔ بظاہر وہ کھاتا پیتا کسان ہے لیکن اسے بھی اپنے ایک پوتے کو سکول سے اٹھوا کر شہر کے کسی کارخانے میں بھیجنا پڑے گا کہ فٹ بال سینا سیکھے اور گھر کا بجٹ متوازن کرے۔ اگر چاچا بوٹا اور چودھری احمد دین کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ ان پر افتاد پڑنے والی تو وہ اپنے بیٹوں کے نام زمین لکھوا دیتے جیسا کہ زرعی اصلاحات کے خوف سے اکثر بڑے زمیندار کرتے ہیں لیکن وہ دونوں بہت محب وطن ہیں۔ انہوں نے تو زرعی ٹیکس کے خلاف ہڑتال کا بھی کبھی نہیں سوچا۔ تاہم چاچا بوٹے کا خیال ہے کہ اتنی تھوڑی زمین پر ٹیکس اس لئے لگا ہے کہ اس سال گندم کی فصل بہت اچھی ہوئی ہے اور حکمرانوں کی نیت میں فتور آ گیا ہے' اس بادشاہ کی طرح جس نے ایک کسان کے باغ میں پھلوں سے لدے ہوئے ہرے بھرے درخت دیکھے تھے اور اس پر ٹیکس لگا دیا تھا۔ اگلے سال اجڑا ہوا باغ اور چیتھڑے لگے کسان کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پوچھا تو کسان نے جواب دیا کہ بادشاہ کی نیت میں فتور آ گیا تھا۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو لیکن دل ہی دل میں میں بھی بہت ڈر رہا ہوں کہ ایک فصل سے دوسری فصل تک کئی ناگہانی آفتیں منہ کھولے کھڑی ہوتی ہیں۔ پانی کی کمی' پانی کی زیادتی' سنڈیوں کا حملہ' ٹڈی دل' جڑی بوٹیوں کی بہتات' کھاد کی مہنگائی اور جعلی دوائیاں اور کاشتکار کی بے دلی اور فصل سے فصل تک کا فاصلہ بھی تو بہت ہوتا ہے۔

28 جولائی 2000ء

بجٹ سے پہلے اور بجٹ کے بعد

بجٹ سے پہلے بھی میری وہی پنشن تھی، جو بجٹ کے بعد ہے۔ گویا بجٹ نے میری صحت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ اچھا نہ برا یوں بھی یہ ایک متوازن بجٹ ہے جس میں گھاٹا ہوتا ہے نہ وادھا، میں اپنی صحت قائم رکھنے کے لئے جو دوائیں خرید تا ہوں ان کی قیمتیں تا حال نہیں بڑھیں یا جتنا بڑھنا تھیں، وہ بجٹ سے پہلے بڑھ چکی ہیں۔ ''وینٹا ئڈ ان ہیلر'' کی قیمت بجٹ سے پہلے بھی دو سو سات روپے بارہ پیسے تھی اور اب بھی دو سو سات روپے بارہ پیسے ہی ہے۔ کچھ دوائیں جان بچانے کے لئے ہوتی ہیں۔ کچھ جان بنانے کے لئے۔ ''ان ہیلر'' جان بچانے والا یا سانس کو چلتا رکھنے والا آلہ ہے۔ اور خمیرہ گاؤ زبان عنبری جواہر والا جان بنانے کی اکسیر ہے۔ اس کے کھانے سے کم از کم حافظہ ضرور تیز رہتا ہے مثلاً میں کل رات سے یاد کر رہا تھا کہ رحمٰن مذنب مرحوم کا اصل نام کیا ہے۔ آج صبح دس گرام خمیرہ کھایا تو ان کا نام یاد آ گیا۔ یعنی مفتی عزیز الرحمٰن مفتی عزیز الرحمٰن مرحوم حکیم بھی تھے صرف ان معنوں میں کہ ڈاکٹر انور سدید میرے اور اپنے لئے حکمت کی آڑ میں ہزار بارہ سو کے خمیرے دواخانہ حکیم اجمل خان سے منگوایا کرتے تھے جس پر ہمیں بیس فیصد کمیشن مل جاتا تھا۔ وہ ہر مہینے ہم دونوں کے لئے اپنے خوبصورت خط میں پرچیاں لکھتے تھے جن سے خمیروں کے علاوہ ان کی محبت کی خوشبو بھی آیا کرتی تھی۔ یہ خدمت ان کے فرزند سعید مفتی شکیل سر انجام دیا کرتے تھے۔ وہ خدمت جاری رکھنے کو تیار ہیں لیکن ہم نے ان کی پیشکش شکریہ کے ساتھ نامنظور کر دی ہے اب ہم اپنے اپنے طور پر بازار سے خمیرے خریدتے ہیں اور بیس فیصد زیادہ ادا کرتے ہیں لیکن اس میں بجٹ کا کچھ قصور نہیں قصور رحمٰن مذنب کا ہے۔ وہ پردہ پوش ہو گئے اور حکیم مفتی عزیز الرحمٰن کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

بات بجٹ کی ہو رہی تھی اگر اس طرح بات سے بات نکلتی رہی تو کالم الم غلم ہی میں ختم ہو جائے گا تو آمدم بر سر مطلب میں اکثر سوچتا ہوں کہ بجٹ سے پہلے اور بجٹ کے بعد کے درمیان میں بھی کچھ ہونا چاہئے۔ خواہ وہ بہت کم ہی کیوں نہ دیکھتا ہو سوچ سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا

کہ دونوں کے درمیان میں بھی ''بجٹ'' ہی ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے ''توازن'' کا نام دیا جاسکتا ہے جو بہت کم محسوس ہوتا ہے کہ بجٹ کے اربوں کھربوں کے صفر شمار کرنے ہی میں بجٹ کا ایک سال گزر جاتا ہے۔ تاہم اتنا تو وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بجٹ سے پہلے بھی سب اچھا ہوتا ہے اور بجٹ کے بعد بھی سب اچھا ہی ہوتا ہے۔ جو صورت حال بجٹ سے پہلے ہوتی ہے وہی صورتحال بجٹ بنانے والوں کی نگاہ میں بجٹ کے بعد بھی ہوتی ہے۔ یعنی بجٹ میں کوئی نیا ٹیکس نہیں لگتا۔ اگر لگتا ہے تو وہ پہلے ٹیکس میں معمولی ردوبدل کا نام پاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے عوام قطعی متاثر نہیں ہوں گے لیکن جب مزدور تندور پر جاکر معمول کی دو روٹیاں کھاتا ہے تو اس کی سیری نہیں ہوتی وہ شکایت کرتا ہے تو تندور والا کہتا ہے ''یار! نیا بجٹ بھی تو آ گیا ہے کیا کرتا آٹے کی مقدار کم کرنی پڑی۔ قیمت تو وہی دو روپے ہے'' مزدور بیچارہ اب اسے ''روٹی نہیں پاپا'' کہتا ہے۔

بجٹ سے پہلے مجھے امید تھی کہ پنشن میں دس فیصد اضافہ ہوگا لیکن میں ''طول امل'' کا کبھی شکار نہیں رہا اور نہ اٹھہتر سال کی عمر کو نہیں پہنچتا۔ اضافہ نہیں ہوا تو ٹھیک ہے نہیں ہوا۔ اضافہ ہو بھی جاتا تو کیا ہوتا۔

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

پنشن خوار ہی ہوتا اس رجائیت پسندی میں میرے توکل یا استغنا کو کچھ زیادہ دخل نہیں۔ اصل میں میں پنشن میں اکیلا ہوں جو بیچاری اس میں حصہ دار تھی وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔ بال بچوں کی ذمہ داریوں سے کب کا فارغ ہو چکا ہوں پنشن کا جتنا حصہ کٹوایا تھا' وہ بحال ہو چکا ہے۔ پنشن بھی معقول ہے سترھویں گریڈ کی پہلے سال کی ماہوار تنخواہ سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ میں جس بیٹے کے ہاں رہتا ہوں' وہ ماشاءاللہ میری پنشن سے بے نیاز ہے۔ آٹے دال کا بھاؤ اسے معلوم ہو گا یا میری بہو کو۔ میں کبھی کبھار پوچھتا ہوں تو ٹال دیتے ہیں۔ چنانچہ میری ''بورڈنگ اینڈ لاجنگ'' مفت ہے۔ خدمت اور محبت اس پر مستزاد۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنے دوا دارو کے لئے کسی سرکاری ہسپتال کا محتاج نہیں لیکن کتنے پنشن خوار ہیں' جو میری طرح خوش قسمت ہیں۔ بجٹ کے بعد کا حال ان سے پوچھنا چاہئے جو اپنی قلیل پنشن میں اب بھی ایک پورے کنبے کی پرورش پر مجبور ہیں۔

ابھی بجٹ کا نیا سال شروع ہوئے ایک مہینہ بھی نہیں گزرا اخبار کہتے ہیں کہ مہنگائی میں اضافہ ہو گیا ہے لیکن میرے لئے ابھی وہ غیر مرئی اور غیر محسوس سا ہے کیونکہ اس بجٹ سے پہلے اشیا

منڈیوں سے غائب نہیں ہوئیں جیسا کہ اکثر ہوتا رہا ہے۔ اگرچہ چینی کبھی مہنگی کبھی سستی ہوتی رہی ہے وجہ یہ ہے کہ اشیاء غائب کرنے والے اپنی ہی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ٹیکس سروے ٹیم اپنا جال لئے ان کے پیچھے دوڑ رہی ہے اور وہ آگے آگے بھاگ رہے ہیں۔ تھک جاتے ہیں تو شٹر گرا کر ان کے پیچھے بیٹھ جاتے ہیں۔ ٹیکس سروے ختم اور شٹر اپ ہونے دیجئے۔ پھر بجٹ سب کو دکھائی بھی دینے لگے گا اور محسوس بھی ہوگا۔ بجٹ جنہیں زیادہ توڑتا مروڑتا ہے' انہیں عرف عام میں "عوام" کہا جاتا ہے۔ چونکہ عوام' بے زبان ہوتی ہے یا ہوتے ہیں اس لئے حکومت انہیں بہت عزیز رکھتی ہے خواہ وہ سیاست دانوں کی حکومت ہو یا غیر سیاست دانوں کی چونکہ حکومت ان کا بہت خیال رکھتی ہے' اس لئے قربانیاں بھی انہیں سے طلب کرتی ہے۔ عوام کو امید تھی کہ اس سال اللہ نے ہمیں گندم بہت دی ہے' اس لئے آٹا سستا ہوگا کیونکہ فصل اچھی ہو تو نرخ بھی ارزاں ہو جاتے ہیں لیکن ہوا اس کے الٹ۔ جتنا گندم میں اضافہ ہوا' اس سے کہیں زیادہ آٹے کی فی کلو قیمت بھی بڑھ گئی۔ لیکن عوام نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔

مجھے ذاتی طور پر ہلہ کا دہی بہت پسند ہے بجٹ سے پہلے اس کا چار سو گرام کا گلاس ۱۷ روپے میں ملتا تھا' بجٹ کے فوراً بعد ۲۱ روپے کا ہو گیا۔ غصہ تو بہت آیا لیکن چار روپے فاضلہ ادا کر کے بھی غصے کو لسی بنا کر پینا پڑا۔ اسی طرح خمیروں کی قیمت میں بھی انشاء اللہ ضرور اضافہ ہوگا۔ خمیرہ جو قدرے طاقت بنائے رکھتا ہے' اس کی روزانہ خوراک میں کچھ کمی کرنی پڑے گی۔ تاہم ایک فرد کی طرف سے کہ جو عوام کا نمائندہ ہے' قومی بجٹ کو متوازن رکھنے کے لئے کوئی اتنا بڑا ایثار بھی نہیں!

8 اگست 2000ء

ایک لے پالک بچہ

۱۱ جون ۲۰۰۰ء کے نوائے وقت میں ایڈمنسٹریٹر بلدیہ عظمیٰ لاہور کی طرف سے اخبار کے صفحے کے چوتھائی حصے پر محیط ایک اشتہار چھپا ہے جس میں محبّ وطن' مخیّر اور صاحب حیثیت شہریوں اور اداروں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ بلدیہ عظمیٰ کے شانہ بشانہ کام کر کے شہریوں کو پسماندگی سے نجات دیں اور انہیں بہتر شہری سہولتیں فراہم کریں۔

اشتہار کی پیشانی پر انفاق فی سبیل اللہ والی آیت کا ترجمہ بھی درج ہے۔ ذرا نیچے' اس آیت کی تشریح بھی ہوئی ہے ''جنہیں باری تعالیٰ نے اپنی نعمتوں سے نوازا اور وطن عزیز نے صاحب حیثیت بنایا' انہیں اپنا مال اور وسائل معاشرے کی بہبود کے لئے بھی خرچ کرنے چاہئیں''

اس اشتہار کو پڑھ کر ایک عرصے تک پریشان سا رہا کہ وہ بلدیہ عظمیٰ جس کے سربراہ کو کبھی ''لارڈ میئر'' کہا جاتا تھا' خدانخواستہ اتنی ہی غریب ہوگئی ہے کہ دریوزہ گری پر اتر آئے' خدا کرے کہ ایسا نہ ہو' پر لگتا تو ایسا ہی ہے۔ جس بلدیہ کے ممبر کبھی بلدیہ کے خرچ پر ملکہ کہسار مری میں ہفتوں جشن منایا کرتے تھے اس پر یہ افتاد کہ اپنی رفاہی اداروں کو چلانے سے بھی قاصر ہوگئی ہے اور مخیّر حضرات سے مدد کی طالب ہے۔ بلدیہ عظمیٰ کو چار شعبوں میں ''باہمی اشتراک'' کی ضرورت ہے۔

۱۔ شعبہ صحت ۲۔ شعبہ تعلیم' ۳۔ شعبہ سماجی بہبود ۴۔ شعبہ صفائی۔

شعبہ صحت' شعبہ سماجی بہبود اور شعبہ صفائی میں اتنی گنجائش ضرور موجود ہے کہ مخیّر حضرات یا ادارے ثواب بھی کما سکیں اور کچھ مادی فوائد بھی حاصل کر سکیں یا دھن دولت کی میلی چادر کو دھو کر صاف کر سکیں۔ البتہ مجھے امید نہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ آئے بڑھ کر کہے کہ میں شعبہ تعلیم کے لئے حاضر ہوں ''کوڑا کرکٹ اٹھانے وٹھکانے لگانے کے عوض میں'' پرائیویٹ فرم یا ادارہ یا این جی او شہریوں سے وصول کردہ فیس میں حقدار ہو سکتی ہے لیکن شعبہ تعلیم میں معاونت کے لئے ایسی کوئی سنہری پیش کش نہیں کی گئی۔ اشتہار کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

''بچوں کی تعلیم وتربیت میں حصہ لینا عین عبادت کی سعادت ہے جہالت کے خاتمہ اور بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے اور بلدیہ عظمیٰ لاہور کے سکولوں کو معیاری اور خود کفیل بنانے کے لئے شہریوں اور غیر سرکاری فلاحی تنظیموں کی معاونت اور مشاورت درکار ہے۔اس کے لئے مخیر حضرات اور ایسی غیر سرکاری وفلاحی تنظیمیں جولاہور میں بلدیہ کے سکولوں کے انتظام وانصرام سنبھال سکنے اور سکولوں کو اچھی درسگاہ اور تربیت گاہ بنانے کا جذبہ رکھتی ہوں آگے آئیں۔ بلدیہ عظمیٰ کے ''لے پالک'' سکول ''اڈاپٹ اے اسکول پروگرام'' سے یقیناً وہ مقاصد پورے ہوگے جن سے بچوں کی نصابی وغیر نصابی سرگرمیاں اجاگر ہوسکتی ہیں''

اللہ کرے کہ یہ اشتہار کچھ مخیر حضرات اور فلاحی اداروں کی نظر سے گزر جائے' وہ آگے بڑھیں اور بلدیہ عظمیٰ کی کسی سکول کو ''اڈاپٹ'' کرلیں۔اس کا نام ''لے پالک سکول'' ہوگا۔میں نے عنوان میں اسے ''لے پالک بچہ'' لکھا ہے۔لے پالک بچہ بالعموم لاوارث بچہ ہوتا ہے یا وہ بچہ جس کی ماں باپ کو اس کی ضرورت نہ ہو۔معلوم ہوتا ہے کہ بلدیہ عظمیٰ تعلیم کا چھدا اپنے سر سے اتار پھینکنا چاہتی ہے۔انگریز کے زمانے میں ہائی سکول تک کی تعلیم کا زیادہ تر بوجھ ''لوکل سیلف گورنمنٹ'' کے کندھوں پر تھا اور وہ اپنا فرض بخوبی نبھاتی رہی۔اعلیٰ تعلیم صوبائی حکومتوں کی تحویل میں تھی۔کچھ ہائی سکول بھی صوبائی حکومتوں کے ماتحت تھے اور یہ نمونے کے سکول ہوتے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی ایک عرصے تک یہ نظام چلتا رہا۔ذوالفقار علی بھٹو نے تعلیم کو نیشنلائز کر لیا تو لوکل سیلف باڈیز کے کندھے ہلکے ہوگئے۔میں حیران ہوں کہ بلدیہ عظمیٰ لاہور کے سکول نیشنلائز کیوں نہ ہوئے ورنہ بلدیہ عظمیٰ کو اب یہ بوجھ اتارنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

موجودہ حکومت کا ارادہ ہے کہ ڈسٹرکٹ کونسلوں اور میونسپل کمیٹیوں کے نظام کی تجدید کی جائے اور ہائی سکول تک کی تعلیم ان کے سپرد کردی جائے۔مجھے اس میں بھی تعلیم کی لاوارثیت اور لے پالکیت والی کیفیت صاف محسوس ہورہی ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ تعلیم کس کا ''بے بی'' ہے؟ جس کا ''بے بی'' ہے اسے ہی اس کی نگہداشت وپرداخت کرنا ہوگی۔آج سے چودہ سو سال پہلے جنگ بدر کے بعد جب مکے کے کچھ پڑھے لکھے قیدیوں کا فدیہ اس صورت میں لیا گیا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں' تو یہ اصول طے ہوگیا تھا کہ تعلیم حکومت کا ''بے بی'' ہے مسلمانوں نے اپنے دور عروج بلکہ دور زوال میں بھی کبھی اسے ''لاوارث'' نہیں چھوڑا تھا۔لیکن پچھلی نصف صدی سے پاکستان میں تعلیم کا شعبہ لاوارث ہی نظر آتا ہے۔بالخصوص عوامی تعلیم سے غفلت کیشی کا

اظہار ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔ جن سکولوں کو بلدیات چلایا کرتی تھیں' اب حکومت کی تحویل میں ہیں۔ خاص طور پر پرائمری سکول جن کی حالت زار کا اندازہ انہیں دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے پھر یہ سکول بھی آبادی میں اضافے کا ساتھ نہیں دے رہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ آبادی بڑھ رہی ہے اور سکول گھٹ رہے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اب تک آٹھویں جماعت تک کی تعلیم ہر فرد کیلئے لازمی ہوتی لیکن ہوا یہ ہے کہ اس جدید دور میں بھی کسانوں اور مزدوروں کے سکول جانے والی عمر کے اکثر بچے سکول سے محروم ہیں۔ لاہور کی کچی آبادیوں' اندرون لاہور کی تنگ گلیوں اور مضافات میں زیر تعمیر بستیوں کا اگر سروے کیا جائے تو معلوم ہو سکے گا کہ کتنے بچے ہیں جو ناخواندگی کے اعداد و شمار میں غرق ہو رہے ہیں۔

دیہات میں تو حالت کہیں زیادہ خراب ہے۔ پنجاب کو ایک ترقی پسند/صوبہ کہا جاتا ہے اس میں بھی تعلیم صرف اپر مڈل اور لوئر مڈل طبقوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ نجانے بلوچستان کی تعلیم پسماندگی کس درجے پر ہے۔ اس سال کے وفاقی اور صوبائی بجٹوں میں بھی مجھے تعلیم کے سلسلے میں کوئی خوشخبری نہیں ملی۔ کون ہے جو اس لاوارث بچے کو لے پالکی کی آغوش عاطفت میں پروان چڑھا سکنے کو تیار ہو؟ مجھے تو ایسی کوئی این جی او نظر نہیں آتی جو اتنا غیر منفعت بخش کاروبار کرنے کیلئے تیار ہو اور وطن عزیز کے صاحب حیثیت حضرات تو ابھی شٹر ڈاؤن اور شٹر اپ ہڑتال ہی سے فارغ نہیں ہوئے!

19 اگست 2000ء

مجھے ان پر رحم آتا ہے

رحم تو مجھے اپنے آپ پر بھی آتا ہے لیکن کچھ بین الاقوامی شخصیات ہیں جن پر اپنے آپ سے بھی زیادہ رحم آتا ہے اور ان میں سرفہرست یاسر عرفات ہیں۔ یاسر عرفات اب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ کبھی ایک باغی لیڈر کی حیثیت سے ان کی بہت دہشت تھی' زیادہ تر اپنوں پر۔ وہ حریت فکر و عمل کے ایک چلتے پھرتے سمبل تھے۔ کوئی ملک ان کے قبضے میں نہیں تھا لیکن رویہ ان کا حکمرانوں والا تھا۔ عرب حکمران ان کی دامے درمے بہت خدمت کرتے تھے۔

تاہم ٹھکانہ انہیں کہیں نہیں ملتا تھا۔ کبھی یہاں' کبھی وہاں۔ اچانک ہما ان کے سر پر آ بیٹھا اور انہیں فلسطین میں ایک چھوٹی سی نقطہ نما ریاست کا سربراہ بنا دیا گیا۔ ان کے سر پر تاج تو نہ رکھا گیا لیکن سربراہی کی کرسی انہیں ضرور مل گئی لیکن اس پر بیٹھنا انہیں نصیب نہیں ہوتا۔ میں جب بھی دیکھتا ہوں' وہ مذاکرات کی میز پر بیٹھے ہوتے ہیں یا مذاکرات کی میز کی طرف جاتے ہوئے یا وہاں سے آتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی ٹیلی ویژن پر جو تصویر اکثر نظر آتی تھی' اس میں وہ دنیا کے واحد سپرمین اور اس کے ایک چیلے کے ساتھ دکھائی دیتے تھے جسے سپرمین نے دنیائے عرب بلکہ دنیائے اسلام کو سیدھا رکھنے کے لئے فلسطین پر مسلّط کیا ہوا ہے۔ وہ اسرائیل کا سربراہ کہلاتا ہے۔ آج کل اس کا نام ''ایہودا بارک'' ہے۔ ہمارے ہاں بھی ''بارک اللہ'' نام کہیں کہیں سنائی دیتے ہیں۔ نام اس کا کچھ بھی ہو' مجھے تو وہ امریکی اور یہودی استعمار کا سمبل نظر آتا ہے' برکت کا سمبل تو قطعی نہیں۔

کوئی ضرورت نہیں کہ سپرمین کا قد بہت اونچا ہو' لیکن موجودہ سپرمین بہت اونچے قد کاٹھ کا آدمی ہے۔

سپرمین کا چیلا درمیانے سے قد کا ہے اور یاسر عرفات قد بت کے لحاظ سے بھی کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ تینوں میں سب سے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ سپرمین بار بار نہایت مربیانہ انداز میں ان کی کمر کے گرد بازو حمائل کر کے انہیں قطار میں لے آتا تھا۔ گویا ''سوئے قطار

می کشم ناقہ ء بے زمام را'' یاسر عرفات اپنے بڑھاپے کی وجہ سے یا'' ایاز! قدر خود بشناس'' والے زریں مقولے پر عمل کرتے ہوئے قدم سے قدم نہیں ملاتے تھے۔ دراصل معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ''ہف'' گئے ہیں۔

''ہفنا'' ایک پنجابی مصدر ہے جس کا متبادل مجھے اردو میں نہیں مل رہا۔ ''ہفتے'' کیوں نا؟ ایک مدت سے وہ قدم سے قدم ملانے کی کوشش میں مصروف ہیں لیکن کامیاب نہیں ہو رہے۔ وہ شخص جو سانس کی تکلیف میں مبتلا ہو اسے آپ اپنے ساتھ لے کر چلیں تو آپ کو ''ہفنے'' کے معنی سمجھ میں آ جائیں گے۔ یعنی سانس کی تکلیف میں مبتلا آدمی آپ کو ہفا دکھائی ہی نہیں بلکہ سنائی بھی دے گا۔ یہی حال یاسر عرفات کا ہے۔ جب سے وہ امریکہ داد فلسطینی ریاست کے سربراہ بنے ہیں' انہیں سانس لینے ہی نہیں دیا گیا۔ مجھے تو خطرہ ہے کہ کہیں اس بطل جلیل کو ہفا ہفا کر مرحوم نہ بنا دیا جائے۔ اس صورت میں وہ مذاکرات کی میز کے پہلے شہید قرار دیئے جائیں گے۔

آج کل بین الاقوامی تنازعات طے کرنے کے لئے مذاکرات پر بہت زور دیا جاتا ہے بلکہ ان کا واحد حل مذاکرات کو سمجھا جاتا ہے۔ مجھے تاریخ عالم میں ایک بھی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا کہ جس میں مذاکرات کی میز نے کوئی بڑا معجزہ دکھایا ہو۔ مذاکرات کی میز کے متعلق عام محاورہ تو یہی سننے میں آیا ہے ''نشستند و گفتند و برخاستند''۔ یہ اور بات ہے کسی شکست خوردہ قوم کو مذاکرات کی میز پر پابجولاں لایا گیا اور اس سے امن کے معاہدے پر دستخط کروالئے گئے۔

دنیا کی دونوں بڑی جنگوں کے بعد جرمنی کے گلے میں طوق ڈال کر اسے مذاکرات کی میز پر بٹھایا گیا تھا اور اس کی شرمناک حد تک تذلیل کی گئی تھی۔ دور کیوں جائیں معاہدہ تاشقند ہی کو دیکھ لیں کہ کس طرح مذاکرات کی میز پر ایک جیتی ہوئی بازی کو ہرا دیا گیا۔ عراق کا حال دیکھ لیں۔ اس کی زبوں حالی کا سب سے بڑا مجرم خود عراق کا صدر ہے جو بدستور شاہانہ کروفر کے ساتھ تخت حکومت پر متمکن ہے اور اس کی قوم عقوبت کی چکی میں پس رہی ہے۔ اسے کچھ نہیں کہا جاتا کہ اگر وہ منظر سے ہٹ گیا تو پھر امریکہ کے پاس عربوں سے تاوان وصول کرنے کا کون سا جواز باقی رہ جائے گا۔

امریکہ چاہتا ہے کہ بیت المقدس پر کسی نہ کسی صورت میں یہود کا قبضہ برقرار رہے۔ بیچارے یاسر عرفات بہت بڑے امتحان میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ اگر امریکہ کی مرضی پر عمل کرتے ہیں تو پوری دنیائے عرب میں ''نکو'' بن جائیں گے۔ نہیں کرتے تو امریکہ کی سرپرستی سے محروم ہو

جائیں گے۔ تاہم کیمپ ڈیوڈ کی سربراہ کانفرنس انجام پذیر ہوگئی ہے۔ سپر مین ناکام لوٹا ہے۔ وہ یاسر عرفات پر خوش تو نہیں گیا ہوگا۔ اگر یاسر عرفات بیت المقدس کا حل اس کی مرضی کے مطابق قبول کر لیتے، تو وہ خوش خوش لوٹتا۔ اسے یقیناً اس سال امن کا نوبل پرائز مل جاتا۔ اس کے برعکس اگر وہ چاہتا بھی تو بیت المقدس کو فلسطینی ریاست کا دارالخلافہ نہ بنا سکتا کیونکہ امریکہ کے سارے یہود اس کے خلاف ہو جاتے لیکن اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اسرائیل اب زیادہ دیر تک دنیائے عرب واسلام کی نفرت اور غصے کے سیلاب کے سامنے بند نہیں باندھ سکتا۔

اسرائیل کے بانی بن گوریاں نے بھی اسرائیل کو متنبہ کیا ہوا ہے کہ وہ عربوں کے ساتھ تیسری جنگ کی تاب نہ لا سکے گا۔ صرف فلسطین کی یہ ذیلی ریاست ہی اس کے وجود کی ضامن ہو سکتی ہے۔ امریکہ کے ورلڈ آرڈر میں اس کا وجود لازمی ہے۔

یاسر عرفات نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ ستمبر میں فلسطینی ریاست کی آزادی کا اعلان کر دیں گے۔ امریکہ نے انتباہ کیا ہے کہ اس صورت میں امریکہ کو آزاد فلسطینی ریاست کے ساتھ اپنے تعلقات پر نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ دیکھئے یاسر عرفات اس ملفوف دھمکی کا کیا اثر لیتے ہیں۔ ان دنوں تو وہ مسلمان سربراہوں سے مل رہے ہیں اور انہیں ایک ننھی منی آزاد ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے مناسب پروٹوکول دیا جا رہا ہے۔ اس لئے ٹیلی ویژن کی تصویر میں ان کے چہرے پر کچھ بشاشت نظر آتی ہے۔

یوں دیکھئے کہ علامہ اقبال کا مندرجہ ذیل مصرع کیمپ ڈیوڈ سربراہ کانفرنس کے حوالے سے کتنی صداقت کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل رہا ہے۔

عصا نہ ہو، تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

عصا ہاتھ میں ہو تو مذاکرات کی میز کا فیصلہ کلیمانہ، ہوتا ہے ورنہ کلیمؑ بھی فرعون سے عصا کے بغیر مکالمہ کرتے تو فیصلہ ان کے خلاف ہوتا!

24 اگست 2000ء

ایمن آباد سیالکوٹ روڈ

آج سے باون ترپن سال پہلے کی بات ہے کہ میرے ماموں سید مسکین حسین شاہ مرحوم کپورتھلہ سے مہاجر ہو کر موضع ہوگڑھا میں آباد ہوئے تھے جو ایمن آباد سیالکوٹ روڈ کے کنارے آباد ہے۔ انہیں جس کنوئیں پر زمین الاٹ ہوئی تھی' اس کے رستے میں ایک بابا جی کو میں گرمیوں میں ایک دھریک کی چھاؤں تلے اور سردیوں میں دھوپ میں بیٹھے ہوئے دیکھتا۔ وہ مجھے کسی نہ کسی کام میں مشغول نظر آتے۔ سن کی سوکھی ٹہنیوں پر سے چھال اتارتے ہوئے یا ایٹرن پر رسی بٹتے ہوئے۔ لحیم شحیم' سرخ وسفید۔ بہت بڑا سر جس پر سفید بال لہراتے تھے اور پھیلی ہوئی گھنی سفید داڑھی۔ مجھے کبھی وہ مہاتما بدھ معلوم ہوتے' کبھی کنفیوشس اور کبھی جی بی شا۔ میں ان کے پاس بیٹھ کر اکثر ان کی دانشورانہ حکمت سے مستفید ہوتا۔

ایک بار میں نے ان سے ان کی عمر کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگے "جب سکھوں کو بھاجڑ پڑی تھی' تو سڑک پر ایک قافلہ گڈوں کا گزرا۔ ایک گڈا ہمارے گاؤں کے سامنے دلدل میں پھنس گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے مل کر گڈے کو دلدل سے نکالا۔ جھٹکا جو لگا تو ایک تھیلی دلدل میں گر کر پھٹ گئی اور چاندی کے روپے ادھر ادھر بکھر گئے۔ لوگ ان پر جھپٹ پڑے۔ ایک روپیہ میرے ہاتھ بھی لگا۔ لوگ کہتے تھے' یہ مائی چند کور کا خزانہ ہے جو جموں جارہا تھا۔ اس وقت میری عمر چھ سات سال تو ضرور ہوگی۔ تو حساب لگا لے' اب میری عمر کیا ہے؟" بابا جی نے ہنس کر کہا۔

1849ء میں سکھ انگریزوں سے مکمل طور پر شکست کھا چکے تھے۔ مائی چند کور راجہ رنجیت سنگھ کی ایک بیوی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سکھوں کی خانہ جنگی کے دوران جموں کے راجہ گلاب سنگھ کے ہاں پناہ لی تھی۔ میرے حساب میں بابا جی سو سال سے بھی دو چار سال زیادہ کی عمر کے نکلے۔

مجھے 1958ء میں ایمن آباد کی ایک تاریخی حویلی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس کے موجودہ مکین میو قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک حویلی میں کئی کنبے آباد تھے۔ صحن میں اتنا گوبر اور

دلدل تھی کہ میرے ایک پاؤں کا بوٹ اس میں دھنس کر پاؤں سے اتر گیا تھا۔ یہ حویلی ان حویلیوں میں سے ایک تھی جنہیں ایمن آباد کے دیوانوں نے تعمیر کروایا تھا۔ چھت کی طرف نظر اٹھی اتنے بڑے بڑے شہتیر دیکھے کہ دنگ رہ گیا۔ حیران تھا کہ انہیں چھت کی بلندی تک کیسے پہنچایا گیا۔ چوبی دروازے' جن پر نقش کاری کی گئی تھی' اتنے مضبوط اور بھاری بھرکم تھے کہ ایک پٹ کو اٹھانے کے لئے درجنوں آدمی درکار ہوتے ہوں گے۔ چھت میں ابابیلوں کا بسیرا تھا یا چمگادڑوں کا' معلوم نہ ہوسکا۔ دھویں سے چھت اور دیواریں کالی ہورہی تھیں۔ سلگتے ہوئے گوبر کے دھویں' پرندوں کی بیٹوں' میلے کچیلے طاقوں اور گدوں اور انسانی جسم کے پسینے اور میل سے اتنی بساند اٹھ رہی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا...... اور اس حویلی کے درودیوار سے مجھے مظلوم کشمیریوں کے خون پسینے کی بو بھی آئی۔

یہ شہتیر کشمیر کے دیودار تھے جو جموں سے گدوں پر لد کر ایمن آباد پہنچے تھے۔ اس سڑک کو "دیوانوں کی سڑک" بھی کہا جاتا ہے۔ جب راجہ گلاب سنگھ والی جموں نے 75 لاکھ روپوں کے عوض انگریزوں سے وادی کشمیر کا سودا کرلیا تو اتنی رقم کا فراہم کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہوگیا۔ اس نے ایمن آباد کے ساہوکاروں سے ایک خطیر رقم اس شرط پر قرض لی کہ انہیں وادی کشمیر کے مالیے سے دو آنے فی روپیہ ملا کریں گے اور وہ اس کے محکمہ دیوانی کے سربراہ ہوں گے۔ چنانچہ وہ اس کے دیوان کہلوائے۔ راجہ گلاب سنگھ نے کشمیریوں پر اتنا ٹیکس لگایا کہ وہ سردیوں میں پنجاب میں آتے اور محنت مزدوری کر کے جو کماتے واپس جا کر ٹیکس میں ادا کردیتے۔ کہتے ہیں کہ کسی کشمیری کے گھر کے صحن میں ایک پھل دار درخت بھی ہوتا تو اس کا ٹیکس بھی وصول کیا جاتا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ کشمیر کے سودے میں سیالکوٹ شہر کے ایک مسلمان ساہوکار شیخ سوداگر کا سرمایہ بھی شامل تھا اور اس کا خاندان بھی کشمیر کے استحصال میں انکی دونی کا شریک رہا ہے۔

میرے ماموں زاد بھائی شفقت حسین نقوی کہتے ہیں کہ یہ سڑک ایمن آباد کے دیوانوں نے بنائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ سڑک پہلے سے موجود تھی اور دیوانوں نے اسے وسیع اور کشادہ کیا۔ ایمن آباد ایک قدیم تاریخی قبضہ ہے۔ بابا گورونانک یہاں اپنی حق گوئی کی وجہ سے اس کے مسلمان گورنر کی قید میں رہے۔ گوردوارہ روڑی صاحب ان کی یاد میں تعمیر ہوا ہے۔ اکبر بادشاہ جب لاہور کے قلعے میں مقیم تھا تو ایمن آباد آیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں اس علاقے کا سب سے اہم تاریخی شہر سیالکوٹ تھا۔ اس لئے ان دو تاریخی شہروں کو ملانے والے کسی نہ کسی سڑک کا وجود لازمی تھا۔

''بابے دی بیری'' والے نالہ 'ایک' کے پل سے موضع ہوگڑھا کا فاصلہ پانچ کلومیٹر ہے۔ سڑک پکی ہے لیکن اتنی تنگ کہ سامنے سے آنے والی ویگن یا ٹرالی کو گزارنے کے لئے کار کے دو پہیے کچے پر رکھنے پڑتے ہیں۔ کئی سالوں سے سیالکوٹ شہر کا کوڑا کرکٹ اس سڑک کے کناروں کی نالیوں میں ڈمپ کیا جا رہا ہے۔ کچرے کے ڈھیر موضع ہوگڑھا سے صرف ایک کلومیٹر ادھر رہ گئے ہیں۔ ان سے اتنی بدبو اٹھتی ہے کہ شہر سے ہوگڑھا پہنچتے پہنچتے دماغ پلپلا ہو جاتا ہے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر شیشم کے درخت ہیں اور ان سے پرے دور تک ہر بھرے کھیت۔ زمین اتنی زرخیز ہے کہ کسی موسم میں بھی ہریالی سے خالی نظر نہیں آتی۔

اگر ایمن آباد سیالکوٹ روڈ چار لین کی کر دی جائے اور کاموکی سے سے آگے کسی مقام پر جی ٹی روڈ سے ملا دی جائے تو کم از کم پچیس کلومیٹر کا فاصلہ کم ہو سکتا ہے اور سیالکوٹ سے لاہور سوا گھنٹے میں پہنچا جا سکتا ہے۔ سیالکوٹ ایک صنعتی شہر ہے جہاں سپورٹس کا سامان اور سرجری کے اوزار بنانے کے متعدد کارخانے قائم ہیں اور بھی کئی صنعتیں کام کر رہی ہیں مثلاً چمڑے کی جیکٹیں اور دستانے وغیرہ بنانے کی۔ سیالکوٹ کی یہ صنعتیں گراں قدر زرمبادلہ کما رہی ہیں۔ سیالکوٹ کا قدیمی مطالبہ ہے کہ یہاں ائر پورٹ تعمیر کی جائے لیکن فی الحال ائر پورٹ کی نسبت چار لین کی سڑک زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ کار سوا گھنٹے میں لاہور پہنچ سکتی ہے۔ سیالکوٹ کا تاجر لاہور میں اپنا کام نپٹا کر شام تک واپس آ سکتا ہے۔ اس سڑک سے اس زرخیز علاقے کی پیداوار بھی آسانی سے منڈیوں میں پہنچائی جا سکتی ہے۔

جب یہ سڑک کچی تھی تو اس پر سائیکل چلانا اور وہ بھی جوانی کے زمانے میں ایک تفریحی سفر سے کم مسرت انگیز نہیں تھا۔ اب میں بوڑھا ہوں اور خیال ہی خیال میں دیکھتا ہوں کہ چار لین کی کشادہ سڑک پر کاریں فراٹے بھر رہی ہیں لیکن افسوس کہ شیشم کے بہت سے درخت کٹ چکے ہیں۔ پھر یہ سوچ کر بے اختیار ہنس پڑتا ہوں کہ دیکھئے بلدیہ سیالکوٹ کوڑا کرکٹ ڈمپ کرنے کے لئے کون سی نئی سڑک کا انتخاب کرتی ہے۔

31 اگست 2000ء

ایک ''این جی او'' اور

کہیں نظر سے گزرا ہے کہ اس وقت ملک میں کم وبیش تین ہزار این جی اوز کام کررہی ہیں اور حکومت تعلیم و تدریس کو ان کے حوالے کررہی ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر ان میں ایک اور این جی او کا اضافہ ہو جائے تو کیا فرق پڑے گا۔ میں یہ این جی او اپنی زیرِ تعمیر بستی میں قائم کرنا چاہتا ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ ان بچوں کیلئے ابتدائی تعلیم کا انتظام ہو سکے جو مجھے یہاں پتنگ اڑاتے ہوئے یا پتنگ لوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان آوارہ گرد بچوں کی تعلیم کی نعمت سے محروم دیکھتا ہوں تو میرا جی بہت کڑھتا ہے۔

یہ ایک چلتا پھرتا سکول ہوگا جسے ''ٹاٹ بردوش سکول'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔ بستی میں دو چار پارک ہیں۔ کسی پارک میں ٹاٹ بچھا کر کسی درخت کے تنے کے ساتھ بلیک بورڈ کھڑا کردوں گا اور گھنٹی بجاؤں گا کہ آؤ! آؤ! مفت میں تعلیم حاصل کرو۔ تعلیم سے بڑی نعمت اور کونسی ہے۔ تعلیم حاصل کرکے پاکستان کے اچھے شہری بنو' کتاب' تختی' سلیٹ اور سلیٹی مفت میں ملے گی۔'' سکول ٹائم ختم ہونے کے بعد لڑکوں سے کتابیں' تختیاں اور سلیٹیں واپس لے لوں گا' اور یہ سامان بستی کے اس دو کمروں کے گھوسٹ سکول میں محفوظ کردیا کروں گا جسے بستی کے دوراندیش اور دوربین کار پرواز ان نے ایک سابق ایم پی اے کی گرانٹ سے بستی کے آخری کونے کے پوش علاقے میں تعمیر کر رکھا ہے۔ لیکن سوچتا ہوں کہ کیا یہ نحیف کندھے ایک ٹاٹ' ایک بلیک بورڈ' کتابوں' تختیوں اور سلیٹوں کا بوجھ برداشت کرسکیں گے؟ چنانچہ سوچا کہ کچھ احباب سے مشورہ کرلوں۔ ان میں سرفہرست ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر جناب عبدالحمید خان ہیں۔ ان سے ذکر کیا تو سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے ''میں نے صرف اپنے دل ہی میں نہیں دماغ میں بھی جھانکا ہے' مجھے تو وہاں مایوسی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ اتنی خدمت بجالانے کو تیار ہوں کہ روزانہ کوئی پیریڈ لے لیا کروں' بشرطیکہ آپ بستی کے بنے بنائے سکول کو استعمال کریں۔'' میں نے جواب میں کہا ''وہاں تک لڑکوں کو کون کھینچ کر لائے گا؟ آج کل پیاسے کنویں تک نہیں آتے بلکہ کنویں کو پیاسوں تک لے

جانا پڑتا ہے۔''

پاس ہی کھڑے ان کے نوجوان بیٹے احمد کلیم خان نے کہا ''میں آپ کی مدد کو تیار ہوں''۔ میری تو خوشی سے باچھیں کھل گئیں یا یہ سمجھئے کہ سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ احمد کلیم ایم اے (اردو) ہیں۔ انہیں اخبار نویسی کا شوق ہے بلکہ ضد ہے کہ بنوں گا تو اخبار نویس ہی بنوں گا۔ انہوں نے بلا معاوضہ اخبار نویسی کا خاصا تجربہ بھی حاصل کر لیا ہے لیکن ابھی تک انہیں کسی اخبار میں نوکری نہیں ملی۔ طے ہوا کہ پہلے بستی کے سرکردہ افراد سے ملا جائے اور ان سے رہنمائی طلب کی جائے۔ کسی نے بات کو قہقہے میں اڑا دیا جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ کسی نے فقط مسکرانے پر اکتفا کیا۔

ایک صاحب نے از راہ ہمدردی کہا ''نقوی صاحب! تجویز تو آپ کی معقول ہے' لیکن افسوس ہے کہ آپ اٹھہتر سال کی عمر میں مولانا ایدھی بننا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جو کام کیا' اسے جوانی کے زمانے میں شروع کیا تھا۔'' ایک اور صاحب جن سے مجھے غم گساری کی بہت توقع تھی' صرف اتنا بولے ''نقوی صاحب! اپنی صحت کا خیال رکھیں۔''

ایک سوشل ورکر نے میری کچھ ہمت بندھائی' کہنے لگے ''آپ چندے کی اپیل کریں' بندہ آپ کے ساتھ ہے۔ مجھے چندہ جمع کرنے کا گر بھی آتا ہے۔ بس آپ تنکوں سے بنی ہوئی ایک ٹوپی حاصل کر لیں۔ کسی مسجد سے مل جائے گی۔ آپ ٹوپی ہاتھ میں لے کر کسی چوک میں کھڑے ہو جائیں۔ تقریر میں کروں گا۔ پھر دیکھئے کتنا ہن برستا ہے۔ ہم ایک گدھا گاڑی خرید لیں گے' سامان لادا اور جس گراؤنڈ میں چاہا' سکول لگا لیا۔ گدھے کی خوراک کا تردد بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ اسی گراؤنڈ میں چر چگ لیا کرے گا۔ البتہ' انہوں نے میرے کان میں سرگوشی کی'' جب آپ کی این جی او کو حکومت سے امداد ملنا شروع ہو جائے تو مجھے بھی اس میں حصہ دار جانیے گا۔'' میں نے کہا ''میں حکومت سے امداد لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا''۔ اس پر انہوں نے کندھے اچکائے جیسے کہہ رہے ہوں' تو استعفیٰ میرا باحسرت ویاس۔

احمد کلیم خان بولے ''جن بچوں کیلئے آپ ٹاٹ بردار سکول قائم کرنا چاہتے ہیں' ان سے ملنا بھی ضروری ہے۔'' سب سے پہلے اس چوکیدار سے بات کرنے کی ٹھانی جو عرصہ پندرہ سال سے اس بستی کی زیر تعمیر کوٹھیوں میں چوکیداری کر رہا ہے۔ وہ ماشاءاللہ قوم کو سات بچوں کا تحفہ دے چکا ہے لیکن افسوس کہ قوم نے ایک بھی بچے کی تعلیمی ذمے داری پوری نہیں کی۔ مناسب تمہید

کے بعد جب میں ٹاٹ بردوش سکول کا ذکر کیا تو وہ اچانک بھڑک اٹھا'' بابا! تجھے معلوم ہونا چاہئے' میرا ایک بچہ گدھا گاڑی پر سبزیاں بیچتا ہے' ایک ردی اکٹھی کرتا ہے' ایک قالین بنتا ہے۔''

''اور ایک جیل میں بھی پہنچ چکا ہے۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ اس نے مجھے لال لال آنکھوں سے گھور کر دیکھا تو احمد کلیم خان نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ ایک زیر تعمیر کوٹھی کے سامنے کی سڑک پر بہت سے ننگے دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے اور نیلی' گنجی یا سانڈل بار کی جانگلی زبان میں ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ ایک دانی بینی خاتون سے سلام دعا کے بعد اپنا مقصد بیان کیا تو وہ خوفزدہ آواز میں پکاری'' نی جیناں! وہ چک والا منشی یہاں بھی آ پہنچا ہے۔ اب ہم کہاں بھاگ کر جائیں گے؟'' وہ دانی بینی خاتون پھس پھس رونے لگی تو میں نے اسے تسلی دی۔'' بی بی! آپ یہیں رہیں گی۔ ہم چلے جائیں گے۔'' میں نے احمد کلیم کو بتایا کہ ممکن ہے ان کے علاقے میں لازمی تعلیم کا ایکٹ نافذ ہو اور پرائمری سکول کا منشی ہر سال انہیں کوئی نوٹس ووٹس دے جاتا ہو۔

تب ایک دس بارہ سال کے بچے سے ملاقات ہوئی جو کوڑے کرکٹ سے ردی اکٹھی کر رہا تھا۔ احمد کلیم نے پوچھا'' بچے! کتنا پڑھے ہوئے ہو؟'' اس نے کہا'' پڑھا لکھا ہوتا تو ردی اکٹھا کرتا'' احمد کلیم خاں نے پوچھا'' پڑھا کرو گے؟'' اس نے جواب دیا'' کیوں نہیں؟ پر میرے باپ کو روزانہ پچاس روپے تم دیا کرو گے؟'' آگے بڑھے تو ایک بچے کو پتنگیں لوٹتے ہوئے پایا۔ میں نے کہا'' بیٹے! سکول میں پڑھو گے؟'' کتاب' تختی' سلیٹ' پنسل کاپی مفت میں دیا کریں گے؟''

اس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پوچھا'' پتنگ بھی دیا کرو گے؟'' میں جواب سوچ رہا تھا کہ اچانک کہیں سے'' بوکاٹا'' کا نعرہ بلند ہوا اور ایک کٹی ہوئی پتنگ فضاء میں ڈگمگانے لگی۔ لڑکا اس کی طرف اس تیزی سے دوڑا کہ احمد کلیم اور کچھ شرمندہ سے ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ تب ہم دونوں بیک وقت اس نتیجے پر پہنچے کہ ابھی ہمیں اپنی'' این جی او'' کیلئے مزید'' گراؤنڈ ورک'' کرنا ہوگا۔

10 ستمبر 2000ء

بلدیاتی انتخابات اور عوام

موجودہ حکومت کے دو سال اور چار ماہ باقی رہ گئے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اس مدت میں اس کے سارے نیک ارادے پورے ہو جائیں اور حکومت جب پھر نوابزادہ نصراللہ خاں جیسے عوام کے ہاتھوں میں آئے تو صحیح معنوں میں جمہوری حکومت ہو یوں جمہوریت کبھی اصل عوام کے ہاتھوں میں نہیں آتی تو ذاتی طور پر علامہ اقبالؒ کا معتقد ہوں' اس لئے جمہوریت کا کچھ زیادہ والہ وشیدا ابھی نہیں۔ لیکن وہ دنیا جو اس وقت صاحب اقتدار ہے جمہوریت کی علمبردار ہے اور اپنے طفیلی ممالک میں بھی جمہوریت کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہے' ایسی جمہوریت جو قوم کے کرپٹ ترین سیاستدانوں کے ہاتھ میں ہوتا کہ وہ سرمایہ دار ملکوں سے بے تحاشا قرضے لے اور سرے محل یا مے فیر فلیٹس یا زرمبادلہ کی صورت میں انہیں لوٹا دے اور اصل اور سود قوم کے کندھوں پر ڈال دے۔

اس لئے گزشتہ ترپین سالوں سے مجھے برطانیہ اور امریکہ سے آنے والی جمہوریت سے کوئی لگاؤ پیدا نہیں ہوا یہ جمہوریت ہماری زمین' روایات اور تہذیبی مزاج سے لگا نہیں کھاتی یہ جمہوریت گزشتہ دس بارہ سالوں سے جو کرشمے دکھا رہی ہے' وہ آپ کے سامنے ہیں موجودہ حکومت جس طرز کی جمہوریت قائم کرنا چاہتی ہے' وہ ابھی کاغذ کی سطح سے اتر کر عوام تک تو کیا صحیح طور پر خواص تک بھی نہیں پہنچ سکی مثلاً بلدیاتی سطح پر جو انتخابات ہو رہے ہیں' ان کی تشریح و توضیح میڈیا پر جس طرح ہو رہی ہے' وہ تو ایسے ہے جیسے پولیٹیکل سائنس کا کوئی استاد کسی ملک کے دستور کی تفصیل بیان کر رہا ہو اور طلباء کلاس میں بیٹھے اونگھ رہے ہیں میں ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے بیٹھے اونگھ جاتا ہوں اور کچھ پلے نہیں پڑتا اخبار پڑھتا ہوں تو اور بھی الجھ جاتا ہوں آنے والے بلدیاتی نظام کو کامیاب بنانے کیلئے جن نئے ووٹروں نے ووٹ ڈالنا ہے' ان کی سطح تک تو قطعی نہیں پہنچا جا سکا البتہ پرانے ووٹر جنہوں نے کبھی بنیادی جمہورتیوں کے انتخابات میں ووٹ دیئے تھے' وہ اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ وہ نظام ہے جو تھوڑا سا پیچیدہ ہو گیا ہے تاہم ووٹ دینے کی حد تک کوئی پیچیدگی نہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ ووٹر کو ووٹ کی اہمیت سے آگاہ کیا جائے گا لیکن کس فورم

سے؟ مسجد کے منبر سے یہ کام آسانی سے لیا جا سکتا ہے لیکن ہر مسجد کا خطیب سرکاری خطیب تو نہیں سیاست پر پابندی ہے اور سیاستدان نئے نظام کو قبول بھی نہیں کر رہے جذبہ حب الوطنی کی پاکیزگی کہاں باقی رہ گئی ہے شہروں میں یقیناً پیسہ چلے گا اور دیہات میں برادری سسٹم، وہ دیہات جن پر بڑے زمینداروں کا راج ہے، وہاں کا ووٹر اس کے حکم سے سرتابی کی جرات کہاں سے لائے گا۔ بنیادی جمہوریت کے دور میں ایک زمیندار نے اپنا آدمی بھیج کر مراثیوں کے چودھری سے پچھوایا'' تم ووٹ کسے دے رہے ہو؟'' اس نے رعونت سے کہا کہ ''برادری سے مشورہ کروں گا'' زمیندار نے ڈیرے پر بلا کر اس بیچارے کی خوب ڈھول جھاڑی اور پوچھا'' کیا میرے آدمی نے تم سے نہیں پوچھا تھا کہ تم ووٹ کسے دو گے؟'' اس نے کہا'' پوچھا تو تھا لیکن اس طرح نہیں جس طرح اب آپ پوچھ رہے ہیں۔''

آنے والے بلدیاتی نظام کے سلسلے میں میرے ماموں زاد بھائی سید شفقت حسین رقم طراز ہیں'' بھائی جان! کبھی گاؤں میں پنچائیت کا نظام چلتا تھا اس میں شریف لوگ بیٹھے تھے اور عادلانہ فیصلے کرتے تھے ایک نمبردار کے بیٹے نے ایک کمی کی بیٹی کو چھیڑا، پنچایت کچھ لحاظ میں پڑ گئی، تو نمبردار نے دس جوتے گن کر اپنے بیٹے کے سر پر مارے۔ پھر پنچایت سے کہا'' اب تم اپنی طرف سے سزا تجویز کرو۔'' ایک گاؤں کے نمبردار سرپنچ بھی تھے اور نہایت سچا فیصلہ کرتے تھے۔ ان کا ایک بیٹا ایک عورت کو اغواء کر کے گھر سے بھاگ گیا تو وہ خانہ نشین ہو گئے اور لوگوں نے ان کا چہرہ اس وقت دیکھا جب ان کا جنازہ نکلا ایک صاحب جب تک پنچایت کے سرپنچ رہے، ان کا نام'' مہر الٰہی'' تھا جب بنیادی جمہوریتوں کے زمانے میں یونین کونسل کے چیئرمین بنے تو لوگ انہیں'' قہر الٰہی'' کہنے لگے۔

جنرل ایوب مرحوم کے زمانے میں بی ڈی الیکشن ہوئے، ان میں جو ممبر بنے، وہ اکثر فقیر فقرے تھے پھر انہوں نے حویلیاں بنائیں اور بڑی بڑی خوفناک مونچھوں والوں کو بندوق پکڑا کر ڈیروں کا محافظ بنا دیا یہ لوگ اکثر'' مفرور'' ہوتے۔ قتل کے کیس میں ضمانت کرواتے اور حویلی میں پناہ لے لیتے۔ جنرل ضیاء کے دور میں ان کے ہاتھ میں کلاشنکوف آ گئی بعد میں جو بھی جمہوری الیکشن ہوئے ان میں ان غنڈوں نے بہت دھاندلیاں کیں اب بھی ہمارے دیہات پر انہیں کا قبضہ ہے شریف آدمی کی زندگی انہوں نے اجیرن بنا رکھی ہے پولیس انہیں نہیں پوچھتی۔ اب بھی یہ لوگ کسی نہ کسی صورت میں جگا ٹیکس لیتے ہیں پٹواری اور گرداور سے مل کر انہوں نے قبضہ گروپ بنا

رکھے ہیں دیہاتی اڈوں پر بیٹھ کر ویگنوں اور بسوں سے بھتہ لیتے ہیں اگر یہ جرائم پیشہ لوگ سیاسی منظر سے نہ ہٹیں تو بلدیاتی الیکشنوں میں وہی لوگ کامیاب ہوں گے جن کی پشت پر ان لوگوں کی کلاشنکوف ہوگی در پردہ یہ لوگ پرانے ایم این اے اور ایم پی اے حضرات کے آدمی ہوں گے عوام بزدل اور کمزور ہو چکے ہیں میں تو کہوں گا اخلاقی طور پر کرپٹ ہو چکے ہیں وہ ان لوگوں کے مقابلے میں اپنی مرضی سے ووٹ دینے کا قابل نہیں رہے ضرورت ہے کہ عوام میں اخلاقی جرات پیدا کی جائے اور ایسی امن وامان کی فضا قائم کی جائے کہ وہ کسی خوف وخطر کے بغیر ووٹ ڈال سکیں۔''

دوسرا خط نور پور کلاں سے چاچا بوٹا کا آیا ہے۔ تحریر بابو کرم دین سائیکل والے کی ہے۔ ''صاحب جی! میں ناخواندہ ہوں بابو کرم دین دسویں پاس ہے ہم اسے یونین کونسل کی ممبری کے لئے کھڑا کر رہے ہیں لیکن اس کے مقابلے میں گاؤں کا دکاندار شیخ برکت اللہ اپنے بھانجے کو جو ایف اے پاس ہے' یونین کونسل کا ممبر بنوانا چاہتا ہے یہ لڑکا جیسا کہ آپ کو معلوم ہے نور پور خورد میں ''ماماں بھانجا سپر سٹور'' کا مالک ہے بیچارہ کرم دین تو فقیر فقرا ہے' شیخ برکت اللہ پیسے والا ہے اور سابق ایم پی اے حاجی مولا بخش بھی اس کی پشت پر ہے میں ہر دوسرے تیسرے دن اس کے کلاشنکوف برادروں کو شیخ کے تھڑے پر بیٹھے کوکا کولا پیتے ہوئے دیکھتا ہوں میں گاؤں میں ان کے خلاف پراپیگنڈہ تو کر رہا ہوں لیکن اس کا فوری حل ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ ٹیکس سروے ٹیم سے کہیں کہ وہ نور پور کلاں اور نور پور خورد کا دورہ ضرور کرے اگر یہ ممکن نہ ہو تو آپ سروے والے دو فارم مجھے بھیج دیں ایک شیخ برکت اللہ کے نام اور دوسرا اس کے بھانجے منظور اللہ کے نام۔'' میں حیران ہوں کہ اس خط کا کیا جواب دوں۔

28 ستمبر 2000ء

بنیادی جمہوریتوں کی کچھ یادیں

یہ 1960ء کی بات ہے۔ سیالکوٹ سے گوندل مرالہ جانے والی پکی سڑک کے کنارے جہاں میرے گاؤں بھڑتھ کا پرائمری سکول واقع تھا' پورا گاؤں امڈ آیا تھا کیونکہ یہاں بنیادی جمہوریتوں کا پہلا انتخاب منعقد ہو رہا تھا۔ میں بھی اس ہجوم میں موجود تھا۔ دونوں امیدواروں کا تعلق میری برادری سے تھا اور دونوں پڑھے لکھے تھے افسوس کہ میرا امیدوار انتخاب ہار گیا۔ اس شام مجھے نہایت شدید احساس زیاں ہوا۔ جیسے میں نے کچھ کھو دیا ہو' پایا نہیں کیونکہ میں نے اپنا ووٹ بنیادی جمہوریت کے ممبروں کے سپرد کر دیا تھا جو اب نہ صرف صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے ممبروں کا انتخاب بھی کریں گے بلکہ صدر مملکت کا بھی۔

قیام پاکستان سے پہلے 1946ء میں جو انتخاب ہوا تھا' اس میں بھی مجھے ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ میری عمر 23 سال کی تھی لیکن میں ووٹ کا حق استعمال نہ کر سکا تھا کیونکہ میں گاؤں میں نہیں تھا۔ اس کا مجھے اب بھی افسوس ہے کہ میں ایک بہت بڑے اعزاز سے محروم رہا۔ اس انتخاب میں بھی ووٹروں کی اکثریت ان پڑھ تھی لیکن انہوں نے بڑے شعور کے ساتھ ووٹ دیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے ''پاکستان'' کو ووٹ دیا تھا' کسی دھونس دھاندلی کی پروا نہ کی تھی۔ برادریوں کے چکر میں بھی نہیں آئے تھے۔ زمیندار اور وڈیرے بھی انہیں قطعاً مرعوب نہ کر سکے تھے حالانکہ ان میں سے اکثر ''یونینسٹ'' تھے۔ اس کے بعد بھی ان ووٹروں کو بلدیاتی' صوبائی اور مرکزی انتخابات میں ووٹ دینے کا تجربہ حاصل ہوا۔ مانا کہ اس نظام میں بہت سی خرابیاں آ گئی تھیں لیکن ان خرابیوں کو دور کرنے کا کوئی اور ذریعہ بھی سوچا جا سکتا تھا۔ ارتقائی عمل جاری تھا کہ جنرل محمد ایوب خان مرحوم نے سوئی الٹی گھما دی اور نظام جمہوریت کو پھر ''الف بے جیم'' پر لے آئے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ ہمارے حلقہ انتخاب سے 1946،1953 میں اسی حلقے کے ایک گاؤں کی یونین کونسل کے ممبر چنے گئے تھے۔ وہ بی اے ایل ایل بی وکیل تھے لیکن انہوں نے جس ممبر کو یونین کونسل کا چیئر مین بنایا' وہ پرائمری پاس بھی نہیں تھا۔

میں نے اپنے ناول ''میرا گاؤں'' کے ایک باب میں اس کے مرکزی کردار عبدالرحمٰن عرف ماہنا کی زبان میں لکھا ہے۔ ''ملک میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام قائم کرنے کے لئے پہلا چناؤ ہو رہا تھا...... گاؤں میں یکا یک دو پارٹیاں بن گئیں...... ہماری پارٹی کے لوگ ''بھا'' کی دکان کے تھڑے پر جمع ہوتے اور چودھری کی پارٹی کے لوگ اس کے ٹیوب ویل پر محفل لگاتے۔ دونوں پارٹیوں کے جاسوس ایک دوسرے کی کن سوئیاں لیتے پھرتے...... ہمارے گاؤں میں کوئی ایسی عمارت نہ تھی جہاں پولنگ سٹیشن بنتا۔ چنانچہ ہمیں ووٹ دینے کیلئے گل بہار جانا پڑا۔ اس دن صبح سویرے گل بہار میں بیلہ سا لگ گیا...... چودھری نے اپنا کیمپ سکول کے قریب ایک مکان کے صحن میں لگایا تھا...... ہم نے سکول کے باہر دو چار، چار پائیاں بچھائیں اور زمین پر ایک دو چٹائیاں بچھا دیں...... ہمارے کیمپ کی سادگی دیکھ کر گل بہار کے لوگوں نے ہمارا مذاق بھی اڑایا، یہ کیمپ ہے یا کسی کا فاتحہ پڑھا جا رہا ہے...... ہمارا امتیازی نشان ہل تھا اور چودھری کا بیل، ہل اور بیل کا آپس میں وہی تعلق ہوتا ہے جو جسم کا جان سے پر آج وہ ایک دوسرے کے مخالف تھے''۔

چودھری کو اپنی جیت کا پورا پورا یقین تھا لیکن وہ خلاف توقع ہار گیا۔ پولنگ آفیسر نے اس سے کہا کہ وہ اپنے مخالف امیدوار سے خیر۔ گالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہاتھ ملائے لیکن اس نے کہا ''نہیں...... رحمت خان میرا دشمن ہے...... میں اس سے ہاتھ نہیں ملا سکتا''۔ اس نے رحمت خان کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جس میں آگ بھری ہوئی تھی۔ اب ملک کی سیاست گاؤں کی گلیوں سے چوکھٹ پار کر کے گھروں میں داخل ہو گئی تھی۔

بنیادی جمہوریتوں کے دوسرے الیکشن میں میرے والد مرحوم نے اپنا ووٹ ایک امیدوار کو دیا اور میں نے اور میرے چھوٹے بھائی سجاد نقوی نے دوسرے کو۔ اپنی زندگی میں پہلی بار ہم والد مرحوم کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے تھے۔ ہمارا امیدوار کامیاب ہو گیا تھا اور یونین کونسل کا صدر بن گیا تھا لیکن اس نے ملک کی صدارت کے انتخاب میں فیلڈ مارشل ایوب خان کو ووٹ دیا حالانکہ ہم ووٹر چاہتے تھے کہ وہ محترمہ فاطمہ جناح کو ووٹ دے۔ اس طرح گویا ہم ہار گئے۔ ممکن ہے کہ اگر والد مرحوم کا امیدوار کامیاب ہو جاتا تو وہ بھی اتنی بڑی جرأت نہ دکھا سکتا۔

بھانڈوں نے کئی لطیفے گھڑ لئے تھے۔ وہ ممبروں کو ''جمورے'' کہتے اور ''چیئرمین'' کو ''چورمین'' جیسا کہ انتخاب کے وقت ایک یونین کونسل کے چیئرمین کا نام ''مہر الٰہی تھا'' سال دو سال بعد وہ ''قہر الٰہی'' کے نام سے موسوم ہو گیا تھا۔ اس نظام کے وضع کرنے والوں کے دماغ میں

قوم کے جمہوری شعور پر اعتماد کی کمی کا یہ عالم تھا کہ یونین کونسلوں کے کچھ ممبر نامزد بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک نامزد ممبر سائیکل کے کیریئر پر ایک پیٹی باندھ کر گاؤں گاؤں صابن بیچتے تھے اور اپنا تعارف ضرور کراتے تھے کہ میں اپنی یونین کونسل کا نامزد ممبر ہوں۔ وہ سفارش کے لئے تھانے کچہری بھی پہنچ جایا کرتے تھے۔ میں ایک امتحانی سنٹر میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لگا تھا۔ مجھ سے ملے تو اپنا تعارف کرا کے کہا "میرا بھائی آپ کے سنٹر میں امتحان دے رہا ہے۔ اس کا خیال رکھئے۔" میں نے کہا "ہم سب بچوں کا خیال رکھتے ہیں" اس واقعے کے بیان سے میرا مقصد ہے کہ جہاں ایک طرف بنیادی جمہوریتوں کی نامزد ممبر شپ ایک مزدور کو مل گئی تھی، وہاں دوسری طرف سفارش کا حلقہ بھی وسیع ہو رہا تھا۔

اس مضمون کو "میرا گاؤں" کے بنیادی جمہوریتوں والے باب کے آخری پیرے پر ختم کرتا ہوں۔ "یوں لکھنے کو بہت سی باتیں ہیں مثلاً ایوب خان کا صدر بننا...... مجوزہ ٹیکسوں کی تفصیل سے لوگوں کی گھبراہٹ...... چولہا ٹیکس...... مویشیوں اور مرغیوں پر ٹیکس...... شادی بیاہ، پیدائش پر ٹیکس...... شاملات دیہہ مثلاً گاؤں کے قبرستان اور تکیے کے درختوں کو یونین کونسل کی تحویل میں دیا جانا وغیرہ وغیرہ۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بنیادی جمہوریت بھی ایک قسم کی پنچایت ہے لیکن پنچایت کے انتخاب نہیں ہوتے تھے۔ وہ کوئی ٹیکس نہیں لگا سکتی تھی۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ گاؤں کا چوکیدار ہمارا افسر بن گیا۔ وہ چولہا ٹیکس جس رعب سے اکٹھا کرتا، اس پر ہمیں حیرت بھی ہوتی اور غصہ بھی آتا۔"

اب دیکھئے مجوزہ بلدیاتی نظام جس کے الیکشن ہو رہے ہیں، اس کے قیام پر کون کون سے حیرت اور غم و غصہ کے مقامات آتے ہیں!

15 اکتوبر 2000ء

چینل نمبر تھری

یکم ستمبر ۲۰۰۰ء سے پی ٹی وی کے چینل نمبر تھری کا اجراء ہو گیا ہے اور ناظرین تفریحی و معلوماتی پروگرام سے مستفید ہو رہے ہیں۔ افتتاحی تقریب میں پی ٹی وی کے ایم ڈی جناب مرزا یوسف بیگ نے فرمایا کہ ٹی وی کے ایک نئے چینل کے آغاز سے ہم نے ناظرین سے کیا ہوا ایک اور وعدہ پورا کر دکھایا۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ ناظرین چینل تھری کے پروگرام پسند کریں گے۔ اس وقت ملک میں ٹیلی ویژن دیکھنے والوں کی تعداد پی ٹی وی کے چینل نمبر ایک پر انحصار کرتی ہے، اب انہیں چینل تھری کی چوائس بھی مل گئی ہے۔

واقعی یہ ایک مژدہ ہے۔ اس مبارک موقع پر جتنی بھی خوشی منائی جائے کم ہے کہ ماشاء اللہ اب ہم تین چینلوں کے مالک ہو چکے ہیں۔ کیا پتہ مستقبل قریب میں ہم اپنا مواصلاتی سیارہ بھی خلاء میں بھیج سکیں اور ہماری نشریات دنیا کے کونے کونے میں پہنچ سکیں کیونکہ ہم اپنے ملک کے سارے مسائل حل کر چکے ہیں۔ غربت ختم ہو چکی ہے، بیروزگاری کا خاتمہ ہو چکا ہے، تعلیم عام ہے، کالا باغ ڈیم بننے سے پانی چولستان، تھرپارکر تک پہنچ رہا ہے، کشمیر کی جنگ آزادی جیت چکے ہیں، ملک کا قرضہ اتار چکے ہیں، ''آئی ایم ایف'' کے جن کو ہم نے بوتل میں بند کر کے بحیرہ عرب کی تہہ میں پھینک دیا ہے۔ اب صرف مسئلہ طاؤس و رباب کے فروغ کا باقی رہ گیا تھا جو چینل تھری کے اجراء سے حل ہو گیا ہے۔ ہمارے خوبصورت اور وجیہ ایم ڈی مرزا یوسف بیگ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اب وہ تین چینلوں پر ملک کی ساری خوبصورتی کو یکجا کر دیا کریں گے اور وہ شہباز جن کے کندھوں پر رائفل ہونی چاہیے تھی، طاؤس و رباب ہاتھ میں لے کر ایسا مجاہدانہ رقص کر رہے ہوں گے کہ کرگل کی ساری چوٹیاں بیک ضرب مضراب ہمارے قدموں میں سرنگوں ہو جائیں گی۔

چینل تھری کا پرانا نام ''ایس ٹی این'' ہے جو کہ کم از کم ایک اداکار محمود صدیقی کی موت کا ذمہ دار ہے، جس کے ۲۴ لاکھ روپے ''ایس ٹی این'' کا سابق مالک اڑا لے گیا ہے۔ علی اعجاز کے چھ لاکھ روپے بھی اس کنویں میں غرق ہو چکے ہیں اور اتنا بڑا ہنسنے ہنسانے والا اداکار مفلوج ہو گیا

ہے۔

ایم ڈی صاحب کہتے ہیں ''ہم نے ناظرین سے کیا ہوا ایک اور وعدہ پورا کر دیا ہے۔'' مرحبا! میں بھی ایک بزرگ ناظر ہوں۔ مجھے تو معلوم نہیں کہ انہوں نے مجھ سے کب اور کیا وعدہ کیا تھا؟ وگرنہ میں کہتا ''شکریہ بیگ صاحب! اشتہارات دیکھنے کیلئے ایک ہی چینل کافی ہے جسے آپ چینل نمبر ایک کہتے ہیں۔ لیکن کبھی یہاں پورے کا پورا پی ٹی وی ہوا کرتا تھا اور نہایت خود کفیل تھا۔ اس پر خبریں بھی نشر ہوتی تھیں' ڈرامے بھی دکھائے جاتے تھے' ناچ گانا بھی بکثرت ہوتا تھا' اذان بھی سنائی دیا کرتی تھی' حمد و نعت بھی ہوتی تھی بلکہ کچھ نہایت مفید اسلامی' اخلاقی اور اصلاحی پروگرام بھی ہوتے تھے کہ جن سے ناظرین کو روحانی کیف ملتا تھا۔ وہ اب قریب قریب متروک ہو چکے ہیں۔

پانچ بجے کے بعد دوپہر سے رات کے بارہ بجے تک پی ٹی وی کے تین چینل بیک وقت چلتے ہیں۔ خیال تھا کہ ان کے پروگراموں میں خاصا تنوع ہو گا لیکن ہوتا یہ ہے کہ ایک چینل پر اشتہار لگے ہوں اور آپ چینل بدلیں تو دوسرے پر بھی اشتہار ہی چل رہے ہوتے ہیں۔ میرا ناچیز مشورہ ہے کہ تینوں چینلوں کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کیلئے مخصوص اور مختلف پروگراموں کے لئے وقف کر دینا چاہئے مثلاً چینل نمبر ایک پر ڈراما لگا ہو تو چینل نمبر دو پر ناچ گانا ہونا چاہئے' اور چینل نمبر تھری پر کیا ہو' فی الحال میرے ذہن میں نہیں آ رہا۔ ویسے وہاں بھی ناچ گانے کا پروگرام ہی بہتر رہے گا کیونکہ ہم نے تلوار ہاتھ سے گرا دی ہے' ستار سنبھال لیا ہے۔

کہتے ہیں کہ پی ٹی وی خود کفیل ہو گیا ہے۔ اگرچہ مجھے یقین تو نہیں آ رہا' تاہم خوشی کی بات ہے کہ کوئی ادارہ تو خود کفیل ہوا ہے۔ یوں اگر مجھ سے پوچھا جاتا تو خود کفیل ریلوے کو ہونا چاہئے تھا' ڈاک کے محکمے کو ہونا چاہئے تھا' واپڈا' ایل ڈی اے' واسا اور سوئی گیس کو ہونا چاہئے تھا۔ ایک اور مژدہ بھی ملا ہے کہ ایک چینل صرف خبروں کے لئے کھولا جا رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ پاکستان کے پاس اتنی خبریں کہاں سے آئیں گی کہ ایک الگ چینل قائم کرنے کی ضرورت پڑ گئی دن میں ایک مرتبہ خبریں سن لی جائیں تو چوبیس گھنٹے طبیعت سرشار رہتی ہے۔

میرا خیال تھا کہ تین چینل چلنے سے پی ٹی وی کے پروڈیوسر بہت مصروف ہو جائیں گے لیکن جو سیریل دیکھنے کو ملتے ہیں' ان کے پروڈیوسروں کے نام نہایت اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا پی ٹی وی کے اصل پروڈیوسر سارے ریٹائر ہو گئے ہیں یا انہیں سٹوڈیو میں مصلے پر بٹھا دیا

گیا ہے کہ تنخواہ اور مراعات وصول کرتے رہیں اور پی ٹی وی کی درازی عمر اور ترقی درجات کے لئے دعائیں کرتے رہیں۔ میں تو کہوں گا کہ ہمارے لئے پی ٹی وی کا چینل نمبر ایک ہی کافی ہے کہ کہنہ مشق پروڈیوسر یہاں ایسے ڈرامے ڈائریکٹ کریں جو خالصتاً پاکستانی ہوں یعنی نہ امریکی ہوں نہ انگریزی نہ یورپی' ان ڈراموں میں ہمیں نیویارک' لندن اور برلن کی جگہ بھائی پھیرو' چیچوں کی ملیاں' سیدو شریف' کلیام' سیہون شریف اور خضدار نظر آئیں۔ یا اللہ! ہمیں دبئی میں بننے والے سیریلوں سے کب نجات حاصل ہوگی؟ دبئی کے نظاروں سے جی بھر گیا ہے۔ خدارا! ہمیں چولستان' تھرپارکر اور چاغی لے چلیں کہ کچھ تو منظر بدلے اور کوئی نیا افق نظر آئے۔

میں ایم ڈی صاحب کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ پی ٹی وی کے ''پی'' سے مراد پاکستان ہے اور آج کل کے پی ٹی وی پروگراموں سے کوئی چیز غائب ہے تو وہ بیچارہ ''پاکستان'' ہے جو دو قومی نظریئے پر قائم ہوا اور اسلام جس کی اساس ہے۔ اسلام نے ہمیشہ شرافت' شائستگی' تہذیب' اخلاق اور جسم و روح کے درمیان معتدل امتزاج کی تبلیغ کی ہے۔ ایم ڈی صاحب صرف ایک دن پانچ بجے سے بارہ بجے تک تینوں چینلوں کے پروگرام دیکھیں اور خود فیصلہ کریں کہ ان میں سے کتنے پروگرام پاکستانی مزاج کے حامل ہیں۔

پچھلے دو تین سالوں میں پی ٹی وی کے شاہکاروں میں سے صرف ایک شاہکار کو مثبت اور بامعنی قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ ہے ''سلطان ٹیپو شہید'' اس کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے پی ٹی وی کے ایک تجربہ کار پروڈیوسر نے ڈائریکٹ کیا۔ اس کیلئے میں پی ٹی وی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس سیریل کے لگنے سے پی ٹی وی کو کوئی مالی خسارہ برداشت نہیں کرنا پڑا ہوگا۔

اور آخر میں ایک درخواست ہے کہ چونکہ پی ٹی وی کمرشل ہو چکا ہے' اس لئے ٹی وی لائسنس فیس کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔ اگر یہ فیس معاف ہو جائے تو مجھے یقین آ جائے گا کہ پی ٹی وی خود کفیل ہو چکا ہے۔

10/اکتوبر 2000ء

ضمیر کی سزا

۱۹ستمبر ۲۰۰۰ء کے نوائے وقت کے پہلے صفحے کی ایک سرخی ملاحظہ ہو۔ ''بار بار کہتے ہیں کہ پاکستانی ہیں، جواب میں تھپڑ مارے جائیں تو کیا کریں؟''

سرخی دیکھ کر ٹھٹک گیا اور پھر حیران رہ گیا کہ اس کے نیچے ''نسیم ولی'' لکھا ہے۔ میں نے یہ دیکھنے کے لئے کہ چارسدہ کے خانِ اعظم کی قابل صد احترام بیگم کو تھپڑ مارنے کی جرأت کون کر رہا ہے؟ پوری خبر پڑھی جو یوں ہے ''پشاور (این این آئی) عوامی نیشنل پارٹی کی صدر بیگم نسیم ولی خان نے مرکزی حکومت کی طرف سے صوبائی حکومت کو نیٹ پرافٹ کی رقم کی ادائیگی سے انکار کی خبروں پر شدید غصے کا اظہار کرتے ہوئے متنبہ کیا ہے کہ صوبے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی روش فوری طور پر بند کی جائے ورنہ جو احتجاج ہوگا، پرامن نہیں ہوگا۔ این این آئی سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اقتدار سنبھالتے وقت جنرل مشرف نے صوبوں کو ان کے مطالبے سے زیادہ مالی اور انتظامی خودمختاری دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب الٹی سمت میں سفر جاری ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب ہم بار بار کہتے ہیں کہ ہم پاکستانی ہیں، لیکن جواب میں منہ پر تھپڑ مارے جائیں تو ہم کب تک وفاق وفاق کرتے رہیں گے۔''

کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بیگم صاحبہ کی ''نیٹ پرافٹ'' سے کیا مراد ہے اور مرکزی حکومت نے یہ ''نیٹ پرافٹ'' بیگم صاحبہ کے صوبے کو کیوں ادا نہیں کیا کہ وہ شدید غم و غصہ میں مبتلا ہو گئیں۔ یہ غم و غصہ خاندانی ورثہ ہے۔ میں نے اس خاندان کو ہمیشہ شدید غم و غصے کے عالم میں ہی دیکھا ہے۔ ان سے پہلے ان کے قاہر و جابر شوہر خان عبدالولی خان بھی بات بات پر شدید غم و غصے کا اظہار کرتے تھے اور ان سے پہلے باچا خان مرحوم تو شدید غم و غصے کی آگ میں جلتے بھنتے جلال آباد کی سرزمین میں ابدی نیند جا سوئے۔ ریفرنڈم سے لے کر اپنی وفات حسرت آیات تک انہیں غم و غصے سے ایک لمحے کی رہائی نصیب نہ ہوئی۔ مجھے مرحوم پر رحم آتا ہے کہ کاش اپنی فانی لیکن طویل زندگی میں انہیں محبت و رافت اور لطافت و نفاست کے ایک دو ثانیے ہی

نصیب ہو جاتے۔

پاکستان بہت سخت جان ہے کہ ان کے غصے کی آگ میں نعوذ باللہ بھسم ہو کر نہ رہ گیا۔ لیکن نسیم ولی خان تو عورت ذات ہیں' کہتے ہیں کہ عورت کا دل بہت نرم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ جب وہ ''ہوتی خاندان'' کی شمع خانہ تھیں' تو ان کے دل میں پاکستان کے لئے کوئی نرم گوشہ موجود ہو لیکن چارسدہ والوں کی بہو بن کر وہ بھی غم و غصے کی لپیٹ میں آ گئیں۔ ان سے بھی زیادہ غصہ ان کے سوتیلے بیٹے اسفندیار ولی کی زبان پر ہے۔ پاکستان کے حق میں ان کے ہونٹوں سے جب بھی ٹپکتا ہے زہر ہی ٹپکتا ہے۔ فردوسی کے شاہنامہ میں ایک ہیرو کا نام ''اسفندیار'' ہے جو ''روئین تن'' کہلاتا تھا کیونکہ اس کا جسم کانسی کا بنا ہوا تھا۔ اس پر تلوار کی ضرب ٹن سے لگ کر اچٹ جاتی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے زمانے کا ''ربوٹ'' ہو۔ یہ روبوٹی کیفیت اسفندیار ولی کے غم و غصے میں موجود ہوتی ہے کہ کوئی کلامِ نرم و نازک ان پر اثر نہیں کرتا۔ اب تو خیر کالا باغ ڈیم کا معاملہ برف میں لگ گیا ہے اور اسفندیار ولی نے اسے سراہا بھی ہے یعنی اس ''روئیں تن'' کو ٹھنڈک محسوس ہوئی ہے لیکن جب یہ مسئلہ زندہ تھا تو اسفندیار ولی اس فرضی ڈیم پر غصے کے وہ بم مارتے تھے کہ نوشہرہ تو کیا پورا پاکستان مع پختونستان سیلاب میں ڈوبتا ہوا نظر آتا تھا۔

بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ اگر صوبے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی روش بند نہ کی گئی تو ''جو احتجاج ہوگا' پرامن نہیں ہوگا۔'' ہم نے تو یہی سنا ہے کہ سرحدی گاندھی ہمیشہ ''اہنسا'' یعنی عدم تشدد کے قائل رہے ہیں۔ یوں بھی اس خاندان کا احتجاج اکثر ہمیشہ زبانی کلامی رہا ہے اور نہایت پرامن۔ اس خاندان کے ایک مرید فرید طوفان ہیں جو کئی بار پیالی میں طوفان اٹھا چکے ہیں اور اتنا طوفان کہ پیالی کناروں سے بھی نہیں چھلکتی۔ بہر حال آج کل یہ خاندان کچھ بپھرا ہوا ہے۔ اس لئے احتیاط کی ضرورت ہے۔

بیگم نسیم ولی خان نے مزید فرمایا ''جب ہم بار بار کہتے ہیں کہ ہم پاکستانی ہیں لیکن جواب میں منہ پر تھپڑ مارے جائیں' تو ہم کب تک وفاق وفاق کرتے رہیں گے۔'' بیگم صاحبہ! ہم نے تو کبھی نہیں کہا کہ آپ پاکستانی نہیں۔ اصل میں یہ آپ کے اندر کی ''سرحدی گاندھویت'' ہے جو آپ کو بار بار پاکستانیت کا اظہار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

عہد نبویؐ میں ایک شخص عبداللہ بن ابی ہوا کرتا تھا جو بار بار کہتا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور اسے خود اپنے اسلام پر یقین نہیں آتا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت آپ کی پاکستانیت میں بھی ہے۔

آپ ''وفاق وفاق'' پکارتی ہیں اور جواب میں آپ کو تھپڑ لگتا ہے۔ کیا پاکستان میں اتنی بھی شائستگی نہیں رہی کہ کوئی پاکستانی ایک معزز خاتون کے ساتھ ایسی گستاخی کرے۔ اصل میں یہ تھپڑ آپ کو اپنے اندر سے لگتا ہے ورنہ پاکستان کے منہ پر جب بھی لگا' تھپڑ آپ کی طرف سے لگا اور اس نے دوسرا گال پیش کر دیا۔ باچا خان مرحوم سے لے کر بچہ خان تک آپ سب کے سب پاکستان کے منہ پر تھپڑ پہ تھپڑ لگاتے رہے لیکن اب معلوم ہوا کہ ہر تھپڑ آپ ہی کے منہ پر لگتا رہا۔

اب رہی ''وفاق وفاق'' پکارنے والی بات' ہم نے تو یہی سنا تھا کہ ایک رانجھا رانجھا پکارنے والی خود رانجھا ہو گئی تھی۔ اگر آپ سے وفاق وفاق پکارتیں تو اب تک مجسم وفاق بن چکی ہوتیں۔ سابق وزیراعظم پاکستان کے زمانے میں کچھ مدت کچھ ایسی کیفیت ضرور نظر آئی۔ نواز شریف کو دعائیں دیں کہ انہوں نے آپ کو چارسدہ کی چار دیواری سے نکالا اور پورے صوبے سرحد میں پھیلا دیا۔ آپ کے بھائی اعظم ہوتی کو ایسی وزارت عطا فرمائی جو سونے کی کان تھی۔ اب اگر وہ نیب کے شکنجے میں آ گئے ہیں' تو اس میں ''وفاق'' کا کیا قصور ہے؟

پاکستان کی سیاست میں جب بھی کوئی اوپر سے نیچے گرتا ہے' وہ وفاق دشمن بن جاتا ہے اور صوبائی یا لسانی کارڈ استعمال کرنے لگتا ہے۔ بینظیر بھٹو بھی ان دنوں کبھی کبھی دبی دبی زبان میں سندھی کارڈ استعمال کرنے لگی ہیں' ایک بار نواز شریف بھی جب وزارت عظمیٰ کی گدی سے اتارے گئے تھے' پنجاب کا کارڈ استعمال کرنے لگے تھے جسے پنجابیوں نے بھی ناپسند کیا تھا۔ تاہم بے نظیر ہوں یا نواز شریف' انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم وفاق وفاق پکارتے ہیں اور جواب میں ہمارے منہ پر تھپڑ لگتا ہے جو تھپڑ اپنے اندر سے لگے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

18 اکتوبر 2000ء

بزرگوں کا پیکج 2000ء

ابھی یکم اکتوبر 1999ء والے بزرگوں کے عالمی دن کی کچھ ولولہ انگیز یادیں دل سے محو نہیں ہوئی تھیں کہ 2000ء کا بزرگوں کا عالمی دن بھی آ گیا اور آ کر گزر بھی گیا۔ اس بار کوئی ہنگامہ برپا نہ ہوا البتہ بزرگوں کی بزرگی میں ایک سال کا اضافہ ہو گیا۔ کاش یہی معلوم ہو جاتا کہ یکم اکتوبر 1999ء کو جن بزرگوں کو گولڈ میڈل ملے تھے ان میں سے کتنے اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ اس عالمی دن پر صرف اتنی خبر ملی کہ کچھ بزرگوں نے گلوبل واک میں حصہ لیا اور صحیح سلامت اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ اخبار میں جو تصویر چھپی، اس میں جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن نمایاں تھے۔ یاسر خیل تھے۔ مجھے اپنی 78 سالہ زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمری کی لکیر کو ایک ساتھ پھاند کر جسٹس صاحب بھی ماشاء اللہ بزرگ ہو گئے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر وفاقی وزیر سماجی بہبود محترمہ عطیہ عنایت اللہ کی زیارت بھی ہوئی۔ سولہ سال کی عمر سے جو عینک میری آنکھ پر لگی ہوئی ہے اس میں مجھے کوئی خاتون کبھی بزرگ نظر نہیں آئی۔ حال ہی میں ملکہ ترنم نے خود اعلان کر دیا ہے کہ نظر بد دور وہ پچھتر سال کی ہو گئی ہیں ورنہ میں نے تو انہیں ہمیشہ ''خاندان'' والی بے بی نور جہاں کے روپ میں ہی دیکھا۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے انہوں نے ایک فلمی گانا ''وے منڈیا سیالکوٹیا! تیرے مکھڑے تے کالا کالا تل'' گایا تھا۔ میں نے جب بھی ان کی نہایت جوان اور شوخ وشنگ آواز میں یہ گانا سنا، شرما گیا کہ اگر چہ میرے مکھڑے پر کالا کالا تل تو نہیں لیکن میں ''سیالکوٹیا'' تو ضرور ہوں۔ عینک کے علاوہ اب آلہ سماعت بھی استعمال کرنے پر مجبور ہوں۔ آلہ سماعت ایک ایسی ایجاد ہے جو گرد و پیش کی ہر آواز کا ملغوبہ بنا دیتی ہے لیکن وہ آواز نہیں سن پاتی جو آدمی سننا چاہتا ہے۔ چنانچہ محترمہ عطیہ عنایت اللہ کی گفتگو کا کوئی کوئی لفظ میرے کان میں پڑا لیکن تفصیل صبح کے اخبار سے معلوم ہوئی کہ حکومت نے بزرگوں کے پیکج نمبر دو کا اعلان کیا ہے یہ پانچ نکاتی ایجنڈا ہے جن پر عمل درآمد کرانے کے لئے چیف ایگزیکٹو صاحب نے ایک ٹاسک فورس قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ نکات درج ذیل ہیں: (1) حکومت بزرگ شہریوں کا ''ٹیلنٹ پول'' بنائے گی۔ بڑا عمدہ

خیال ہے نکتہ آفرینی کی داد نہ دینا ظلم ہوگا لیکن میں سوچتا ہوں کہ جو ٹیلنٹ ساٹھ سال کی عمر تک دریافت نہ ہوسکا اب وہ کس جادو کی چھڑی سے بزرگ شہری کے سال خوردہ جسم اور ضعیف و بیمار ذہن سے برآمد کرلیا جائے گا۔ یوں دیکھا جائے تو ان دنوں وفاقی اور صوبائی وزارتوں میں بزرگوں کا ٹیلنٹ پول ہی تو کام کر رہا ہے۔ تاہم بہتر یہی ہے کہ جوان ڈاکٹروں، انجینئروں، اساتذہ، سائنس دانوں اور ٹیکنیشنوں کے ٹیلنٹ پول بنائے جائیں تاکہ ملک سے بے روزگاری دور ہو اور یہ لوگ معاشی طور پر اس قابل ہوسکیں کہ اپنے اپنے بزرگ شہریوں کی خدمت کرسکیں۔ (2) مخصوص رنگ کے شناختی کارڈ کا اجرا: تاکہ ہر سطح پر ان کی شناخت ہوسکے۔ شناخت تو کارڈ کے بغیر بھی ہوسکتی ہے۔ ہاں! کچھ چہرے ایسے ضرور ہیں جو اپنی عمر کو بڑی کامیابی سے چھپا لیتے ہیں مثلاً میرے برادر خورد سجاد نقوی اور میرے دوست عبدالحمید خاں اور شاہدہ واسطی۔ ان پر یہی گمان گزرتا ہے کہ انہوں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی ہے۔ شناختی کارڈ کا رنگ مخصوص ہوگا ممکن ہے کہ رنگ بہت شوخ اور خوشنما ہو۔ بچہ اور بزرگ ایک برابر ہوتے ہیں۔ بزرگ کارڈ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہے گا گویا۔

کھلونا دے کے بہلایا گیا ہوں

(3) معمر افراد کا پارکوں، عجائب گھروں اور لائبریریوں میں مفت داخلہ، اکثر محلوں اور بستیوں میں پارک موجود ہیں لیکن وہاں بزرگوں کا داخلہ ممنوع ہے کہ وہاں بچے کرکٹ کھیل رہے ہوتے ہیں۔ باقی رہی محفوظ سیر گاہیں تو وہاں تک پہنچتے پہنچتے اکثر بزرگوں کی باقی ماندہ عمر بھی صرف ہو جائے گی۔ عجائب گھر اور لائبریریاں ان کے گھروں سے کوسوں فاصلے پر ہیں اور معمر بزرگوں کی کمر میں اتنی لچک کہاں کہ ویگن میں مرغا بن سکیں؟ اور کتنے بزرگ ہیں کہ جو کتاب خوان ہیں؟ بزرگوں کے لئے سب سے بہتر سیر چڑیا گھروں کی ہے کہ وہاں اپنے ہم عمر ہاتھیوں، گینڈوں، دریائی گھوڑوں اور بن مانسوں سے ملاقات ہوسکتی ہے۔ (4) پنشن کے کاغذوں کی ریٹائرمنٹ سے ایک ماہ پہلے تیاری: ۔ یہ سہولت تو پہلے سے موجود ہے لیکن میں مئی 1983ء میں ریٹائر ہوا تھا اور پہلی پنشن فروری 1984ء میں ملی تھی۔ پنشن کے حصول میں میری پتلون لنگوٹی تو نہ بنی کیونکہ میں نے شلوار پہننی شروع کر دی تھی البتہ جوتے ضرور گھس گئے تھے۔ (5) پے اینڈ پنشن کمیٹی سے کہا گیا ہے کہ وہ ریٹائرڈ افراد کی پنشنوں کو موجودہ مہنگائی کے حساب سے ترتیب دے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا تیری آواز مکے اور مدینے، میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کافی جی لیا ہے تاہم اب تو فروری

2001ء تک جینا ہی پڑے گا کہ تماشائے اہل کرم دیکھا جا سکے۔ ایک چھٹا نکتہ بھی ہونا چاہئے تھا کہ پرانے اور نئے پنشنروں کی پنشنوں میں تفاوت کو دور کیا جائے گا۔ یہ نکتہ کہیں نظر نہ آیا تو ناامیدی نے کہا کہ اب فروری 2001ء تک جینے کا فائدہ؟ کچھ فیصلے معمر افراد کی بہبود کی تنظیموں سے مشورے کے بعد بھی ہوئے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ معمر افراد کی بہبود کی تنظیمیں کہاں قائم ہیں۔ مجھے تو اپنے اردگرد کہیں نظر نہیں آتیں۔ ان کے مشورے سے معمر افراد کی دیکھ بھال کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جائے گا۔ اس وقت ملک میں 72 لاکھ بزرگ افراد ہیں۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا۔ یتیموں اور لاوارث بچوں کے لئے جو دارالامان اور دارالشفقت قائم ہیں انہوں نے تو آج تک دیکھ بھال کا کوئی مثالی معیار قائم نہیں کیا۔ معمر افراد کی بڑھتی ہوئی شرح روکنے کے لئے بہبود آبادی کا کوئی نسخہ آزمایا نہیں جا سکتا تو اسی تناسب سے بڑھنے والے مسائل کو کیسے حل کیا جائے گا؟ جوائنٹ فیملی سسٹم ہمارے ہاں صرف اس طبقے میں ہے جو ایک ہی مکان میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ کچھ سمجھ میں آ نہیں رہا کہ اسے مربوط کیسے بنایا جائے گا۔ جہاں تک بزرگوں کی سماجی حیثیت کا تعلق ہے اللہ کا شکر ہے کہ بہت سے گھروں میں انہیں برداشت کیا جا رہا ہے۔ یہ قرآن کا فرمان ہے جس پر عمل ہو رہا ہے۔ ایک عام آدمی کو جو روٹی ملتی ہے وہی اس کے بزرگ کو کھانا پڑتی ہے۔ اس روٹی کو پورے دانتوں والا نہیں چبا سکتا۔

بیچارہ بزرگ کیسے چبائے گا؟ کیا حکومت ایسے بزرگوں کو بتیسی لگوا دے گی یا انہیں بہتر یعنی نرم خوراک مہیا کرے گی؟ بزرگوں کو عینک اور آلہ سماعت کی ضرورت بھی لاحق ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں بزرگوں کے لئے اولڈ ہوم ہوتے ہیں۔ کیا حکومت اس قابل ہے کہ کسی صحت افزا مقام پر ان کے لئے کوئی اولڈ ہوم یا شانگریلا ہوسٹل قائم کر دے؟ کم از کم یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہر بزرگ کو حیات کے ختم ہونے سے پہلے کسی پوش ہسپتال میں ایک ہفتے کی مہمانی کا شرف ضرور بخشا جائے۔ مجھے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی این جی او اس کارِ خیر کے لئے آگے بڑھے گی۔

23 اکتوبر 2000ء

پہلی اینٹ کا معمار

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
اس کی صنعت ہے روح انسانی

یہ کتنا بڑا اعزاز ہے جو علامہ نے ابتدائی تعلیم کے استاد کو عنایت فرمایا ہے!

جب بچہ مکتب میں آتا ہے تو اس کی فطرت میں بہت لچک ہوتی ہے۔ استاد جس طرف چاہے اسے موڑ سکتا ہے بشرطیکہ استاد میں روح انسانی کے عمارت گر کی صفات موجود ہیں۔

پرائمری سکول کے اساتذہ سے میرا تعلق نہایت گہرا رہا ہے۔ وہ میرے استاد بھی تھے۔ میرے رفیق کار بھی اور میرے دوست بھی۔ ان میں سے اکثر بہت اچھے صاحب دل استاد تھے۔ ان کے اپنے کردار میں بھی عظمت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے قول و فعل میں درویشی تھی اور وہ سفید پوشی کا بھرم بھی قائم رکھتے تھے۔ ان میں عمارت گری کی صفات بھی تھیں لیکن کیا قومی سطح پر کبھی ان کی عمارت گری کا تحسین ہوئی؟ نہیں! مجھے آج سے چالیس سال پہلے کے چودھری احمد دین یاد آتے ہیں جو ڈی بی پرائمری سکول ڈسکہ کے ہیڈ ماسٹر تھے اور انہوں نے اپنے سکول کو نامساعد حالات کے باوجود ایک مثالی ادارہ بنا دیا تھا۔ وہ ایک خوش پوش درویش تھے، حکیم و دانا اور افسران بالا بھی ان کی عزت کرتے تھے، ان سے مشورے کرتے تھے لیکن ریٹائرمنٹ پر سوائے نیک نامی کے انہیں کچھ نہ ملا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی غنیمت تھا۔

دیکھا جائے تو عمارت گری کا سلسلہ پرائمری سکول سے یونیورسٹی تک پہنچتا ہے لیکن پہلی اینٹ رکھنے کا اعزاز پرائمری سکول کے استاد ہی کو حاصل ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ”اگر معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھ دے تو دیوار ثریا کی بلندی تک پہنچ کر بھی ٹیڑھی ہی رہے گی۔ یہ پڑھ کر جب میں نور پور کلاں کے ٹوٹے پھوٹے پرائمری سکول کے صحن سے یونیورسٹی کے خوبصورت کیمپس تک پہنچتا ہوں، تو خوف سے لرزنے لگتا ہوں۔ یہاں کی عظیم عمارات دیکھ کر مجھے ”پیسا

کا مینار کج'' یاد آ جاتا ہے کہ جس کی پہلی اینٹ میں کجی تھی اور اب اس کجی کو دوام دینے کے لئے اسے بہت سے آسرے اور سہارے دیئے جا رہے ہیں۔

ہمارے نظام تعلیم کی پہلی اینٹ میں کجی اس لئے ہے کہ عمارت گر بالعموم پہلی اینٹ کو راست رکھنے کا اہل نہیں۔ اس کی تعلیم کم ہے' اس کی تربیت ناقص ہے۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہے۔ اسے اتنی تنخواہ نہیں ملتی کہ وہ عزت کی بافراغت زندگی بسر کر سکے۔ اسے ایسا ماحول بھی مہیا نہیں کیا جاتا کہ وہ اپنے اندر کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے۔ کبھی وہ مڈل پاس جے وی ہوا کرتا تھا' اب میٹرک پاس پی ٹی سی ہوتا ہے۔ اسے پانچویں گریڈ کی تنخواہ ملتی ہے۔ اگر وہ اپنی تعلیمی قابلیت بہتر نہ بنائے کہ جس کی سہولت بہت کم اساتذہ کو ملتی ہے' تو وہ اول مدرس کے عہدے سے آٹھویں گریڈ میں ریٹائر ہو جاتا ہے۔ اکثر پرائمری سکولوں میں غیر تربیت یافتہ اساتذہ پڑھاتے ہیں کچھ ان پڑھوں کے نام بھی قبض الوصول میں درج ہوتے ہیں کہ گھر بیٹھے تنخواہیں وصول کرتے ہیں۔

میں اپنے ناولٹ ''شمیرا'' سے آج سے تقریباً پچاس سال پہلے کے پرائمری سکول کے دو اساتذہ کی تصویر پیش کرتا ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ پرائمری سکول کے اساتذہ کی زبوں حالی کا کچھ نقشہ ذہن میں آ سکے۔ ''اس سکول کی عمارت دو کچے کمروں پر مشتمل تھی اور اس کے صحن میں دھول اڑتی تھی۔ سکول میں پانچ جماعتیں تھیں اور تین استاد تھے۔ اک بڑے میاں' دوسرے چھوٹے میاں' دونوں سبحان اللہ بڑے میاں جو اس کے اول مدرس تھے' ان کی آنکھوں میں موتیا اتر رہا تھا' تاہم پرانا سکہ تھا' اس لئے جہاں تک ممکن ہوتا' اپنے رزق کو حلال بنانے میں مصروف رہتے وہ پانچویں جماعت کو پڑھاتے تھے۔

چھوٹے میاں چالیس پینتالیس سال کے بیٹے میں تھے اور ان کے دانت گر گئے تھے۔ کہتے تھے' نزلہ مار گیا' بتیسی لگوانے کے لئے رقم جمع کر رہے تھے۔ پوپلا منہ اور پچکا ہوا چہرہ......وہ دو جماعتوں کو پڑھاتے تیسری اور چوتھی اور کام میں لگے رہتے''

تیسرا استاد ناولٹ کا مرکزی کردار ماسٹر قریشی ہے جو انیس سال کی عمر میں جے وی کر کے اس سکول میں متعین ہوا ہے۔ ''تعلیم و تعلم کے ان دو سینئر نمائندوں کو دیکھ کر اس کی طبیعت بہت افسردہ ہوئی تھی۔ اس نے اپنی تربیت کے دوران استاد کی عظمت کے بہت سے گن سنے تھے اور گائے بھی تھے۔ اچھے استاد کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ وہ سادہ لیکن صاف ستھرا لباس پہنتا ہے۔ اس کے دونوں سینئر لباس کے معاملے میں بہت ہی سادہ تھے۔ گھر سے تہبند باندھ کر

آتے یہاں آ کر لکڑی کے صندوق میں رکھی سلوٹوں کی ماری شلوار پہن لیتے تھے یہ شلوار کبھی کبھار ہی دھلتی تھی، لیکن یہ استاد اپنے پیشے سے مخلص ضرور تھے۔ بچوں سے ہمدردی رکھتے تھے اور انہیں محنت سے پڑھاتے تھے آج کے پرائمری سکول کا استاد ممکن ہے لیکن وہ اپنے زمانے کے عمومی تنزل کا شکار ہو گیا ہے۔ اس کی اپنے پیشے سے وابستگی یقیناً کمزور پڑ گئی ہے۔ اکثر والدین کی شکایت کرتے ہیں کہ اساتذہ بچوں کو محنت سے نہیں پڑھاتے۔

پنجاب یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کہا کرتے تھے کہ ہم نے اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم غلاموں کے سپرد کر دی ہے۔ رومی حکومت کے زوال کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم ان غلاموں کے سپرد کر دی تھی جو ایشیا اور دوسرے متمدن خطوں سے اسیر ہو کر آیا کرتے تھے۔ ''ایسپ'' بھی ایک ایسا ہی استاد تھا جو ایک رومی نواب کا غلام تھا ''ایسپز ٹیلز'' اسی سے منسوب ہیں۔ وہ ایک فلسفی تھا کہتے ہیں کہ اس کا شاگرد کسی بات پر اس سے ناراض ہو کر اس کی ٹانگ مروڑنے لگے۔ اس نے کہا کہ دیکھو لڑکے، ٹانگ ٹوٹ جائے گی'' ٹانگ ٹوٹ گئی تو فلسفی ایسپ بولا'' کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ ٹانگ ٹوٹ جائے گی؟ کیا میں اکثر نہیں کہا کرتا کہ جب کوئی کام کرنا چاہو، پہلے اس کے نتائج وعواقب پر غور کر لیا کرو؟'' افسوس کہ مجھے پرائمری سکول کے اساتذہ میں سے اس پائے کے دانا و حکیم سے ملنے کا شرف حاصل نہیں ہوا تاہم اس واقعے میں استاد کی جس بے بسی کی کیفیت موجود ہے، اس کا مشاہدہ ضرور رہا ہے۔

آج کل پاکستان میں بہت سے پرائیویٹ سکول کھل گئے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر حکومت یونیورسل اور لازمی پرائمری تعلیم کے لئے سکول مہیا کرنے سے قاصر رہی ہے، تو ان اداروں کا وجود غنیمت ہے۔ ایسے ہی ایک ادارے میں پڑھانے والی ایک بی بی سے میں نے پوچھا کہ آپ کتنی تنخواہ لیتی ہیں تو انہوں نے کہا'' انکل! نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے'' میرے اصرار پر بتایا کہ جس نرسری کلاس کو پڑھاتی ہوں اس کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے اور مجھے پانچ بچوں کی فیس کے برابر تنخواہ ملتی ہے۔ ان سکولوں کے اکثر اساتذہ ان ٹرینڈ ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سرکاری ملازم میٹرک پاس پی ٹی سی کی تنخواہ ان سے کہیں بہتر ہے۔ ترقیاں بھی لگتی رہتی ہیں اور وہ پنشن کا حقدار بھی ہے۔

حال ہی میں ایک خبر چھپی ہے کہ پرائمری سکولوں سے ٹاٹ لپیٹے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ ڈیسک رکھے جا رہے ہیں میں کہتا ہوں کہ اس کی بجائے پہلی اینٹ کے معمار کو مطمئن کر دیا جائے تو بہتر ہے کہ ثریا تک عمارت راست رہے۔

12 نومبر 2000ء

یہ نامہ بر ہمارے

پچھلے دنوں ایک خبر پڑھی کہ محکمہ ڈاک خانہ جات نہ صرف خود کفیل ہو گیا ہے بلکہ گزشتہ سال اس نے دس کروڑ روپے کا منافع بھی کمایا۔ یہ ایک مثبت خبر ہے اور ہمیں ان دنوں مثبت خبروں پر کم ہی یقین آتا ہے۔ تاہم خبر کا دوسرا حصہ پڑھ کر ماتھا کچھ ٹھنک سا گیا۔ محکمے کے سربراہ نے سفارش کی ہے کہ خط لفافے اور رجسٹری وغیرہ کی شرح دگنی کر دی جائے تو منافع پچاس کروڑ ہو سکتا ہے۔ اس میں کچھ حساب کی غلطی ہے۔ 10 کروڑ کا دگنا 20 کروڑ ہوتا ہے لیکن آج کا دور اعداد و شمار کا کرشماتی دور ہے ممکن ہے ایسا بھی ہو جاتا ہو۔ اس خبر کا منفی پہلو یہ ہے کہ میرے جیسے اگلے وقتوں کے لوگ جو ابھی تک ٹیلی فون سے الرجک ہیں اور جو غالب کی طرح گرچہ مطلب کچھ نہ ہو، خط ضرور لکھا کرتے ہیں۔ انہیں لفافے کی قیمت ساڑھے چار روپے ہو جانے کی وجہ سے خاصی اکانومی سے کام لینا پڑے گا اور دل کی بہت سی باتیں دل ہی میں رہ جایا کریں گی۔ لہٰذا اس ناروا اضافے کے خلاف پرزور احتجاج کرنا پڑے گا۔

لیکن اگر یہ اعلان کر دیا جائے کہ اس منافع میں سے ایک حصہ پوسٹ مین کی تنخواہ اور مراعات میں اضافے پر خرچ کیا جائے گا، تو میں اپنا الٹی میٹم واپس لینے کو تیار ہو۔ محکمہ ڈاک خانہ جات کا میرے ساتھ جو تعلق ہے، اس کا انحصار پوسٹ مین اور صرف پوسٹ مین پر ہے۔

میری تو پوسٹ مین سے جذباتی وابستگی اس زمانے سے ہے جب میں اپنے گاؤں بھڑتھ کے پرائمری سکول میں پڑھتا تھا۔ میرے والد مرحوم ضلع منٹگمری کے کسی سکول میں اورینٹل ٹیچر تھے۔ ہمارا ڈاک خانہ سیالکوٹ چھاؤنی میں تھا اور ہمیں جو خط بھی ان کی طرف سے آتا تھا، وہ منشی محمد شفیع بھٹی مرحوم پوسٹ مین کی معرفت آتا تھا۔ جس دن مجھے خط کے آنے کا انتظا ہوتا، میں سہ پہر کو چھاؤنی کی طرف سے آنے والی کچی سڑک پر جا کھڑا ہوتا وہ نالہ پلکھو کو، جس پر اس زمانے میں پل بھی نہیں تھا پار کر کے اس کنارے نظر آتے تو میرا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ وہ آہستہ آہستہ سائیکل چلاتے تھے۔ بڑی دیر بعد مجھ تک پہنچتے اور سائیکل سے اتر کر کہتے ''شاہ جی! آج تو

آپ کا خط نہیں آیا'' جب میں مایوس ہو جاتا تو مسکرا کر جیب سے خط نکالتے اور میرے ہاتھ میں تھما دیتے خود بھی خوش ہوتے اور اپنی پر خلوص خوشی کو میرے دل میں بھی اتار دیتے۔ بعض اوقات واقعی خط نہیں آتا تھا' تو وہ کہتے'' شاہ جی! کل ضرور آئے گا'' گاؤں کے اکثر لوگ انہی کی معرفت خط منگواتے تھے۔ وہ گاؤں والوں کو خطوط کے جواب بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ پہلی تاریخ کو انہیں جو بچہ ملتا' اسے ایک پیسہ دیتے اور گاؤں کے بچے پہلی تاریخ کو سڑک کے کنارے ان کا استقبال کرتے تھے۔

ساتویں جماعت میں انگریزی کے ماسٹر صاحب نے پوسٹ مین کے موضوع پر چند فقرے تختہ سیاہ پر لکھے اور ہمیں کہا کہ اپنی کاپی پر خوشخط نقل کر لیں۔ ان میں دو فقرے ایسے تھے جن پر مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ کام کے مقابلے میں پوسٹ مین کی تنخواہ بہت کم ہے وہ اپنی زندگی کے دونوں سرے بڑی مشکل سے ملاتا ہے۔

جب میں سکول میں پڑھاتا تھا تو نویں یا دسویں کو پوسٹ مین پر روائتی مضمون لکھوا کر سفارش کرتا تھا کہ حکومت کو اس کی تنخواہ میں معتد بہ اضافہ کرنا چاہئے اور آج اس کالم میں بھی یہی سفارش کروں گا کہ پوسٹ مین کو زیادہ نہیں تو اس کی محنت کا جائز معاوضہ ضرور ملنا چاہئے۔ سرمایہ دارانہ معاشرے میں سب سے کم معاوضہ اس فرد کو ملتا ہے جو سب سے زیادہ محنت کرتا ہے مثلاً مزارع' مزدور' لائن مین' پرائمری سکول ٹیچر' پٹواری' پولیس کا سپاہی چپڑاسی اور پوسٹ مین وغیرہ پٹواری اور پولیس مین تو ازل سے کم تنخواہ پر راضی ہیں اور ابد تک رہیں گے۔ بشرطیکہ انہیں تنخواہ کی کمی کے ازالے کا حق حاصل رہے۔ بعض محکموں کے چپڑاسی بھی بہت مطمئن رہتے ہیں۔

کم تنخواہ کے باوجود پوسٹ مین عام طور پر دیانت داری کے دامن سے وابستہ رہا ہے۔ گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں اس کی کارکردگی میں کچھ تنزل ضرور نظر آیا ہے مثلاً خطوط پر سے ٹکٹ اتارنے کا الزام اس پر لگا حالانکہ ضروری نہیں کہ پوسٹ مین ہی ٹکٹ اتارتا ہو۔ خطوں پر مہر لگانے والا بھی اس میں ملوث ہو سکتا ہے۔ باہر کے ملکوں سے آنے والے ہر لفافے پر اسے گمان گزرتا ہے کہ اس میں کوئی ڈالر یا پاؤنڈ ضرور ہو گا چنانچہ ہزاروں لفافے اپنی منزل مقصود پر نہیں پہنچتے۔ مجھے کچھ ادبی رسالے مفت میں ملتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی رسالہ ڈاک کی نذر ہو جاتا ہے میں خوش ہوتا ہوں کہ چلئے کسی باذوق نے پڑھا تو ضرور ہو گا لیکن ایک بار میں نے فٹ پاتھ پر تازہ بتازہ رسالے کوڑیوں کے مول بکتے ہوئے دیکھے' تو افسوس بھی بہت ہوا۔

پوسٹ مین کو محکمے نے کوئی مراعات نہیں دیں۔اس کی رہائش کے لئے سرکاری کوارٹر تعمیر نہیں ہوئے۔اس کے بچوں کی تعلیم کے لئے سکول نہیں کھولے گئے۔کیا ضروری ہے کہ پوسٹ مین کا لڑکا بھی پوسٹ مین ہی بنے' اسے پوسٹ ماسٹر جنرل بننے کا حق بھی حاصل ہے۔پوسٹ مین کا حلقہ بہت وسیع ہوتا ہے چنانچہ خطوط دو دو چار چار دن تاخیر سے ملتے ہیں۔کئی پوسٹ مینوں کو سائیکل پر میلوں کا سفر روانہ کرنا ہوتا ہے۔محکمے کو چاہئے کہ انہیں موٹر سائیکل مہیا کرے لیکن پٹرول کا خرچ بھی ضرور دے۔جو پوسٹ مین گنجان محلوں اور بازاروں میں ڈاک تقسیم کرتے ہیں' انہیں باٹا سے بنوا کر مضبوط جوتے مہیا کئے جائیں تاکہ تلوے نہ گھسیں وردی انہی جیسی ہے' مل تو رہی ہے البتہ اس کی دھلائی کے لئے انہیں الاؤنس بھی ملنا چاہیے۔کبھی میں بازاروں محلوں میں کئی پوسٹ مینوں کو اکثر ڈاک تقسیم کرتے دیکھا کرتا تھا۔ان کی وردیاں میلی ہوتی تھیں اور چپلوں کی ایڑیاں گھس کر مسافرت کی دھول میں تحلیل ہو چکی تھیں۔

لہٰذا محکمہ ڈاک خانہ جات کو لفافے کی قیمت اور رجسٹری فیس صرف اسی صورت میں بڑھانے کا حق حاصل ہے کہ وہ منافع کا بڑا حصہ پوسٹ مین کی بہبود پر صرف کرے تاکہ معاشرے کے اس نہایت اہم فرد کی نہ صرف عزت نفس بحال ہو بلکہ وہ خوشحالی کی زندگی بسر کرے۔اگر ایسا نہ ہوا تو لفافوں پر سے ٹکٹ اترتے رہیں گے۔غیر ملکی لفافے کھلتے رہیں گے اور ادبی رسائل فٹ پاتھ پر بکتے رہیں گے۔

24 نومبر 2000ء

وزیراعظم کی تلاش

اکتوبر کے آخری ہفتے میں وطن عزیز کے ایک سابق عبوری وزیراعظم لاہور تشریف لائے۔ انہیں نوائے وقت نے ''امپورٹڈ وزیراعظم'' کا خطاب عطا کیا ہوا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً لاہور میں اپنے اعزاہ واقارب سے ملنے آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کی والدہ مرحومہ کا مزار میانی صاحب میں ہے۔ ممکن ہے' یہاں فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہوں جب وہ تین ماہ کے لئے وزیراعظم بنے تھے تو اس کا انہوں نے یہ فائدہ اٹھایا تھا کہ اتنے بڑے شہر خموشاں میں اپنی والدہ مرحومہ کی قبر کا کھوج لگوایا اور پھر لوح مزار کی جھاڑ پونچھ کروائی تھی اور والدہ کی وفات کے ایک عرصہ بعد ایک خدمت گزار بیٹے کا فرض ادا کیا تھا۔ قرض تو کوئی ادا نہیں کر سکتا؟ وہ اتنے عرصے سے امریکہ میں رہ رہے ہیں کہ امریکہ ان کے گوشت پوست میں رچ گیا ہے تاہم وہ کہتے ہیں کہ میں امریکہ کے کلچر میں رسا بسا نہیں میں تو پاکستانی ہوں۔

لیکن جب بھی وہ لاہور آتے ہیں' اخبارات والے انہیں لے اڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ معین قریشی ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے گماشتہ ہیں۔ جب بھی آتے ہیں پاکستان کے لئے کوئی خوشخبری لے کر نہیں آتے۔ اس بار انہوں نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پاکستان ڈیفالٹ کرنے والا ہے۔ ڈیفالٹ کا لفظ سن کر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی زلزلہ آنے والا ہے اور پاکستان خدانخواستہ تہہ و بالا ہونے والا ہے لیکن اس بار انہیں جو شہرت ملی' اس کی وجہ کچھ اور تھی۔

میرا خیال ہے کہ پاکستان کے چیف ایگزیکٹو نے امریکی اخبارات میں ایسا کوئی اشتہار نہیں دیا تھا کہ پاکستان میں امپورٹ کرنے کے لئے ایک وزیراعظم کی ضرورت ہے۔ البتہ انہی دنوں ان کے منہ سے نکل گیا ہے کہ اگر میں اپنے ایجنڈے میں ناکام ہوا تو حکومت کسی بہتر آدمی کے سپرد کر دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ معین قریشی کے کان میں بھی یہ بھنک پڑ گئی اور وہ پاکستان آ گئے کہ کیا پتہ جنرل صاحب کی نگاہ انتخاب ان پر پڑ جائے۔ میں ایک صاحب کو جانتا ہوں جو ہر قابل ذکر ادبی جلسے میں چپکے سے پچھلی صف پر آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار یہ ہوتا

کہ اصل صاحب صدارت تشریف نہ لاتے اور منتظمین منت وسماجت کر کے انہیں پچھلی صف سے اٹھا کر کرسی صدارت پر بٹھا دیتے تھے وہ تکلفاً کچھ حیل وحجت سے کام لیتے تھے لیکن صدارت کی خدمت بجالانے سے پہلے کوئی شرط پیش نہیں کرتے تھے۔

بھلا پاکستان کو پچھلی صف سے کسی وزیراعظم کو اٹھا کر اگلی صف میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگلی صف میں کئی وزارت عظمیٰ کے امیدوار پہلے سے براجمان ہیں۔ دو امیدوار تو ایسے ہیں جنہیں دو دو مرتبہ وزارت عظمیٰ کا تجربہ حاصل ہے۔ بے نظیر بھٹو تو ملک کی تقدیر بدلنے کو فوراً باہر سے واپس آنے کو تیار ہیں۔ ان کے قول کے مطابق پاکستان کے عوام ان کے راستے میں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔ دوسرا نام نواز شریف کا ہے وہ بھاری مینڈیٹ سے وزیراعظم بنے تھے کیوں نہ وزارت عظمیٰ انہیں لوٹا دی جائے؟ اب وہ کافی عبرت حاصل کر چکے ہوں گے۔ جناب معراج خالد جناب بلخ شیر مزاری اور جناب غلام مصطفیٰ کا تجربہ انہیں بھی حاصل ہے۔ عبوری وزارت عظمیٰ کا تجربہ انہیں بھی حاصل ہے۔ اگرچہ نوابزادہ نصراللہ خان کچھ زیادہ ہی بزرگ ہو گئے ہیں لیکن جب تک ان کا دمساز حقہ موجود ہے اور ان کے دم میں دم ہے وزارت عظمیٰ ان کے لئے کچھ مشکل نہ ہوگی۔ قاضی حسین احمد ہیں جنہوں نے حال ہی میں الہ دین کے چراغ کے بغیر دنوں میں قرطبہ نام کے ایک شہر کو آثار قدیمہ سے برآمد کیا اور چکری کے نواح میں آباد کر دیا اور پانچ لاکھ کا مجمع لگا کر ثابت کر دیا کہ وہ وزارت عظمیٰ کے اہل ہیں۔ وہ ایک خوش پوش درویش ہیں ایک نہایت آسان سا اسلامی نافذ کر کے اپنے دور کو تاریخ اسلام کا ایک ورق بنا سکتے ہیں۔ علامہ طاہر القادری اگر چاہیں تو قاضی صاحب سے زیادہ بڑا شہر آباد کر کے ان سے زیادہ بڑا مجمع لگا سکتے ہیں۔ عمران خاں ہیں کہ ان کی ذات میں اب بھی گلیمر موجود ہے اور ان کی پرستار نسل کو ووٹ کا حق بھی مل گیا ہے۔

تفنن برطرف ٹیلی ویژن پر دو تین بار جلوہ دکھا کر معین قریشی امریکہ چلے گئے ہیں چلتے چلتے یہ اعلان کر گئے ہیں کہ وہ پاکستان میں 50 ملین ڈالر لگائیں گے اور ڈیڑھ ارب ڈالر سے اسلامی فنڈ قائم کریں گے۔ اس سے پہلے وہ بھارت میں 150 ملین کی سرمایہ کاری کر چکے ہیں نیز وہ بنیاد پرست مسلمان ہیں۔ امریکہ بے اعتبار ملک ہے ہمیشہ مایوس کیا وہ کلمہ گو مسلمان ہیں۔ ان کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہئے۔ تاہم ان کے بیان میں دو چیزیں کھٹکتی ہیں۔

۱۔ بھارت میں ڈیڑھ سو ملین ڈالر لگانے کے بعد انہیں اچانک یہ خیال کیسے آیا کہ انہیں پاکستان اور اسلام کی خدمت بھی کرنی چاہیے؟

۲۔ اتنا عرصہ امریکہ کا نمک کھانے کے باوجود اچانک اسے "بے اعتبار" کیوں کہنے لگے ہیں؟

دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے انہوں نے ایک خوشخبری بھی دی ہے کہ اگلے سال جنرل مشرف صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے الیکشن کروا دیں گے تو گویا فی الحال کسی وزیر اعظم کے امپورٹ ہونے کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ مجھے امید واثق ہے کہ اگر اگلے سال الیکشن ہوئے تو ہمیں ملک کے اندر ہی سے وزیر اعظم مل جائے گا۔

28 نومبر 2000ء

بچے دو ہی اچھے

ایک عرصے سے وزارت بہبود آبادی کی طرف سے زیرعنوان سلوگن سنایا اور دکھایا جارہا ہے اور بچوں کے نصاب میں بھی کسی نہ کسی صورت میں داخل ہے حالانکہ اسے بڑوں کے نصاب میں شامل ہونا چاہئے تھا جو اکثر اس پر عمل نہیں کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وزارت بہبود آبادی نے یہ سلوگن بھی کہیں سے سن رکھا ہے کہ بچے بوڑھوں کے استاد ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر کئی نغمے بھی نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اور ڈرامے بھی دکھائی جاتے ہیں۔ کبھی جب میں ماشاء اللہ پانچ بچوں کا سربراہ بننے کا اعزاز حاصل کر چکا تھا' میں نے ایک افسانہ ''شاطی'' لکھا۔ شعوری طور پر میں نے یہ افسانہ بہبود آبادی کیلئے نہیں لکھا تھا لیکن ایک نقاد نے اسے ایک پراپیگنڈہ افسانہ قرار دیا تھا کہ اتفاق سے ''شاطی'' ایک خاندان کا آٹھواں اور سب سے چھوٹا بچہ تھا جو ریل کے ڈبے میں اپنی ماں کے برقعے میں چھپنے کی بجائے ایک اور عورت کے برقعے میں پناہ گزیں ہو گیا اور گاڑی سے اترتے وقت ماں باپ افراتفری میں بھول گئے۔ بعد ازاں پروڈیوسر محمد عظیم نے اسے ٹیلی وژن سکرین پر پیش کی اور اسے خاصی داد ملی۔ اگرچہ اشتہار کوئی نہیں ملا تھا اس زمانے میں ٹیلی وژن اشتہارات کے بغیر بھی بڑی خوش اسلوبی سے چلتا تھا۔

آج کل وزارتِ بہبود آبادی کی طرف سے ایک اشتہار دکھایا جارہا ہے کہ بہبودِ آبادی کی ایک خوبصورت لڑکی ایک صندوقچی نما بیگ ہاتھ میں لے کر دیہاتی کی چارپائی نشین بڑی بوڑھیوں سے مل رہی ہے اور انہیں کچھ سمجھا رہی ہے۔ کچھ خاموش سا اشتہار ہے بڑی بوڑھیوں کے ہونٹ ہلتے ہیں' آواز نہیں آتی کہتی ہوں گی ''بیٹی اس کی ضرورت تمہیں ہے' ہم نے تو جتنی بہبودِ آبادی کرنی تھی' کر لی ہے'' سنا ہے کہ ایسی بہت سی لڑکیاں ''موٹی ویٹر'' کے طور پر منتخب ہوئی تھیں اور ہوتی رہتی ہیں کہ گھر بیٹھے تنخواہ لیتی ہیں صرف سکرین پر آنے والی لڑکی مصروفِ عمل دکھائی دیتی ہے۔ اشتہار دکھا کر باقی وزارتوں کی طرح وزارتِ بہبودِ آبادی بھی مطمئن ہو جاتی ہے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

جب 1947ء میں پاکستان وجود میں آیا تھا تو اس حصے کی کہ جسے ہم ''مغربی پاکستان'' کی بجائے پورا ''پاکستان'' کہتے ہیں ساڑھے تین کروڑ آبادی تھی جو تریپن سال کے بعد نظر بددور چودہ کروڑ ہوگئی ہے۔ یعنی پورے چار گنا بڑھی ہے۔ مجھے اعداد و شمار تک رسائی نہیں' تاہم اتنا مسلّم ہے کہ جس شرح سے آبادی بڑھتی ہے' اس شرح سے زرعی پیداوار نہیں بڑھتی' ملک کی نہایت زرخیز زمینوں پر بستیاں اور شہر آباد ہور ہے ہیں' کارخانے لگ رہے ہیں۔ کھیل کے میدان اور پارک بنا رہے ہیں جو ہر ٹاؤن سے رائے ونڈ تک چلے جائیں تو معلوم ہوگا کہ جس زمین سے لاکھوں انسانوں اور جانوروں کو رزق ملتا تھا' اس پر کنکریٹ بچھ گیا ہے اور خالی پلاٹوں میں کھمبے اگ آئے ہیں۔ پچیس سال سے وطن عزیز میں کوئی ڈیم نہیں بنا۔ نہروں کا پانی کم ہو رہا ہے۔ جتنی زمین زیر کاشت ہے اس کیلئے کافی نہیں نئی زمینیں کیسے آباد ہوں گی کہ بڑھتی ہوئی آبادی کو رزق مہیا ہو سکے؟ رازق اللہ کی ذات ہے اس میں کون کافر شک کرسکتا ہے لیکن رزق انسان کو اپنی منصوبہ بندی اور محنت سے ملتا ہے۔ کبھی کبھار جب قحط پڑتے ہیں تو رزق کم بھی ہو جاتا ہے اور انسان بھوکوں بھی مر جاتا ہے شاید قدرت کی طرف سے یہ بھی بہبود آبادی ہی کا ایک ذریعہ ہو لیکن ماننے کو جی نہیں چاہتا۔ تاہم کبھی وبائی امراض عام تھے تو بہبودِ آبادی خود بخود ہو جاتی تھی۔ سیلاب بھی آتے تھے بند بھی ٹوٹ جاتے تھے اور زلزلے زمین کی تہہ و بالا بھی کر دیتے تھے۔ قدرتی آفات کے آگے تو بند باندھنا بہت مشکل ہے۔ لیکن وبائی امراض پر قابو پا لیا گیا ہے۔ قدرتی آفات انسان کی مصیبت اور بے سروسامانی میں جتنا اضافہ کرتی ہیں' اتنی بہبودِ آبادی نہیں ہوتی ایک براعظم یعنی ''اٹلانٹس'' تو شاید ایک بار اپنے بوجھ سے سمندر میں غرق ہوا اور طوفان نوحؑ کی بھی کوئی دوسری مثال نہیں رہی۔ جب ملے گی تو ایسی بہبود آبادی ہوگی کہ اس کی مثال دینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔

بات تو اس سلوگن کی ہو رہی تھی کہ بچے دو ہی اچھے اور میں کچھ زیادہ ہی فلسفی بن گیا۔ جن حکمرانوں کے زمانے میں یہ سلوگن ایجاد ہوا تھا وہ پہلے ہی دو بچوں کی سرحد عبور کر چکے تھے کسی کے چھ بچے تھے کسی کے چار اور کوئی اپنے بچوں کا شمار ہی بھول گیا تھا مثلاً ہمارے سابق گورنر جناب غلام مصطفیٰ کھر' محکمہ بہبود آبادی کا شاید ہی کوئی وزیر یا افسر ایسا ہو جس نے اس سلوگن پر عمل کیا ہو۔ میرے ایک کثیر الاولاد دوست رات کو سونے سے پہلے ایک رجسٹر سے نام پکار کر اپنے بچوں کی حاضری لگایا کرتے تھے۔ وہ گرمیوں میں چھت پر سوتے تھے۔ بارش آتی تو چارپائیاں

برساتی میں کھڑی کر دیتے اور بستر نیچے صحن میں پھینک دیتے تھے۔تب بچوں کا رول کال کرتے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ سب سے چھوٹا بچو جو شیر خوار تھا غائب نظر آیا یعنی ماں نے اس کی طرف سے "لیس سر" نہ کہا بہت تلاش کیا' نہ ملا تو مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔ناگاہ ایک بستر سے ایک ننھی سی چیخ کی آواز سنی تو سب کی جان میں جان آئی۔ننھا اپنے بستر میں لپٹا ہوا تھا بستروں کے ڈھیر پر گرا تو بچ گیا ورنہ......

میں کبھی کبھار سالوں کے وقفے کے بعد اپنے گاؤں جاتا ہوں' تو گاؤں کی گلیوں کو پہلے سے زیادہ گنجان پاتا ہوں۔اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ میں اپنے بچپن' لڑکپن اور جوانی کے کسی سائے کی بازیابی نہیں کر سکتا۔گاؤں کی شاملات پر زور آور لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ہم بچپن میں یہیں کھیلا کرتے تھے۔آج کے بچے مجبوراً انہیں گلیوں میں غل غپاڑہ مچاتے ہیں اور چیخم دھاڑ بھی۔تب بادل نخواستہ اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بچے دو ہی اچھے۔میرے گاؤں کے ایک معزز بزرگ جب بھی ملتے ہیں باہر سڑک کے کنارے کسی دکان کے بینچ پر بیٹھے ہوئے ملتے ہیں۔میں پوچھتا ہوں کہ آپ گھر میں کیوں نہیں ہوتے۔فرماتے ہیں کہ "عزیزم! (میں ان سے دو سال چھوٹا ہوں) تمہیں معلوم ہے کہ میرا گھر کبھی خاصا وسیع ہوا کرتا تھا' اب ماشاء اللہ اس میں پوتے پوتیاں' دوہتے دوہتیوں کی اتنی رونق ہوتی ہے کہ میں سڑک پر چلا آتا ہوں"

میرے بھائی شفقت حسین نقوی اس مسئلے کا ایک اور رخ دکھاتے ہیں۔آپ کو کالم کیلئے ایک ہیڈنگ دے رہا ہوں۔بچے دو ہی اچھے یا دو بچوں کا خوش حال گھرانہ مجھے گزشتہ پچاس سالوں میں اپنے گاؤں کا جو تجربہ حاصل ہوا ہے وہ بالکل الٹ ہے۔میرے گاؤں میں دو چار جوڑے ایسے ہیں جن کے سات سے بھی زیادہ بچے ہیں جب تک وہ بچے چھوٹے رہے' ان کی حالت پتلی رہی۔جونہی وہ جوان ہوئے گاؤں میں ان کے ماں باپ کی چودھراہٹ ہو گئی جس کو چاہیں ایک دو' چنّا کے لگا دیتے ہیں بچے خوب کماتے ہیں اور گھر خوش حال ہے۔جب بھی الیکشن ہوتا ہے امیدوار ووٹ لینے ان کے گھر آتا ہے۔بہتر یہی ہے کہ ایک کنبے کا ایک ہی ووٹ رکھا جائے تاکہ لوگ سمجھ سکیں کہ بچے دو ہی اچھے!" میں کہتا ہوں کہ اگر ایک کی بجائے دو ووٹ رکھا لئے جائیں تو بھی کوئی ہرج نہیں لیکن حکومت نہی مانے گی۔اس لئے جب تک کالا باغ ڈیم اور بھاشا ڈیم نہیں بنتے اور صوبہ سرحد صوبہ پنجاب صوبہ بلوچستان اور صوبہ سندھ کے بنجر علاقوں تک نہریں اور کاریزیں نہیں پہنچتیں' میں اس نعرے کی ہم نوائی پر مجبور ہوں کہ بچے دو ہی اچھے!

5 دسمبر 2000ء

بزرگوں کی عیدی

بائیس نومبر کے خبرنامے میں ایک خوشخبری سنی اور اگلے دن اخبار میں پڑھی کہ کم تنخواہ پانے والے ملازمین کو سرکاری کی طرف سے اس سال عیدالفطر پر مبلغ دو ہزار روپے عیدی ملے گی۔ پہلے تو فرطِ مسرت سے ہنس پڑا' پھر جب اس خبر میں پنشن خوار کا نام نہ آیا تو قریب قریب رو پڑا' اگرچہ آنسو بہانے سے اجتناب کیا کہ ایک فلمی بول یاد آ گیا کہ "آنسو بہا' فریاد نہ کر' یوں وہی کیفیت محسوس ہوئی کہ گھر میں چھوٹے بچے کو تو عیدی دے دی جائے اور بڑے کو عیدی سے اس لئے محروم کر دیا جائے کہ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اس تلازمے سے یاد آیا کہ عمر کی ایک منزل پر بوڑھا اور بچہ ایک برابر ہو جاتا ہے۔ قرآن مقدس سے بھی اس فطرتی رجعت کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک مترجم نے حاشیے میں لکھا ہے کہ اس عمر میں آدمی بھولی بھولی باتیں کرنے لگتا ہے۔ بزرگوں کے پیکیج 2000ء میں بزرگوں کو ایک خاص قسم کے شناختی کارڈ عطا کرنے کا وعدہ کر کے بہلایا گیا ہے جیسے انہیں کوئی کھلونا دیا جا رہا ہو۔ بہرحال اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ پیکیج تیار کرنے والوں کو یہ معلوم تھا کہ بوڑھا آخر بچہ ہی تو ہوتا ہے۔

اس لئے اگر میں کہوں کہ بچہ ہونے کی حیثیت سے بھی بوڑھے عیدی کا حق رکھتے ہیں تو حق بجانب ہوں گا۔ انہیں کچھ نہ کچھ تو عیدی ملنی چاہئے۔ خواہ وہ نہایت قلیل سی علامتی مقدار میں کیوں نہ ہو۔ سرکار کہہ سکتی ہے کہ ایک بزرگ کو خواہ وہ بچپن کی منزل پر کیوں پہنچ گیا ہو' عیدی ویدی سے ماورا رہنا چاہئے کہ بزرگ بزرگ ہوتا ہے اور بچہ بچہ۔ وہ عیدی لے کیا کرے گا؟ کسی میلے ٹھیلے میں جائے گا یا کوئی کھلونا خریدے گا؟ غبارہ اڑائے گا یا نڑ کا باجا بجا کر پوں پوں کرتا پھرے گا؟ میں کہتا ہوں' اگر ایک دن کے لئے وہ بزرگی کا لبادہ اتار کر بچہ بن جائے تو کوئی ہرج بھی نہیں۔ مجھے ذاتی طور پر جھنجھنا بہت پسند ہے۔ جھنجھنا بجتا تھا تو بچپن میں مجھے نیند آ جاتی تھی۔ جھنجھنا میری مرحومہ والدہ بجایا کرتی تھی اور یہ روایت بھی انہی کی زبانی ہے۔ اب کبھی بے خوابی کا دورہ پڑے تو نیند کی گولی کھانے کی بجائے جھنجھنا بجا کر یہ تصور کر لوں گا کہ ماں بجا رہی ہے۔ تو کیا پتہ کہ

روٹھی ہوئی نیند بچپن کے کسی کونے کھدرے سے نکل کر خوابوں کی دنیا میں لے جائے۔ یوں اب بھی مجھ پر کوئی مصیبت پڑے یا اکڑا ہوا گھٹنا چٹک جائے یا ٹھوکر لگے تو میرے منہ سے بے اختیار 'ہائے ماں!'' نکل جاتا ہے۔ حالی کی رباعی کے ایک مصرعے کی نثر کچھ یوں ہے کہ بچوں کو مصیبت میں ماں ہی یاد آتی ہے۔

کالم نویسی اور انشائیہ نگاری میں ایک نکتہ مشترک ہے کہ لکھنے والا ادھر ادھر منہ مار کر یا اناپ شناپ بک کر جو چاہے لکھ سکتا ہے لیکن انشائیہ میں پرابلم یہ ہے کہ ایک خاص دائرے کے اندر چرچگ کرا سے کھونٹے سے ضرور بندھا رہنا پڑتا ہے۔

موضوع یہ تھا کہ بزرگوں کو بھی عیدی ملنی چاہئے۔ اٹھہتر سال کی عمر میں' میں کس سے عیدی لوں؟ نہ ماں زندہ ہے نہ باپ۔ کسی بیٹے سے عیدی لیتے ہوئے شرم نہ آئے گی؟ اگر سرکار عیدی دے تو میرے لئے قطعاً کوئی خفت کی بات نہیں۔ میرے والد بزرگوار مرحوم کو پنشن بھی نہیں ملتی تھی لیکن اپنی آزادی اور مرتبے کو برقرار رکھنے کیلئے گاؤں میں الگ رہتے تھے۔ ہم ان کے بیٹے ہر ماہ حسب توفیق انہیں کچھ نذر نیاز دیتے ہیں' جس کو وہ کمال مہربانی سے قبول فرمالیا کرتے تھے۔ گاؤں میں ان کی صرف اٹھارہ کنال زمین تھی جس سے انہیں سال بھر کے دانے بھی نہیں ملتے تھے۔ عید سے کچھ عرصے پہلے ہم ان کی خدمت میں کوئی کپڑا یا سویٹر' پگڑی یا چادر پیش کرتے تھے لیکن یہ نہیں کہتے تھے کہ ابا جی! یہ عیدی ہے۔ اگر کہتے تو وہ کبھی قبول نہ فرماتے کہ بزرگ عیدی لیتے نہیں' دیتے ہیں بشرطیکہ عیدی میں دینے کے لئے ان کے پاس کچھ موجود ہو لیکن سرکار تو بزرگوں کی بھی بزرگ ہے۔ اگر مجھے عیدی دے دے تو میں بخوشی قبول کرلوں گا اور یہی عیدی اپنے پوتوں دوہتوں کو دے دوں گا کہ خوش ہوں گے۔ میں کچھ اللہ کے فضل وکرم سے خود کفیل سا پنشن خوار ہوں لیکن سارے پنشن خوار میری طرح خود کفیل نہیں۔ بہت سے تو ابھی بال بچوں کے جھنجٹ سے نہیں چھوٹے۔ وہ صبح صبح اللہ کا نام لے کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہیں اور روزی کی تلاش میں نکل جاتے ہیں کہ پنشن میں گزارہ نہیں ہوتا۔ وہ روزی کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں اور روزی ان کے آگے آگے دوڑتی ہے۔ انگریزی کی ایک ضرب المثل کا ترجمہ ہے کہ وقت کو پکڑنا ہے تو اس سے آگے بڑھ کے پیشانی کی لٹ پکڑ کر قابو میں لاؤ لیکن دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو ملکھا سنگھ کی طرح چور سے آگے نکل کر کہیں کہ تم سمجھتے تھے کہ تم فلائنگ سکھ ملکھا سنگھ سے دوڑ میں آگے نکل جاؤ گے؟ اور اس اثناء میں چور چھائیں مائیں ہو جائے گا۔ یہ مثال بزرگ پنشن خواروں پر فٹ نہیں

آتی لیکن لطیفہ جان کر لکھ دی کہ روزی اور وقت دونوں چور ہیں۔ جنہیں پنشن خوار پکڑ نہیں سکتا اور آگے بھی نہیں نکل سکتا۔ وہ پنشن خوار جن کا پیشہ پڑھانا تھا' بعض اوقات اسّی اسّی سال کی عمر تک پڑھاتے ہیں لیکن بقول نظیر اکبر آبادی......

وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

ایک بزرگ استاد اسّی سال کی عمر میں عصائے پیری ہاتھ میں لے کر نکلتے اور گلی محلے کا ہر دروازہ کھٹکھٹا کر کہتے ''ٹیوشن کی ضرورت ہو تو بندہ حاضر ہے''۔ لیکن کسی سے مدد امداد لینے کو تیار نہ ہوتے کہ اس سے خودی کو ضعف پہنچتا تھا۔ ایسے یہ ایک بزرگ اکاؤنٹنٹ کا مجھے علم ہے جنہوں نے اسی بیاسی سال کی عمر میں اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کا نکاح کیا اور خوشی سے دم دے دیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ دکان دکان پر جا کر دکانداروں کا ڈیلی اکاؤنٹ لکھتے تھے۔ اصلی بھی اور جعلی بھی۔ وہ انکم ٹیکس بچانے بلکہ سرے سے نہ دینے کے بہت سے حربوں سے آگاہ تھے۔ اس بزرگ کی اپنی بھی غلطی تھی کہ ریٹائرمنٹ کے بعد رنڈاپا کاٹنے کی ہمت اپنے اندر نہ پائی۔

ایسے بہت سے پنشن خوار اب بھی موجود ہیں۔ اگر انہیں عیدی مل جائے تو اچھی عید منا لیں گے۔ کسی بچے کو سویٹر خرید دیں گے' کسی کو بوٹ اور خود پرانی شیروانی پر استری کروا کے عید کی نماز پڑھ لیں گے۔

میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر سرکار نے مجھے عیدی مرحمت فرمائی تو میں عید کی نماز کے بعد اس کی درازی عمر کی دعا کروں گا۔ فقیر فقروں کو بھی اپنی عیدی میں شریک کروں گا۔ ایک عرصے سے عجائب گھر اور چڑیا گھر کی سیر کو جی چاہتا ہے۔ نماز کے بعد پہلے عجائب گھر اور پھر چڑیا گھر جاؤں گا۔ عجائب گھر میں رکھے ہوئے مہاتما بدھ کے مجسمے کے سامنے کچھ دیر کھڑا رہوں گا اور اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے کی کوشش کروں گا کیونکہ مہاتما بدھ نے جس زندگی کا سراغ لگایا تھا' وہ اب بہت پرانی ہو چکی ہے اور چڑیا گھر میں بزرگ دریائی گھوڑے سے تعزیت کروں گا کہ اس کی نصف بہتر حال ہی میں وفات پا چکی ہے اور ایک اخباری خبر کے مطابق ان دنوں وہ بہت ملول رہتا ہے۔ چڑیا گھر کے میلے میں غبارہ اڑاؤں گا' پوں پوں کروں گا اور ایک جھنجھنا خریدنا نہیں بھولوں گا۔

11 دسمبر 2000ء

حلوہ اور حکمران

جس کہانی کا عنوان ''حلوہ اور حکمران'' ہے وہ بہت پرانی ہے۔ لیکن دنیا بھی تو بہت پرانی ہے۔ فارسی شعروشاعری میں دنیا کے ''زال'' سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ لغت میں ''زال'' کے معنی ہیں سفید بالوں والی بڑھیا لیکن یہ بڑھیا ہے بہت عشوہ طراز ہر زمانے میں نئی سج دھج سے جلوہ فرما ہوتی ہے، سر پر خضاب کر لیتی ہے اور جھریوں کو غازے میں چھپا لیتی ہے۔ کسی فارسی شاعر نے اس عجوزہ (بڑھیا) کو عروس سے ہزار داماد بھی کہا ہے عروس دلہن کو کہتے ہیں اور داماد کے ایک معنی دلہا بھی ہیں تو گویا یہ بڑھیا ہزار ہا دلہاؤں کی دلہن رہ چکی ہے اور ابد تک دلہن ہی رہے گی اور اسے نئے نئے دلہا ملتے رہیں گے۔ کوئی چنگیز تلوار کے زور پر اسے اپنی دلہن بنائے گا اور کوئی پرتھوی راج سنجوگتا کی طرح اسے سوئمبر سے اڑا لے جائے گا۔ جب شیر شاہ سوری کا جلوس شاہی دلی کی گلیوں سے گزر رہا تھا تو جھروکے میں بیٹھی ایک دلی والی نے کہا حیف کہ دلہن (دلی) تو جوان ہے لیکن دلہا بوڑھا ہے یہ دلہن کسی سے وفا نہیں کرتی اس سے بھی جس کے گلے میں ہار ڈالتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چنگیز تیمور اور شیر شاہ سوری کی بجائے کوئی کلوپیٹرا کوئی زینوبیا کوئی رضیہ سلطانہ کوئی چاند بی بی اسے سہیلا یا گانٹھ لیتی ہے لیکن یہ وفا اسے بھی نہیں کرتی۔

کوئی زمانہ تھا کہ ایک پرندہ اس دنیا کی فضاؤں میں سرگرم پرواز رہتا تھا اور اسے خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ کبھی کبھار وہ کسی چنگیز یا کلوپیٹرا کے سر پر بیٹھنے کی بجائے کسی گداگر کے سر پر آ بیٹھتا تھا تو اس کے سر سے کلاہ درویشی اتار کر اس پر تاج شاہی رکھ دیا جاتا تھا۔ گدا کو تھوڑی سی فراست یا بصیرت حاصل ہوتی تو وہ دل سے اس بڑھیا کو اپنی دلہن نہ بناتا بلکہ وہ اپنی پاپوش اور گلیم کسی طاق میں محفوظ کر دیتا اور عصا کو بھی محفل کے کسی کونے میں لگا دیتا کہ نظروں کے سامنے رہیں اور اپنی اصلیت یاد آتی رہتی۔ تخت شاہی پر متمکن ہو کر وہ پہلا حکم دیتا حلوہ لاؤ اس کہانی میں کشکول کا ذکر نہیں میں نے بعض گداگروں کے ہاتھوں میں اتنے خوبصورت آبنوسی کشکول دیکھے ہیں کہ ایسی خوبصورتی پیالہ شاہی میں بھی نظر نہ آئی۔ اسے کاسہ گدائی بھی کہتے ہیں۔

حلوہ اور حکمران والی کہانی میں اس کشکول کا ذکر نہیں لیکن میں جو کہانی کا رہوں میں نے دیکھا کہ گداگر سلطان نے اسے اپنے ہاتھوں سے نہ جانے دیا وہ حلوہ بھی اسی میں ڈلواتا تھا اور اپنی گداگری کو یاد رکھتا تھا اور کشکول بھر حلوے سے زیادہ کی تمنا نہ کرتا۔

کہانی بہت پرانی ہے لیکن نئے نئے لباس میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے کبھی شہر کے صدر دروازے پر کوئی خوش پوش آدمی سب سے پہلے پہنچتا ہے اور ہما اس کے سر پر بیٹھ جاتا ہے وہ اس کے اوپر جبہ شاہی اوڑھ کر تخت نشین ہو جاتا ہے۔ پھر وہ عوام سے مخاطب ہوتا ہے ان کے نکبت و افلاس پر آنسو بہاتا ہے بہت سے سنہری وعدے کر کے ان کا جی لبھاتا ہے کہتا ہے کہ میں خود گھاس کھا کر تمہیں حلوہ کھلاؤں گا۔ وہ اپنا گھاس والا وعدہ پورا کر دکھاتا ہے کہ اس کے دستر خوان پر ہر روز سوا لاکھ روپے کی گھاس کھائی جاتی ہے اور عوام گھاس کو بھی ترس جاتے ہیں۔

کبھی معاملہ الٹا ہو جاتا ہے یعنی ہما کسی خاتون کے سر پر بیٹھ جاتا ہے یہ خاتون اپنے سرتاج کو حلوے میں گاڑ دیتی ہے۔ اس کے گھوڑوں کو بھی گھاس کی بجائے حلوہ کھانے کو ملتا ہے بلکہ کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ اس کے گھوڑے دودھ پیتے ہیں اور مربے بھی کھاتے تھے۔

ان کا کشکول کسی کو نظر نہیں آتا شاید اپنے لبادے میں چھپا کر محل میں لے جاتے ہیں یہ کشکول اس وقت نظر آتا ہے جب وہ اسے ہاتھ میں لے کر بڑے شاہانہ انداز سے باہر کی دنیا میں جاتے ہیں اور اسے ڈالروں اور پونڈوں سے بھر کر لاتے ہیں کچھ واپس اسی دنیا کو لوٹا دیئے جاتے ہیں کہ جہاں سے آئے تھے اور کچھ داد و دہش پر صرف ہو جاتے ہیں کہ روایت شاہانہ ہے۔ ایک عرصے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ مفت میں نہیں ملے تھے کہ مال حرام سمجھ کر حرام میں لوٹا دیئے جاتے عوام کو ان کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آتی لیکن اپنے ناتواں کندھوں پر ایک بوجھ سا ضرور محسوس ہوتا ہے۔ چودہ کروڑ عوام کے کندھوں پر اڑتیس کھرب ڈالروں کا بوجھ بھلا محسوس کیوں نہ ہوں۔ کیا اگلی نسل کو یہ بوجھ منتقل ہو گا اور کیا وہ اسے بخوشی اٹھالے گی۔ بعض اوقات انقلاب بھی برپا ہو جاتا ہے اور گداگر سلطان کو محل سے نکال دیا جاتا ہے لیکن اکثر اوقات وہ کشکول کسی اور گداگر کے ہاتھ میں دے کر خود ہی صحیح سلامت محل سے نکل جاتا ہے۔

کہانی کا گداگر ایک مرد درویش تھا اس نے صرف حلوہ کھایا لیکن جب محل کے صدر دروازے سے باہر نکلا تو اس کے جسم پر میلی کچیلی گدڑی تھی۔ پاؤں میں ٹوٹے ہوئے چپل ہاتھ میں عصائے درویشی اور سر پر پھٹی پرانی کلاہ جو اس نے ذرا سی کج کر لی تھی کہ درویشی میں بھی شہنشاہی

کی کوئی ادا نظر آئے۔ زنجیروں کے ساتھ بندھا کشکول اس کی گردن سے الٹا لٹکا ہوا تھا کہ لوگو میں خالی کشکول لے کر آیا تھا اور دیکھو کہ اب کشکول کو خالی ہی لے کر جا رہا ہوں۔

لیکن آج کے گدا اگر شاہی محل سے اپنے آپ نہیں نکلتے بلکہ انہیں نکالا جاتا ہے وہ شاہی لباس بھی نہیں اتارتے اپنی گلیم عصا اور پاپوش بھی نہیں لیتے۔ کشکول کو بھی محل ہی میں چھوڑ جاتے ہیں کہ آنے والے کے کام آئے یا سکندر کی طرح ان کا بھرم قائم رہے کہ وہ خالی ہاتھ آئے تھے اور خالی ہاتھ جا رہے ہیں۔ ان کو جانے کن غاروں میں چھپا دیا ہے کہ کوئی علی بابا وہاں تک نہیں پہنچ سکتا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرض کی مے تو وہ خود پیتے ہیں اور فاقہ مستی اپنی قوم کو دے جاتے ہیں کہ رنگ لاتی رہے۔

اقبال کے ایک رند زیرک نے میکدے میں کتنی بڑی بات کہہ دی کہ ہمارے شہر کا والی ایک گدائے بے حیا ہے میں نے رعایا کو کلاہ و لباس سے محروم کر کے اپنے سر پر تاج رکھ لیا اور قبائے زریں پہن لی۔ وہ جو سرخ شراب پیتا ہے وہ خون دہقاں سے کشید کی جاتی ہے اس کے نعمت خانے کی ہر چیز مانگی ہوئی ہے اور دینے والے کون ہے؟ مرد غریب و بے نوا

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطان سب گدا

28 دسمبر 2000ء

پی ایچ ڈی...... پچاس پاکستانی اور پانچ سو ہندوستانی

پچھلے دنوں چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے پاکستان میں تعلیم کے فروغ کے حوالے سے افسوس کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان ایک سال میں صرف پچاس پی ایچ ڈی ''پروڈیوس'' کرتا ہے اور ہندوستان پانچ سو۔ میرا خیال ہے کہ اگرچہ آبادی کے لحاظ سے پاکستان اور ہندوستان میں قریب قریب ایک اور سات کی نسبت ہے تاہم اس نسبت سے بھی پاکستان کو ستر اکہتر پی ایچ ڈی تو ضرور پیدا کرنے چاہیں۔ان کی تقریر سے یہ واضح نہیں ہوا کہ یہ ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں کن علوم میں ہیں؟ آرٹ میں یا سائنس میں؟ اور ان میں کیا نسبت ہونی چاہئے؟

جہاں تک مجھے معلوم ہے آرٹ میں تو ہم پہلے ہی خود کفیل ہیں خاص طور پر اردو فارسی، اسلامیات، پنجابی، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ۔ کسی بڑے کالج میں چلے جائیں، آپ کو ان شعبوں میں ڈاکٹر ہی ڈاکٹر نظر آئیں گے۔ کبھی گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو میں آٹھ استاد ہوتے تھے جن میں مجھے بھی شمولیت کا فخر حاصل تھا اور ان میں ایک بھی پی ایچ ڈی نہیں تھا۔ ہمارے ایک ہمعصر نے پی ایچ ڈی کیا تو ہمارا سر بھی فخر سے بلند ہوا۔ پروفیسر اصغر سلیم میر مرحوم کہا کرتے تھے کہ ہمارے شعبے میں صرف ایک ڈاکٹر ہے اور باقی ہم سات اس کے کمپاؤنڈر ہیں اور پھر بھی کام نہایت خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔ لطیفہ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں شعبہ اردو کے صدر بھی پی ایچ ڈی نہیں تھے۔ آج گورنمنٹ کالج کے شعبہ اردو میں اکثریت ڈاکٹر حضرات کی ہے اور صدر شعبہ بھی پی ایچ ڈی ہیں۔ جو ڈاکٹر نہیں وہ ڈاکٹر بننے کیلئے دن رات کام کر رہے ہیں۔ پتہ نہیں کس ستم ظریفی نے کہا ہے کہ ''اب اردو میں پی ایچ ڈی کرنے کے لئے موضوعات کا قحط پڑ گیا ہے''۔

وہ ''ڈیڈی کیٹڈ'' لوگ جو دل میں قوم کا درد رکھتے ہیں ڈاکٹریٹ نہ بھی کریں تو بھی معجزے دکھا جاتے ہیں۔ یونیورسٹیاں اپنی اعزازی ڈگریاں لئے ان کے پیچھے پیچھے لگی رہتی ہیں اور وہ ان سے بے نیاز ہوتے ہیں، تاہم آج کی دنیا میں ڈاکٹریٹ کرنا نہایت لازمی ہے۔ قوم کو پی ایچ ڈیز کی ضرورت ہے اور ہر شعبہ علم میں، تاکہ ان کی وجہ سے خیالات وافکار میں تازگی پیدا ہو،

علوم وفنون میں نکھار آئے' نئی ٹیکنالوجیاں دریافت ہوں اور قوم مادی اور روحانی طور پر ترقی کرے' یعنی ارتقا کا عمل جاری رہے اور ٹھہرے ہوئے پانی میں تعفن پیدا نہ ہوا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں بہت ٹیلنٹ ہے یعنی گل کوزہ بھی موجود ہے اور کوزہ گر بھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کوزہ گروں کی قدر افزائی کی جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھارت پی ایچ ڈی کرنے والوں اور کرانے والوں' دونوں کی دامے درمے حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ انہیں مراعات بھی ملتی ہیں اور سہولیات ہیں۔ اکثر لوگ اپنی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرتے ہیں اور سائنس میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کو حکومت ایک سال کے لئے یورپ یا امریکہ میں بھیجتی ہے تاکہ وہ جدید ریسرچ سے فائدہ اٹھا سکیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بیوروکریسی پی ایچ ڈی سازی سے الرجک نہیں جیسا کہ ہماری بیورو کریسی کا رویہ ہے یا وہاں سرخ فیتے کے پیچ وخم ہماری نسبت بہت کم ہیں۔

جدید علوم میں وہ پی ایچ ڈی ملک وقوم کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں' جو یورپ اور امریکہ سے کوئی نیا خیال لے کر واپس آئیں اور اپنے ملک میں آ کر قومی ولولے سے اسے عملی جامہ پہنائیں۔ اس کی ایک مثال ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہیں لیکن عام طور پر ہوتا ہے کہ پی ایچ ڈی کرنے والوں کا ٹیلنٹ ضائع چلا جاتا ہے۔ ان سے وہ کام نہیں لیا جاتا جس میں انہوں نے ریسرچ ورک کیا ہوتا ہے۔ انہیں گیارھویں بارھویں جماعت کو پڑھانے پر لگا دیا جاتا ہے۔ انہیں مزید ریسرچ کی سہولتیں نہیں ملتیں اور لیبارٹریاں بہت کم ہیں اور مطلوبہ ساز وسامان سے بھی محروم ہیں۔ انجینئرنگ اور زرعی یونیورسٹیوں میں جو سہولتیں موجود ہیں ان کا مجھے علم نہیں۔

تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے انجینئر پی ایچ ڈی نہ بھی ہوں تو بھی بڑی خوش اسلوبی سے سڑکیں بنوا سکتے ہیں' پل تعمیر کروا سکتے ہیں' ریلوے کی پٹڑیاں بچھا سکتے ہیں' ٹنل کھدوا سکتے ہیں اور ڈیم بنوا سکتے ہیں۔ اگر انہیں سہولتیں میسر ہوں تو وہ نئی ٹیکنالوجیاں بھی دریافت کر سکتے ہیں۔ زرعی ماہرین نئے نئے بیج پیدا کرتے ہیں' بنجر زمینوں کی آبادی اور سیرابی کے لئے منصوبے بناتے ہیں' زمینیں آباد کرتے ہیں اور ملک کو زرعی اجناس میں خود کفیل بناتے ہیں بشرطیکہ بیوروکریسی ان پر مسلط نہ ہو اور وہ کرپشن کے وائرس سے محفوظ رہیں۔

مجھے شعبہ تعلیم سے کچھ کچھ واقفیت ہے کہ میں اس سے وابستہ رہا ہوں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں سے جو وظائف ملتے ہیں اور اکثر سرخ فیتے کا شکار ہو کر ضائع چلے جاتے ہیں اور کچھ خوش قسمت جوان وظائف کے مستحق ٹھہرتے ہیں' ان سے پوچھئے کہ

اپنی بیوروکریسی ان سے کیا سلوک کرتی ہے اور اگر وہ رکاوٹوں کو پھاند کر منزل مقصود پر پہنچ جائیں تو سفارتی سطح پر ان سے کیسے نپٹا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے انہیں عبور دریائے شور کی سزا دی گئی ہے۔ ایسی داستانیں اکٹھی کی جائیں تو ایک کتاب بن سکتی ہے۔ جو لوگ گوہر مراد پا کر لوٹتے ہیں ان کے دل میں بہت بلند جذبے اور سرگرم ولولے ہوتے ہیں جو یہاں آ کر سرد پڑ جاتے ہیں۔ انہیں جس کالج سے بھیجا جاتا ہے وہاں ان کی پوسٹنگ نہیں ہوتی کہ سفارشی ان پر قابض ہو چکے ہوتے ہیں۔ انہیں دور کے کسی انٹر کالج میں بھیج دیا جاتا ہے یا او ایس ڈی لگا دیا جاتا ہے اور ایک عرصہ ان کا بے کاری میں گزر جاتا ہے۔ ایک مثال ظہیر الحسن نقوی کی ہے جو ابیر ایسٹ وتھ ویلز سے جینیٹکس (باٹنی) میں پی ایچ ڈی کر کے آیا تھا اسے ان مرحلوں میں سے گزرنا پڑا۔ میں اذیت رسانی کی پوری داستان نہیں لکھوں گا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ ایک سال تک محکمے نے اسے پی ایچ ڈی کرنے کی خوب خوب سزا دی اور اس کے بعد اسے اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کے سپرد کر دیا کہ رہی سہی کسر پوری ہو جائے۔ تقریباً دس سال بعد اس کی ترقیوں اور موواودروں' کا تصفیہ ہوا۔

میرا مشورہ ہے کہ ایک سال میں پاکستان کو سو پی ایچ ڈی ضرور پیدا کرنے چاہئیں لیکن ساتھ ساتھ ریسرچ کی سہولتیں پیدا کر کے ملک کے موجودہ پی ایچ ڈیوں کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ان کی تربیت کو ضائع ہونے سے بچانا نہایت ضروری ہے۔ اصل میں تو میں اس بات کا قائل ہوں کہ ملک میں ایک متوازن تعلیمی نظام قائم کرنا چاہیے تا کہ پہلی جماعت سے پی ایچ ڈی تک کے مواقع پر ہر پاکستانی بچے کو یکساں دسترس حاصل ہو ورنہ اگر ایک طرف ملک میں خواندگی کی شرح گھٹتی رہی اور دوسری طرف پی ایچ ڈی کرنے والوں کی شرح بڑھتی رہی تو فائدہ معلوم!

8 جنوری 2001ء

حلال کی روزی کمانے والے

یہ ایک سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی صبح ہے۔ میں آٹھ بجے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آتا ہوں تو ٹیرس میں دھوپ ہوتی ہے لیکن اس میں گرمی نہیں ہوتی۔ مجھے صبح کا یہ روپ بھی اچھا لگتا ہے۔ کہ نئے دن کا آغاز ہو رہا ہے۔ اچانک ٹیرس سے ملحقہ خالی پلاٹ پر میری نظر پڑتی ہے جہاں ایک لڑکا لید اور گوبر سے اٹی ہوئی گیلی گھاس سے کچھ تلاش کر رہا ہے۔ یہ لڑکا کاغذ کے گرے پڑے ٹکڑے اٹھا کر ایک بوری میں ڈال رہا ہے۔ مجھے اس کے پھٹے پرانے کپڑوں اور ٹھٹھرے ہوئے جسم پر بہت ترس آتا ہے میں اس سے ٹھہرنے کو کہتا ہوں اور اپنی ردی کو ٹوکری سے پھٹے پرانے کاغذ ایک شاپنگ لفافے میں بھر کر نیچے پھینک دیتا ہوں اور مجھے دلی سکون محسوس ہوتا ہے اور اگلے لمحے شرمندگی کا طوفان آتا ہے اور سردی کے باوجود مجھے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے حلال کی روزی کمانے والے کو بھیک کیوں دی؟ اور دیا بھی تو کیا دی...... کاغذ کے چند حقیر ٹکڑے...... میں نے محسوس کیا کہ میں نے بورژوائی فیاضی کا ارتکاب کیا ہے۔ وہی فیاضی جس کا اظہار ضمیر جعفری مرحوم کا ''رامے شاہ'' کیا کرتا تھا۔ رامے شاہ جہلم کا ایک لاکھوں پتی ساہوکار تھا۔ صبح جب دکان پر بیٹھتا تو پائیوں کے سکوں کی ایک ڈھیری سامنے رکھ لیتا اور جو بھکاری آتا اسے ایک پائی بھیک میں دیتا۔ اس زمانے کا روپیہ غالباً 192 پائیوں کے برابر ہوتا تھا۔ چنانچہ اب میں ردی کاغذ ملحقہ پلاٹ میں پھینک دیتا ہوں کہ حلال کی روزی کمانے والے کو محنت سے بیزاری کا احساس نہ ہو۔ یہ بھی خالصتاً بورژوائی رویہ ہے۔

اس جذبے کی تسکین ہندوستان کا مغل اعظم جلال الدین اکبر بادشاہ بھی کیا کرتا تھا۔ وہ حلال کی روزی کمانے والوں کو اچھے اچھے نام عطا فرماتا تھا۔ مثلاً کوٹھے اتارنے والے کو حلال خور کہتا تھا اور سقے کو بہشتی۔ مجھے معلوم نہیں کہ حلال خور اور بہشتی کی حلال روزی میں اس نے کوئی اضافہ بھی کیا یا نہیں۔

میں گھر سے نکلتا ہوں تو مجھے کئی حلال کی روزی کمانے والوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان

میں اینٹیں یا تغاری سر پر رکھ کر بار بار لکڑی کی کانپتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھنے اترنے والا مزدور ہے۔ کوئی جوان ہوتا ہے' کوئی جھکی ہوئی کمر والا بوڑھا۔ کسی نوجوان لڑکی یا کسی ادھیڑ عمر کی عورت کے سر پر یہ تغاری دیکھ کر میرا بورژوائی جذبہ غیرت بہت ابال میں آتا ہے۔ پھر میں سوچتا ہوں' اچھا ہوا کہ ان کو مزدوری مل گئی۔ کئی مزدور ہوں گے کہ کسی چوراہے پر ابھی تک کھڑے ہوں گے اور انہیں کوئی آجر نہیں ملا ہوگا۔ آج وہ خالی ہاتھ گھر چلے جائیں گے اور ان کا چولہا سرد رہے گا۔ یہ بوڑھا مزدور اپنی صلیب کب تک اپنے کندھے پر اٹھائے پھرے گا؟ کھمبے پر چڑھے ہوئے ایک کاریگر کو دیکھتا ہوں جو بجلی کے تاروں کو درست کر رہا ہے۔ اس کی زندگی کتنے خطرے میں ہے؟ ایک حلال خور گٹر کے اندر جا کر گندگی صاف کر رہا ہے۔ اس کا اوپر کا دھڑ کپڑے سے بے نیاز ہے اور دھوپ ابھی تک ٹھٹھری ہوئی ہے۔ کیا! اسے نمونیہ یا فلو کا خطرہ لاحق نہیں؟

یہ سب حلال کی روزی کماتے ہیں۔ سڑک بن رہی ہے تو چلچلاتی دھوپ میں سڑک کوٹنے والا بھی تو حلال خور ہی ہے۔ کڑکڑاتی سردی ہو تو ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں سے کدال چلانے والا بھی تو حلال خور ہی ہے اور وہ بھی جو کھیت میں کام کرتا ہے اور رات کو جاگ کر کھیت کو پانی دیتا ہے' گنگا بہہ رہی ہو' تب بھی' نہ بہہ رہی ہو تو اپنی گنگا آپ بہاتا ہے۔ کبھی چلچلاتی دھوپ میں اور کبھی کڑکڑاتی سردی میں ہل چلاتا ہے تو اس کی حلال خوری میں کیا کسر باقی رہ جاتی ہے؟ میں نے کوئلے اور نمک کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو نہیں دیکھا کہ وہ کس حد تک حلال خور ہیں۔ پہاڑوں کو کاٹ کر اور پتھر توڑ کر سڑکیں بنانے اور سرنگیں کھودنے والے کوہ کنوں سے بھی مجھے سابقہ نہیں پڑا کہ دیکھوں' ان میں سے کتنے فرہاد ہیں جنہوں نے اپنی شیریں کو پالیا اور وہ مزدور جو دھکتی ہوئی آگ کے سامنے کھڑے ہو کر بھٹی دہکاتا ہے اور پگھلے ہوئے فولاد کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہوتا ہے' میں نے صرف اس کی تصویر دیکھی ہے اور سوچا ہے کہ حلال کی روزی کمانی کتنی مشکل ہے! یہ وہ حلال کی روزی کمانے والے ہیں جو ساری عمر اسی محنت سے کام کرتے ہیں اور خون پسینہ بہاتے رہیں تو بھی اپنی جھونپڑی اسار نہیں سکتے۔ حضرت علیؓ کے عمال میں سے ایک شخص نے بلند عمارت تعمیر کی جس پر آپ نے فرمایا ''چاندی کے سکوں نے سر نکالا ہے۔ بلاشبہ یہ عمارت تمہاری ثروت کی غمازی کرتی ہے''۔ اسلام نے کمیونزم یا سوشلزم کی تعلیم نہیں دی لیکن اس نے انسانوں کے درمیان حقوق و فرائض کا جو دستور دیا ہے' اس کی رو سے جو معاشرہ تعمیر ہوگا' اس میں میرا دعویٰ ہے کہ جھونپڑیوں کی حالت تو یقیناً سدھرے گی لیکن ان کے پہلو میں محل تعمیر نہیں ہو سکیں گے۔

یہاں میں پھر حضرت علیؓ کے کچھ اقوال درج کرتا ہوں۔

☆......آپ نے فرمایا "خداوند تعالیٰ نے دولت مندوں کے مال میں فقیروں کا رزق مقرر کیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی فقیر بھوکا رہتا ہے تو اس لئے کہ دولت مند نے دولت کو سمیٹ لیا اور خدائے بزرگ و برتر ان سے اس کا مواخذہ کرنے والا ہے۔" ☆......انسان کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد کیا "اے فرزند آدم! تو نے اپنی غذا سے جو زیادہ کمایا ہے، تو اس میں دوسرے کا خزانچی ہے۔" عرب کے مشہور شاعر فرزدق کے باپ غالب ابن صعصعہ سے باہمی گفتگو کرتے ہوئے پوچھا "وہ تمہارے بہت سے اونٹ کیا ہوئے؟" اس نے کہا کہ حقوق ادائیگی نے انہیں منتشر کر دیا۔ فرمایا "یہ تو ان کا انتہائی اچھا مصرف ہوا۔"

اگر کوئی محل تعمیر کر کے یہ بلند بانگ دعویٰ کرے کہ میں نے جو بنایا ہے، حلال کی کمائی سے بنایا ہے تو پھر لامحالہ کہنا پڑے گا کہ حلال وحرام سے معیار بدل گئے ہیں۔ ایسے معاشرے میں کوئی "غربت مکاؤ" سکیم کامیاب نہیں ہوسکتی اور میں تو کہوں گا کہ غریب کو پانچ پانچ سیر آٹا مفت میں دے کر یہ کہا جائے کہ غریبی ختم ہوگئی ہے تو یہ شہنشاہی ذہنیت کا اظہار ہے۔

20 جنوری 2001ء

موازنہ بینظیر بھٹو اور نواز شریف

آج کل نوائے وقت میں ذوالفقار علی بھٹو اور میاں نواز شریف میں مقابلہ و موازنہ ہو رہا ہے۔ اس کا آغاز جناب خورشید گیلانی کے کالم سے ہوا۔ ان کے بعد جناب عطاء الحق قاسمی نے اس موضوع پر پانچ کالموں کا ایک سلسلہ لکھا۔ سید اطہر عباس نے ان کا جواب سات اقساط میں دیا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں حکمران ہالآخر ناکام رہے۔ دونوں کی تعمیر میں کچھ صورت خرابی کی مضمر تھی۔

میرے نزدیک یہ موازنہ بینظیر اور نواز شریف میں ہونا چاہئے کیونکہ میاں نواز شریف' میرے ناقص خیال میں ذوالفقار علی بھٹو کے پائے کے لیڈر نہیں تھے۔ بھٹو قائد عوام کہلائے اور نواز شریف قائد ثانی کا لقب حاصل نہ کر سکے۔ اگرچہ بھٹو بھی غیر متنازعہ لڈر نہیں تھے۔ دونوں میں کس نے زیادہ نقصان ملک کو پہنچایا' اس کا فیصلہ بھی آسان نہیں ہے۔ میں کبھی جذباتی طور پر بھٹو مرحوم کا بہت زیادہ قدر دان تھا لیکن بہت جلد مجھے محسوس ہو گیا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں ان کا بہت بڑا کردار ہے۔ وہ جنرل یحییٰ پر اتنے حاوی تھے اور خود اپنی ذات میں اتنے ذہین تھے کہ اگر چاہتے تو پاکستان کو ٹوٹنے سے بچا سکتے تھے لیکن افسوس کہ قسام ازل نے اتنا عظیم ایثار ان کی تقدیر میں نہیں لکھا ہوا تھا۔ دولت کی فراوانی نواز شریف کے سر پر ہمائے سلطنت بن کر آ بیٹھی اور اس دولت سے بھی انہوں نے ملک و قوم کی کوئی بڑی خدمت نہ کی۔ اگر وہ اپنے حواریوں کو لوٹ مار میں شامل نہ کرتے' تو پاکستان آج دیوالیہ ہونے کے قریب نہ ہوتا۔ افسوس کہ ایثار و عظمت کی سربلندی ان کے نصیب میں بھی نہیں تھی۔

اصل مقابلہ نواز شریف اور بینظیر کا ہے۔

جہاں تک ذاتی شخصیت کا تعلق ہے' نواز شریف اور بینظیر میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔

نواز شریف گورنمنٹ کالج لاہور کے گریجوایٹ تھے' بینظیر آکسفورڈ یا کیمبرج سے

پڑھ کر آئی تھیں۔ ان کی ذات میں اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کا کچھ کرشماتی عکس ضرور موجود تھا' وہ جس روانی اور خوبصورتی سے انگریزی بولتی تھیں' اس خوبصورتی سے نواز شریف اردو بھی نہیں بول سکتے تھے۔ البتہ بینظیر اردو بولنے میں نو آموزی کی منزل سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ جہاں تک حکمرانی کے تدبّر کی ضرورت تھی' دونوں اس سے بے بہرہ تھے۔ دونوں نے اپنے ادوار اقتدار میں اچھی حکمرانی کا کوئی کرشماتی مظاہرہ نہ کیا۔ تاہم اس سلسلے میں نواز شریف کا پلہ کچھ بھاری نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے پہلے دور اقتدار میں جس موٹروے کا آغاز کیا وہ ان کے دوسرے دور اقتدار میں پایہء تکمیل تک پہنچ گئی۔ اس پر جتنا فخر اور جتنی مسرت تھی' اتنا بڑا یہ کارنامہ نہیں تھا۔ وہ اس پر اکثر سفر کرتے اور کار ڈرائیو کرتے۔ سڑک کے کنارے کسی 'جھوک' میں کوئی خاتون لسی رڑک رہی ہوتی تو وہاں ٹھہر کر لسی کا چھنا ضرور پیتے اور اسے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ انعام میں دیتے۔ داد و دہش کا یہ مظاہرہ کلاسیکی شہنشاہیت کی یاد دلاتا۔ ان کا دوسرا بڑا کارنامہ ایٹم بم کا دھماکہ ہے۔ وہ تذبذب میں مبتلا ہو کر شاید اس سنہری موقع کو گنوا دیتے' اگر نوائے وقت اپنے صفحات کو عوامی جذبات کی عکاسی کے لئے وقف نہ کر دیتا اور پوری قوم کا نفسیاتی دباؤ انہیں اس عظیم فیصلے پر مجبور نہ کر دیتا۔ کرگل کے معاملے میں انہوں نے جس تدبر کا مظاہرہ کیا' اس نے اس فیصل کی عظمت کو بہت کم کر دیا' گویا وہ کرگل کی چوٹی سے گر پڑے۔ ان کے بھائی شہباز شریف نے پنجاب میں نہایت اچھی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔

رفاعہ عامہ کے کچھ کام کیئے مثلاً امتحانی نظام کو بہتر بنایا' کچھ سڑکیں بنا کر لاہور کی خوبصورتی میں اضافہ کیا لیکن کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جو اعلیٰ سڑک تعمیر کروائی' وہ ''جاتی عمرا'' پہنچ کر ختم ہو گئی۔ حالانکہ ضرورت تھی کہ وہ ان ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کی مرمت کرواتے جو ملک کے بڑے شہروں اور قصبوں کو موٹروے سے ملاتی ہیں۔

محترمہ بینظیر کے دونوں ادوار کسی بڑے اور چھوٹے کارنامے سے خالی ہیں۔ آجا کے نظر ''مہکو'' پر پڑتی ہے یا اس طرح کے بجلی پیدا کرنے والے دوسرے کارخانوں پر اور اس کے بعد جب اپنے بجلی کے بل پر نظر پڑتی ہے تو غش آ جاتا ہے۔ کبھی کبھار وہ سائن بورڈ بھی دکھائی دے جاتا ہے جو ایک سڑک کے کنارے ''شون انڈسٹریز'' والوں نے لگوایا تھا اور جس کے پیچھے بنجر زمین اور جھاڑ جھنکار کا ایک لامتناہی سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے اور ایک انڈر میٹرک کی بیٹی کے گلے میں ہیروں کا ہار ہے کہ جو آنکھوں کو خیرہ کیئے دیتا ہے۔ اس انڈر میٹرک نے دو اڑھائی سال

تک پاکستان کی سب سے بڑی سٹیل مل کی چیئر مینی کی کرسی کو زینت دی' ان کے شوہر نامدار کے کارناموں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ بینظیر بھٹو اور نواز شریف دونوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے نہایت دیانتداری سے اپنے فرائض منصبی سرانجام دیئے۔ دونوں امیر تھے' اس لئے تنخواہ کا صرف ایک روپیہ ماہوار وصول کیا۔ میں اس دعوے کی تائید و تردید میں کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا لیکن سرے محل بھی ایک حقیقت ہے اور مے فیئر فلیٹس بھی۔ شریف سٹی بھی اور دبئی اور لندن کی رہائش گاہیں بھی۔ دونوں کے شاہانہ اخراجات بھی ایک حقیقت ہیں اور اس غریب ملک کے حکمرانوں کے لائف سٹائل کی چکا چوند بھی' یہ حقیقتیں ہیں جو ہمالہ کی طرح بلند ہیں اور ہر پاکستانی کی نظر کے سامنے ہیں۔ البتہ مجھے فلاح و بہبود کے کچھ کارنامے نظر آتے ہیں جو نواز شریف اور اس کے خاندان' نے کئے۔ انہوں نے ملک میں کچھ کارخانے لگائے' کچھ رفاعہ عامہ کے کام بھی کئے مثلاً اتفاق ہسپتال اور شریف سٹی کے رفاہی ادارے۔ افسوس کہ بینظیر کی حکمرانی کا یہ صفحہ بھی کسی چھوٹے سے چھوٹے کار خیر سے خالی نظر آتا ہے۔

نواز شریف کی فطرت میں فیاضی اور مہمان نوازی کے کچھ جوہر ضرور تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کا دستر خوان بہت وسیع تھا لیکن میں نے اس پر اکثر ان لوگوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا ہے جو بات بات پر چمچہ بھر خون نثار کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ ایک مزدور کے بیٹے تھے۔ ان کے برعکس بینظیر بھٹو کی رگوں میں پشت ہا پشت کی جاگیرداری کا خون رواں تھا۔ جاگیردار بلاشبہ مزارع کا لہو نچوڑتا ہے اور دستر خوان پر مہمانوں کے سامنے رکھ دیتا ہے لیکن ان کے کسی جاں نثار کی زبان سے میں نے نہیں سنا کہ بی بی نے جلی روٹی کا چھلکا اتار کر کسی کو پیش کیا ہو۔ دونوں نے خود اختیار کردہ جلاوطنی قبول کی۔ ایک کا مامن و مسکن لندن ہے دوسرے کا مکہ مدینہ۔ اسے آپ کسی کی برتری سمجھیں یا کسی کی کم تری۔ اس کا فیصلہ آپ کی صوابدید پر ہے۔

25 جنوری 2001ء

عارف عبدالمتین......کمیونزم سے اسلام تک

عارف عبدالمتین سے بالمشافہ ملاقات 1956ء میں ہوئی جب وہ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ میں سائنس پڑھاتے تھے۔ یہ ملاقات جناب محمد اسمٰعیل شمیم کی وساطت سے ہوئی جو اسی سکول میں ٹیچر تھے۔ ایم آئی شمیم ان دنوں گوجرانوالہ میں وکالت کرتے ہیں۔ وہ بی ٹی میں میرے کلاس فیلو اور نہایت مخلص دوست تھے۔ غائبانہ طور پر میں عارف کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ وہ ''ادب لطیف'' کے مدیر تھے۔ سعادت حسن منٹو مرحوم کا ایک متنازعہ افسانہ شائع کر کے انہوں نے ایک جرات مند مدیر کی حیثیت سے اپنا سکہ منوالیا تھا۔ منٹو کے ساتھ انہیں بھی عدالتوں میں جانا پڑا۔ شکر ہے کہ قید و بند کی آزمائش میں مبتلا نہ ہوئے۔ انہوں نے بی ٹی کیا اور تعلیم و تعلم سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے برادر خرد پروفیسر عبدالباسط 46-1945ء کے بی ٹی کے سیشن میں شمیم صاحب اور میرے کلاس فیلو تھے۔

تعلیم و تعلم سے وابستہ ہونے کے بعد بھی ان کی انقلاب پسندی میں کوئی فرق نہ آیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پر قدغن لگی تو عارف صاحب نے ''انجمن آزاد خیال مصنفین'' قائم کر لی۔ میں اس کے دو جلسوں میں شریک ہوا۔ اب یاد نہیں رہا وہ کون صاحب تھے، جنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ گورنمنٹ سرونٹ تو نہیں؟ میں نے ہاں میں جواب دیا تو انہوں نے کہا ''اگر نوکری عزیز ہے تو اس انجمن کے جلسوں سے اجتناب کیجئے''۔ عارف صاحب پوچھتے تھے کہ میں اس انجمن کے ایک جلسے میں اپنا افسانہ پڑھوں لیکن اسے پہلے پہلے ہی میں نے آزاد خیالی سے پسپائی اختیار کر لی کہ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن کی طرف سے مجھے اپنے ہیڈ ماسٹر میر عبدالرحمٰن مرحوم کی زبانی وارننگ ملی کہ آئندہ انجمن آزاد خیال مصنفین کے جلسے میں شرکت نہ کریں۔ میر عبدالرحمٰن مرحوم نے ہنس کر کہا ''نقوی صاحب! پیٹ زیادہ عزیز ہے یا ترقی پسندی؟'' میں نے کہا ''اقبال تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ شکم سامان موت ہے''۔ سی آئی ڈی کا ایک آدمی میرے گاؤں میں یہ تحقیق کرنے گیا کہ یہ شخص کتنا بڑا باغی ہے۔ نمبردار نے میری شرافت کی قسم کھائی۔ میرے والد مرحوم

بہت پریشان ہوئے۔ میں چھ مہینے تک لاہور نہ گیا کہ عارف صاحب سے آنکھیں کیسے ملاؤں گا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ''انجمن آزاد خیال مصنفین'' پر پابندی لگ گئی۔ تاہم میں نے عارف صاحب سے اپنے نیاز مندانہ تعلقات منقطع نہ کئے کہ ان کے مزاج اور کردار میں کوئی ایسی کشش ضرور تھی کہ ان کی محبت ''جبل المتین'' بن کر آدمی کو ان سے وابستہ کر دیتی۔ جب بھی لاہور آتا ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔

1964ء میں، میں بھی لاہور آ گیا۔ ان دنوں وہ چشتیہ ہائی سکول کرشن نگر میں پڑھاتے تھے۔ ایم آئی شمیم لاہور سے گوجرانوالہ چلے گئے تھے۔ عارف صاحب سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی تھی۔ 1966ء میں ''اوراق'' کا اجرا ہوا تو وہ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے ساتھ اس جریدے کی ترتیب و تدوین میں ان کے شریک ہو گئے۔ اوراق کا دفتر اردو بازار کے چوک میں ایک بینک کی عمارت کے ایک کمرے میں تھا۔ عارف صاحب کا اپنا اشاعتی ادارہ بھی یہیں موجود تھا۔ کالج سے فارغ ہو کر اکثر ان سے نشست رہتی۔ کیا زمانہ تھا! یا شاید گزرا ہوا زمانہ وقت کے فاصلے کی وجہ سے ایک سبزہ زار میں بدل جاتا ہے حالانکہ اس میں جھاڑ جھنکار بھی ہوتا ہے، کانٹے بھی اور کلر زدہ زمین کے بنجر قطعے بھی۔ 1969ء کے لگ بھگ جب اعجاز فاروقی صاحب نے ''نئی ادبی تنظیم'' کی بنیاد رکھی تو عارف عبدالمتین مرحوم اس کے بنیادی سرگرم اور نہایت اہم ممبر تھے۔ صلاح الدین ندیم، صادق حسین، صابر لودھی، فرخندہ لودھی، رحمٰن مذنب کے ساتھ راقم الحروف کو بھی اس تنظیم کا بنیاد ممبر ہونے کا فخر حاصل تھا۔ یہ تنظیم دو تین سال چلی لیکن ممبران کا آپس میں محبت کا رشتہ قائم رہا۔ یہ انجمن مختلف نظریات کے حامل ادیبوں کا مجموعہ تھی۔ رحمٰن مذنب پکے ''حلقہ ارباب ذوقیے'' تھے اور اعجاز فاروقی بھی حلقہ ارباب ذوق سے ہی منسلک رہے تھے۔ عارف عبدالمتین اور صلاح الدین ندیم پکے ترقی پسند تھے۔ صادق حسین نہایت معتدل مزاج کے حامل افسانہ نگار تھے۔ صابر لودھی اور فرخندہ لودھی حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند انجمن کے بعد کے آدمی تھے۔ راقم الحروف صرف گورنمنٹ سرونٹ تھا۔ نہ ادھر کا نہ ادھر کا۔ (واضح رہے کہ ان دنوں سرکاری ملازم کو افسانہ بھی چھپوانا ہوتا تو اپنے محکمے کے ہیڈ سے اجازت لینی پڑتی تھی اور اکثر نہیں ملتی تھی۔) لیکن راقم الحروف دل سے پکا ترقی پسند تھا اور اب بھی ہے۔ چنانچہ عارف مرحوم سے کبھی کسی فکری و نظری مسئلے پر اختلاف نہ ہوا۔ میرا خیال ہے کہ سچا ادیب ہمیشہ ترقی پسند ہوتا ہے۔

میں عارف مرحوم سے کہا کرتا تھا کہ آپ اردو میں ایم۔ اے کر لیں۔ وہ کہتے یار لوگ

مجھے اردو میں اچھی ڈویژن نہیں لینے دیں گے۔ یہ ان کا خوف تھا جو میں رفع نہ کر سکا۔ وہ اردو میں ایم۔اے کر لیتے تو یقیناً فرسٹ کلاس فرسٹ رہتے۔ ایک انجینئر انور سدید نے یہ معجزہ کر دکھایا۔ عارف مرحوم نے ایک عرصہ بعد ایم۔اے اسلامیات نہایت اچھے نمبروں میں پاس کیا تو لوگ حیران رہ گئے۔ اسلامیات کے مطالعے نے ان کی زندگی کا رخ یکسر پلٹ دیا۔ وہ اتنے پکے مسلمان ہو گئے کہ وہ جنہیں مسلمانی کا دعویٰ تھا انہیں بھی ان پر رشک آنے لگا۔ میرا ناقص خیال ہے کہ وہ مسلمان تو پہلے ہی تھے البتہ ترقی پسندی اُن پر حاوی تھی۔ جب بقول شخصے مسلمان ہوئے تو یکسر مسلمان ہو گئے۔ مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں وہ فطرتی طور پر انقلابی تھے۔ ان کی کمیونزم بھی انقلاب تھی اور ان کا اسلام بھی تاہم وہ آخر دم تک ترقی پسند رہے۔ میں نے انہیں سرمایہ داری اور جبر و استبداد سے کبھی مفاہمت اور دانشورانہ مزاج قطعاً نہیں بدلا تھا۔ ترقی پسندی کے مقابلے میں ایک اصطلاح اسلام پسندی بھی خاصی معروف اور متداول رہی ہے لیکن عارف مرحوم اس حقیقت کے قائل تھے کہ ترقی پسندی کا متضاد رجعت پسندی ہے اور اسلام کبھی رجعت پسند نہیں رہا۔ اس سے زیادہ ترقی پسند دین اور کون سا ہو سکتا ہے؟

عارف مرحوم کو ذات محمد مصطفیٰ سے بہت محبت تھی۔ ''باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار'' قسم کے عقائد کے حامل تھے۔ رسول اکرم کو دنیا کا عظیم ترین انسان سمجھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ آنحضورؐ ازل سے لے کر ابد تک اس دنیا کے سب سے بڑے انقلابی ہیں اور رہیں گے لیکن جب قرآن و سیرت کا گہرا مطالعہ کیا تو ان کی محبت میں عقیدت کی چاشنی در آئی اور اس کی ناثیر دو آتشہ ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے ایسی نعت لکھی جس میں فکر و فلسفے سے زیادہ ایمان و عقیدت کا سوز و گداز ہے۔

افسوس کہ 1983ء میں ریٹائر ہونے کے بعد ان سے بہت کم ملاقاتیں ہوئیں۔ بہر حال جب بھی ملتے، فرط محبت سے بغل گیر ہوتے۔ وہ واقعی محبت کا سمندر تھے۔ نہایت دھیمے مزاج کے باوقار انسان تھے۔ گفتگو میں بھی دھیما پن تھا۔ ہونٹوں پر اکثر مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ بہت کم غصے میں آتے لیکن غصے کے اظہار میں بھی کوئی ایسا لفظ ان کی زبان سے نہ نکلتا جس سے مد مخالف کو دکھ ہو یا وہ ہتک محسوس کرے۔ نئی ادبی تنظیم کے زمانے میں ایک بار ہم ممبران میں کچھ بحث مباحثہ ہو گیا جس میں خاصی تلخی آ گئی۔ عارف مرحوم جب اگلی بار ملے تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ان کے ایک بیٹے عرفان عارف ایک حادثے میں وفات پا گئے۔ اس کا انہیں شدید غم تھا اور رو رو کر ان کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ جب اپنے دوست ایم آئی شمیم کے ساتھ انہیں پرسا دینے گیا تو فرمانے لگے ''اللہ کی رضا پر شاکر ہوں۔'' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس غم کو بھلا نہ سکے یا غم اس طرح بھولا کہ لوح حافظہ پر کوئی نقش باقی نہ رہا۔ نہ غم' نہ خوشی' بلکہ ازل سے ابد تک کا ہر لمحہ کمپیوٹر سے ''واش'' ہو گیا۔ اس حالت میں میری ان سے کوئی ملاقات نہ ہوئی۔ کل جب فون پر صلاح الدین ندیم سے رابطہ ہوا تو انہوں نے فرمایا ''دو سالوں سے وہ ایک چلتی پھرتی لاش تھے۔'' وہ ''الزہائمر ڈیزیز'' میں مبتلا تھے۔ میں حیران ہوں کہ ان کے یہ دو سال کیسے گزرے ہوں گے؟ نہ شعر' نہ تنقید' نہ بحث مباحثہ کہ جس موضوع پر چاہتے اس پر بے تکان گفتگو کرتے اور اسے کمال تک پہنچاتے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے گوشے اور زاویے' اتنی گہرائیاں انہوں نے کہاں سے تلاش کر لی تھیں۔ کہتے ہیں کہ نطشے کے ذہن میں کبھی کبھار ہوش مندی کے چند لمحے جگنو کی طرح چمکتے تھے۔ ایک بار ایک کتاب دیکھ کر اس نے اپنی بہن سے کہا ''لو بتھ! ہم نے بھی تو کبھی ایک کتاب لکھی تھی۔'' میرا خیال ہے کہ اقبال کا یہ ''مجذوب فرنگی'' بھی اسی مرض میں گرفتار تھا۔ کیا عارف مرحوم کے ذہن میں بھی کبھی کوئی لمحہ جگنو کی طرح چمکا؟ یہ تو ان کے اس فرماں بردار بیٹے کو معلوم ہو گا جس نے سالہا سال ان کی خدمت کے لئے وقف کر دیے تھے!

عارف مرحوم کی سوانح لکھنے کے لئے جناب صلاح الدین ندیم سے زیادہ اور کوئی ادیب موزوں نہ ہو گا کہ امرتسر سے تا لمحہ حال ان کے ندیم' غم خوار اور دمساز رہے!

16 فروری 2000

اعداد وشمار اور انسان

یہ زمانہ ''اعداد وشمار'' کا ہے۔ انسان اپنی اس ذہنی اختراع سے خود غائب ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''اعداد وشمار'' مقصود بالذات ہو کر رہ گئے ہیں۔ یعنی انسان اعداد وشمار کے لئے ہے' نہ کہ اعداد وشمار انسان کے لئے۔ انسان کی انسان کے ساتھ باہمی معاشرت میں بھی اعداد وشمار در آئے ہیں۔ آپ کسی بیمار دوست سے اس کی صحت کا حال پوچھیں تو وہ کہے گا ''ففٹی ففٹی''، یعنی پچاس فیصد درست ہے اور پچاس فیصد بیمار۔ مجھ سے کوئی صحت کا حال دریافت کرے تو میں کہتا ہوں کہ چونکہ میں آپ کو چلتا پھرتا نظر آتا ہوں' اس لئے یہی سمجھئے کہ سو فیصد فٹ ہوں۔ اعداد وشمار کی رو سے ان دنوں ہمارا روپیہ ڈالر کے مقابلے میں کبھی قدر و قیمت میں کچھ فیصد بڑھ جاتا ہے اور کبھی گھٹ جاتا ہے۔ لیکن اگر نحیف ونزار روپے کے سکے کے وزن کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب ڈالر کے مقابلے میں اسے ہم ''معدوم'' قرار دیں گے۔ معلوم نہیں اعداد وشمار کی رو سے اسے کیا کہا جائے گا۔ اعداد وشمار کہتے ہیں کہ گندم کے ایک چھٹانک آٹے کی قیمت تقریباً پچاس پیسے ہے۔ اس حساب سے ایک روٹی ایک روپے میں ملنی چاہئے لیکن وہ ان دنوں دو روپے میں مل رہی ہے۔ گویا سو فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔ اس تناسب سے ایک پاکستانی مزدور یا کلرک یا استاد جس کی آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا' اسے دو کی بجائے ایک روٹی کھانی چاہئے اور میں ایک پنشن خوار جو سارے دن ایک روٹی کھاتا ہوں' اعداد وشمار کی رو سے مجھے ہوا اور پانی پر زندہ رہنا چاہئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ پچھلے سال گندم کی ریکارڈ پیداوار ہوئی ہے۔ ہم تو یہی سنتے آئے ہیں کہ فصل زیادہ ہو تو قیمت گھٹ جاتی ہے لیکن اعداد وشمار کہتے ہیں کہ نہیں قیمت میں کمی تب ہوتی ہے جب اعداد وشمار اس کی اجازت دیں اور تیل اور پٹرول کی قیمت میں اضافہ ہو تو اعداد وشمار کہتے ہیں کہ اس کا غریب کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کہ وہ ٹرانسپورٹ استعمال نہیں کرتا بلکہ پیدل بھی نہیں چلتا۔

لیکن میرا اصل موضوع کچھ اور ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک ترقی پذیر ملک میں

ایک بجٹ سے دوسرے بجٹ کا فاصلہ صرف اعداد و شمار کے ذریعے طے ہوتا ہے۔ کبھی اعداد و شمار اس کے درخشاں مستقبل کی نوید دیتے ہیں کبھی تاریک مستقبل کا پتہ۔ کبھی امید کا دیا جلاتے ہیں اور کبھی مایوسی کی دھند میں لپیٹ دیتے ہیں۔ ان دنوں کوئی وزیر با تدبیر سکرین پر آتا ہے' اعداد و شمار کا پلندہ اپنے ساتھ لاتا ہے اور اس کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ جبھی تو آج تک میں بہت کم وزیروں کے چہروں سے آشنا ہو سکا ہوں حالانکہ دور جمہوریت کے اکثر وزیروں سے چہرہ شناسی کا رشتہ قائم تھا' وہ اکثر اعداد و شمار کے جھمیلے میں نہیں پڑتے تھے کیونکہ اعداد و شمار ان کی ذہنی اور تعلیمی استعداد سے کہیں زیادہ گنجلک ہوتے تھے۔ وہ قوم کو کوئی نہ کوئی خوشخبری ضرور دیتے تھے لیکن اگلے دن اخبار میں جو اعداد و شمار چھپتے' ان میں بڑی خبر کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا۔

جمہوری دور کے ایک وزیر خزانہ ہوا کرتے تھے جن سے میرا چہرہ شناسی کا تعلق کچھ دلی رابطہ سا بن گیا تھا کہ اب بھی وہ چہرہ میرے تخیل میں آتا ہے تو مجھے اس پر پیار آتا ہے۔ وہ اعداد و شمار کے بڑے ماہر تھے لیکن نہ خود ان کی بھول بھلیوں میں گم ہوتے اور نہ ناظرین کو گم ہونے دیتے۔ وہ قوم کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ آئی ایم ایف سے ملنے والی قرضے کی قسط کو ہمیشہ پائپ لائن میں رکھتے' اگرچہ ابھی تک وہ دہانے سے بہنا شروع نہیں ہوئی لیکن آج کل کے وزیر خزانہ پر اعداد و شمار اس درجہ غالب ہیں کہ میں نے انہیں اکثر سکرین پر دیکھا ہے لیکن ان کا چہرہ شناس نہیں ہوا۔ وہ اعداد و شمار کی چلمن کے پیچھے سے اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں لیکن سامنے نہیں آتے۔ ان کے اعداد و شمار سے انسان غائب نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انھوں نے صرف اعداد و شمار کا تماشہ دکھانے کیلئے وزارت کا عہدہ قبول کیا ہے۔ ان کی لیاقت اور فرض شناسی میں کوئی کلام نہیں لیکن افسوس تو یہ ہے کہ وہ آئی ایم ایف کی موجودہ قسط کو ''پائپ لائن'' میں بھی نہیں رکھتے۔ یہی فرق ہے ایک جمہوری اور غیر جمہوری وزیر کا۔ ایک جمہوری وزیر ''انسان'' کو اپنے اعداد و شمار سے خارج نہیں کرتا' کم از کم اسے امید پر ضرور زندہ رکھتا ہے۔

''واپڈا'' کے سربراہ ایک لیفٹیننٹ جنرل ہیں۔ انہیں جمہوری دور میں ''واپڈا'' کو پاک صاف کرنے کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ وہ اس میں بہت کامیاب بھی ہیں۔ انہوں نے واپڈا کو اپنی بنیادوں پر مستحکم کر دیا ہے۔ اعداد و شمار کی رو سے انہوں نے واپڈا کو دلدل سے نکال لیا ہے۔ اگرچہ منگلا اور تربیلا ڈیم میں سلٹ کے بڑھ جانے کی وجہ سے پانی کی مطلوبہ سطح کم ہوتی جا رہی ہے' اور فرنس آئل بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ تاہم واپڈا کی بدولت وہ ٹیوب روشن ہے جس کی روشنی

میں بیٹھ کر میں یہ کالم لکھ رہا ہوں۔ واپڈا کے بجٹ میں ابھی تک اربوں روپے کا گھاٹا ہے۔ یہ صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ کوئی اور ڈیم بنے یا فرنس آئل کی قیمت کم ہو یا بجلی کے یونٹ کی قیمت بڑھائی جائے۔ جنرل صاحب بھی اعداد و شمار کو بہت درست رکھتے ہیں اور یہ بھول گئے ہیں کہ انسان اعداد و شمار سے زیادہ اہم ہے۔ اگر یہی حال رہا تو غریب کی کٹیا میں اعداد و شمار کا دیا ہی جلانا پڑے گا۔

میں ان جنرل صاحب کی جو ریلوے کے وزیر ہیں' تعریف کروں گا کہ انہوں نے ریلوے کا پہیہ جام نہیں ہونے دیا۔ اگرچہ پٹڑی سے کبھی کبھی اتر جاتا ہے۔ تاہم وہ ریلوے کو خود کفیل بنانے کیلئے دن رات کوشاں ہیں۔ اللہ ان کے نیک ارادوں میں برکت دے۔ انہیں بھی اعداد و شمار سے کچھ زیادہ ہی محبت ہے۔ لیکن اعداد و شمار میں جو انسانی عنصر شامل ہونا چاہئے' وہ ان کی مساعی سے بھی خارج نظر آتا ہے۔ مثلاً آمد و خرچ کو متوازن رکھنے کیلئے ریلوے میں چھانٹی ہو رہی ہے جس سے بیروزگاری میں اضافہ ہوگا' کرایوں کی شرح میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ غریب لوگ ہی متاثر ہوں گے اور متوسط طبقہ بھی جو پی آئی اے کا کرایہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ریلوے کی ''پوش'' گاڑیوں پر سفر کرنے پر مجبور ہے۔

مجھے اپنے اردگرد جو حقیقی دنیا نظر آ رہی ہے۔ اس میں غربت کی سطح گرتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ یعنی غریبی اور ناداری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دو تین سال پہلے جو نوجوان بیروزگار نظر آتے تھے' وہ آج بھی بیروزگار ہیں۔ تعلیم سے محروم بچوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ مزدور ہو یا کسان' ملازم ہو یا کاریگر' خوانچہ فروش ہو یا ریڑھی پر سودا بیچنے والا یا چھوٹا دکاندار کسی کے آمدن و خرچ کو کسی اعداد و شمار کے ذریعے متوازن نہیں کیا جا سکتا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ ہوٹلوں اور تندروں پر بکنے والی روٹی اب دو روپے میں ملتی ہے اور اس کا وزن بھی کم ہو گیا ہے۔ یہ خاصا مشکل حساب کتاب ہے۔ کسی اعداد و شمار کے ماہر سے پوچھوں گا کہ روٹی کی قیمت میں کتنے فیصد اضافہ ہوا ہے اور اس کے مقابلے میں روٹی کھانے والے کی اشتہاء کتنے فیصد کم ہوئی ہے؟

غرض کہ جب تک اعداد و شمار میں انسانی عنصر شامل نہیں ہوگا' اس وقت تک ترقی کا کوئی منصوبہ یا دعویٰ کامیاب قرار نہیں دیا جائے گا۔

20 جنوری 2000ء

یہ اکیڈیمیاں؟...... کیا ایک ضرورت ہیں؟

کوئی زمانہ تھا کہ ''اکیڈمی'' کا لفظ بہت وقار کا حامل ہوتا تھا۔ اب ''اکیڈیمیاں'' وطن عزیز کے شہروں، قصبوں بلکہ دیہات میں بھی کھمبیوں کی طرح اگ آئی ہیں۔ اکیڈیمیاں اتنی عام ہوگئی ہیں کہ آپ کسی گلی محلے میں چلے جائیں، دیواروں پر آپ کو عجیب عجیب نام کے اشتہار لگے ہوئے نظر آئیں گے اور بڑے بڑے بازاروں میں ان کے پھریرے اڑتے ہوئے۔ ان میں سے اکثر ''ٹیوشن سنٹر'' ہوتے ہیں، جہاں عام طور پر میٹرک، ایف اے اور ایف ایس سی کے طلباء ٹیوشن پڑھتے ہیں۔ جب سکول اور کالج کے اوقات ختم ہوتے ہیں، اکیڈیمیوں کی گرم بازاری شروع ہو جاتی ہے۔

اکیڈیمی کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ طالب علم سکول اور کالج میں ملنے والی درسی تعلیم سے مطمئن نہیں۔ اگر سکولوں اور کالجوں میں کورس ختم کروا دیئے جائیں، امتحانی نقطہ نظر سے ان کی دہرائی بھی کر دی جائے، کچھ نمونے کے پرچے حل کرا دیئے جائیں اور وقتاً فوقتاً ٹیسٹ بھی لئے جائیں تو طالب علم کو ٹیوشن کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اکیڈیمی کا وجود ثابت کرتا ہے کہ استاد بھی زمانے کی رو میں بہہ گیا ہے اور اس کے درویشانہ اور وطن پرستانہ جذبے ماند پڑ چکے ہیں۔ بلاشبہ اس مہنگائی کے دور میں دوسرے ملازمین کی طرح اس کی تنخواہ بھی کفایت نہیں کرتی اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ٹیوشن ورک بھی بہت محنت طلب ہے۔ یہ بھی ایک جائز کمائی ہے۔ رشوت، یا لوٹ مار تو نہیں لیکن اس کی کوئی حد ہونی چاہیے۔ اگر استاد اپنا فرض منصبی اس لئے محنت سے ادا نہ کرے کہ اس طرح اس کے ٹیوشن سنٹر میں طلباء نہیں آئیں گے اور رات کو دیر تک ٹیوشن ورک کر کے دن کو وہ کرسی پر بیٹھ کر حالت غنودگی میں مبتلا رہے یا لیکچر دیتے وقت جمائیوں کو روکنے کے لئے بار بار اسے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑے یا وہ کلاس ''کٹ'' کرے تو ٹیوشن کی محنت طلب اور جائز کمائی میں حرام کا شائبہ ضرور آ جاتا ہے۔

اکثر اکیڈیمیاں ان اساتذہ کی قائم کردہ ہیں جو حاضر سروس ہیں۔ دن کو سکول اور کالج

میں پڑھاتے ہیں، رات کو اکیڈمی چلاتے ہیں۔ اکیڈیمیوں میں ریٹائرڈ اساتذہ بھی پڑھاتے ہیں، لیکن خالی خالی، ریٹائرڈ اساتذہ کے پاس تجربہ ہوتا ہے لیکن وہ جدید امتحانی ٹیکنیک سے ہم آہنگ نہیں رہتے۔ وہ نوجوان اساتذہ کی طرح چاق و چوبند بھی نظر نہیں آتے۔ حاضر سروس اساتذہ اکیڈمی میں آ کر بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ طلباء میں نوٹس کی کاپیاں تقسیم کرتے ہیں، ٹیسٹ لیتے ہیں اور تحریری کام کرواتے ہیں۔ انہیں ان کی فیسوں کی پوری قیمت ادا کرتے ہیں۔ تحریری کام کی اصلاح کرتے ہیں۔ کبھی سکولوں اور کالجوں میں تحریر پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ سکولوں میں تو طلباء کو خاصا تحریری کام کروایا جاتا تھا۔

کالجوں میں چونکہ لیکچر سسٹم رائج ہے، اس لئے نوٹس تو لکھوا دیئے جاتے ہیں لیکن تحریر ناپید ہے۔ جب کبھی ہم پتھر دھات کے زمانے میں کالج میں پڑھتے تھے، ہمارے پروفیسر "انگریزی" میں مضمون لکھواتے تھے اور ان کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ کاپیاں اکٹھی کر کے گھر لے جاتے تھے، ریاضی میں بھی کام ملتا تھا جو اساتذہ باقاعدگی سے چیک کرتے تھے۔

مرے کالج سیالکوٹ میں پروفیسر لیزلی سکاٹ اور ڈاکر ذیلی فلسفے اور نفسیات کے نوٹس اپنے خرچ پر چھپوا کر کلاس میں تقسیم کرتے تھے اور مہینے میں ایک بار ٹیسٹ ضرور لیتے تھے۔ اتنی مشنری سپرٹ دیسی اساتذہ میں مفقود تھی لیکن کوئی استاد کلاس "کٹ" نہیں کرتا تھا۔

اب سکول کے طلباء کے پاس کاپیاں بہت ہوتی ہیں۔ ان پر کچھ نہ کچھ لکھا بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اساتذہ دستخط ضرور ثبت فرماتے ہیں۔ البتہ پبلک سکول میں کاپیاں چیک ضرور ہوتی ہیں لیکن نہایت سرسری انداز میں۔ اب میں پھر پتھر دھات کے زمانے کی بات کرتا ہوں۔ میں نے سولہ سترہ سال ہائی سکولوں میں پڑھایا ہے اور چھٹی سے دسویں جماعت تک کی کاپیاں چیک کرتا اور صبح کوئی افسانہ بھی لکھ لیتا۔ ان دنوں میرے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور دو انگلیوں پر سرخ روشنائی کے نشانات ثبت ہو گئے تھے لیکن افسوس کہ کالج میں آ کر دھل گئے۔ میں نے کالج میں بھی کوشش کی کہ طلباء سے کچھ لکھواتا رہوں لیکن طلباء نے میرا ساتھ نہ دیا بلکہ الٹی شکایت کی کہ یہ پروفیسر اپنی سکول ماسٹری نہیں بھولا۔ تاہم میں طلباء کو نوٹس ضرور لکھواتا رہا کہ تحریر سے ان کا رابطہ تو قائم رہے۔

کالج اساتذہ کو شکایت ہے کہ جن طلباء نے بورڈ یا یونیورسٹی کے امتحان میں شریک ہونا ہوتا ہے، وہ امتحان سے دو دو مہینے پہلے ہی سے کالج میں آنا بند کر دیتے ہیں۔ کبھی سکولوں اور کالجوں

میں امتحان کی تیاری کیلئے دو ہفتوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں۔ کالج کی انتظامیہ اس کا سدباب کر سکتی ہے کہ تین چار دن مسلسل غائب رہنے والے یا زیادہ غیر حاضریاں کرنے والے طالب علم کا نام خارج کر دیا جائے اور دوبارہ داخل ہونے پر پھر اس سے فیس مطالبہ وصول کی جائے۔ اس کا امتحانی فارم بھی واپس منگوالیا جائے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پچھلے سال سے ایسی پابندی عائد ہے۔

جب تک تیاری کی چھٹیاں نہ ہوں' طلباء کالج میں تعلیم سے مستفید ہوتے رہتے ہیں اور جو طلباء پرائیویٹ اکیڈیمی کی فیس برداشت نہیں کر سکتے' ان کی تیاری کالج میں مکمل ہو جاتی ہے۔ وہ اساتذہ کو دعائیں دیتے ہیں اور اساتذہ کو بھی فرض منصبی کا کما حقہٗ بجا آوری کر کے اطمینان قلب کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

لیکن موجودہ حالات میں پرائیویٹ اکیڈیمیوں کا قیام ضروری معلوم ہوتا ہے یا کم از کم انہیں ایک ضروری برائی سمجھ کر قبول کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ برائی برائی ہی ہوتی ہے خواہ کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو۔ اسے غنیمت شمار نہیں کرنا چاہئے۔

اکیڈیمیوں کے قیام کی بڑی وجہ ڈاکٹری اور انجینئرنگ کی کلاسوں میں داخل ہونے کے لئے "کٹ تھروٹ" مقابلہ ہے۔

اس مقابلے کے لئے اعلیٰ نمبروں کی ضرورت ہے۔ سکول اور کالج میں اس سطح کی محنت نہیں کروائی جا رہی۔ کبھی ہر سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے اُمیدوارں کو زیادہ سے زیادہ نمبر دلائے۔ بوٹی مافیا بھی بہت زیادہ سرگرم عمل تھی۔ اب امتحانی اصلاحات کی وجہ سے اس برائی کا انسداد ہو گیا ہے اور انٹری ٹیسٹ کی وجہ سے ڈاکٹری میں داخلہ خاصا مشکل ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے عام کالج یا سکول تو کیا پبلک اداروں کے طلباء بھی اکیڈیمیوں میں داخلہ لے رہے ہیں۔ اب تو کئی اکیڈیمیوں میں "انٹری ٹیسٹ" کی تیاری بھی کروائی جاتی ہے۔

آخر میں یہی کہوں گا کہ اگر سکولوں اور کالجوں میں قومی اور انسانی ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہو کر تعلیم نہ دی گئی تو کسی غریب کا ذہین بیٹا ڈاکٹر بن سکے گا' نہ انجینئر۔ سی ایس ایس کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کتنے فی صد بچے ہیں جو اکیڈیمی کی فیس ادا کر سکتے ہیں' شاید پانچ فیصد؟ اگر تعلیم کا شعبہ بھی کمرشلائز ہو گیا تو ملک وقوم کا اللہ حافظ ہے۔

10 فروری 2001ء

شوبز کی خبریں

اخبار میں شوبز کی خبریں بلا ناغہ چھپتی ہیں۔ میں انہیں ضرور پڑھتا ہوں۔ ان سے مجھے جمالیاتی حظ حاصل ہوتا ہے اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ نیز ملک کی تہذیب وثقافت میں ترقی کی رفتار کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ اکثر اوقات ٹیلی ویژن پر آئندہ لگنے والے سیریل کی کہانی بھی مختصر طور پر بیان کر دی جاتی ہے، جس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ سیریل کے سمجھنے میں مجھے خاصی مدد ملتی ہے۔ وگرنہ اشتہارات کی فنکارانہ پیشکش میرے لئے اس درجہ جاذب توجہ ہوتی ہے کہ میں انہیں سیریل میں گڈمڈ کر دیتا ہوں۔ ریموٹ بھی میرے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ وہ کسی بچے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اشتہارات لگتے ہی بچے چینل بدل لیتے ہیں۔ اس لئے کئی سیریل بھی گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک ہیرو کو ایک سیریل میں گولی لگتی ہے تو وہ دوسرے میں زندہ ہو جاتا ہے اور میں پوچھتا ہوں کہ "یہ گولی سے مرا نہیں تھا؟" بچے میری معصومیت پر جی کھول کر ہنستے ہیں۔ پہلے تو مجھے غصہ آتا ہے کہ میری انا مجروح ہوئی ہے، بعد میں خوشی بھی ہوتی ہے کہ گولی، بارود، مار دھاڑ، رونے پیٹنے کی فضاء میں ہنسی کی آواز تو ابھری۔

ثقل سماعت کی وجہ سے میرے کانوں میں مسلسل شائیں شائیں ہوتی رہتی ہے۔ آلہ سماعت لگانے کے باوجود دونوں کان آواز کو "سنکرونائیز" نہیں کر پاتے اور اکثر سیریلوں کی ساؤنڈ ریکارڈنگ بھی ناقص ہوتی ہے۔ اس لئے جب کوئی اہم مکالمہ "مس" ہو جاتا ہے، تو ساتھ بیٹھے بچے سے پوچھنا پڑتا ہے "سکینہ سموں نے شبیر جان سے کیا کہا؟" عام طور پر مجھے جواب نہیں ملتا اور میں سوچتا ہوں کہ یہ مکالمے آغا حشر کے لکھے ہوئے تو نہیں کہ ضرور سنے جائیں۔ چنانچہ میں آلہء سماعت کان سے اتار دیتا ہوں اور خاموش فلموں کے دور میں پہنچ جاتا ہوں۔

حال ہی میں ایک سیریل "زندگی بدلتی ہے" اختتام کو پہنچا ہے۔ آخری قسط دیکھنے کے بعد میں نے ایک بچے سے پوچھا "بھلا بتاؤ تو سہی، اس میں کس کس کی زندگی بدلی؟" بچے نے کہا "دادا جی! مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا "سابق وزیر اطلاعات جاوید جبار کی۔ کیونکہ یہ سیریل ان

کی بیٹی مبرین جبار نے پروڈیوس کیا تھا۔''

اس سیریل کی سب سے بڑی اور شاید ایک ہی خوبی یہ ہے کہ اسے ملک سپین کے کسی شہر کی ایک تنگ سی گلی کے ایک نہایت ہی تنگ سے مکان میں ریکارڈ کیا گیا اور اس میں کسی کردار کی زندگی نہیں بدلی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک نقطے پر گھومتی رہی۔

ان دنوں ایک سیریل اپنے انجام کو پہنچ رہا ہے۔ اس کا عنوان ''انکار'' ہے اور موضوع منشیات ہے۔ اس کا مقصد اصلاح ہے۔ یہ سیریل بلاشبہ ایک حقیقت پر مبنی ہے۔ لیکن حقیقت کے اندر اتنی لذت پیدا کر دی گئی ہے کہ اصل مقصد فوت ہو گیا ہے۔ اتنا گرما گرم سیریل شاید ہی دیکھنے کو ملا ہو۔ جی چاہتا ہے کہ بچے اٹھ کر چلے جائیں اور میں بے غل و غش اس سیریل سے گرم ہوتا رہوں بلکہ ہیٹر بھی بجھا دوں لیکن بچے نہیں اٹھتے تو میں اٹھ جاتا ہوں اور کمرے میں ٹہلنے لگتا ہوں۔ اس سیریل سے مخلوط تعلیم کی خرابیاں بھی واضح ہوتی ہیں۔ ایسا ہی تاثر سیریل ''ڈھول'' سے بھی ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے نونہال کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے نہیں جاتے بلکہ شادیاں بنانے جاتے ہیں۔ ''ڈھول'' بھی ایک اصلاحی سیریل ہے لیکن نہایت غبار آلودہ۔

میں نے کالم کا آغاز شوبز کی خبروں سے کیا تھا اور ادھر ادھر بھٹک گیا۔ ایک خبر ڈراما سیریل ''سفید سائے'' کے متعلق ہے۔ یہ ایک پرائیویٹ پروڈکشن کا منصوبہ ہے جس کی ساری شوٹنگ امریکہ اور انگلینڈ میں ہو گی۔ شاید اسی لئے اس کا عنوان ''سفید سائے'' ہے۔ پچھلے کئی سیریلوں میں ہم امریکہ اور انگلینڈ کی جی بھر کر سیر کر چکے ہیں۔ دو سیریل ایسے تھے جن میں ہمیں سکاٹ لینڈ کی سیر کرائی گئی تھی۔ یہ بہت کامیاب سیریل تھے کہ انہیں اشتہارات بہت ملے تھے لیکن یہ سارے شادی بیاہ کے مسائل پر بنائے گئے تھے۔ ضمناً کچھ اور واقعات بھی تھے جو یاد نہیں رہے لیکن اتنا ضرور یاد رہ گیا ہے کہ امریکہ' انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ میں بسنے والے پاکستانیوں کے مسائل جوں کے توں رہے اور یہ سیریل ان کا کوئی حل پیش نہ کر سکے۔

ان سیریلوں میں پروفیسر اصغر ندیم کا ایک سیریل یاد رہ گیا ہے جس کا عنوان ''محبتیں'' ہے۔ میں اسے ''محبتیں ہی محبتیں'' کہا کرتا تھا۔ یہ انگلینڈ میں فلمایا گیا اور اس میں شہر کی بجائے دیہات کی سیر کرائی گئی' وہ دیہات جہاں گھاس ہی گھاس تھی۔ گھوڑوں کا ایک اصطبل تھا یا گھاس کے میدان جن پر اکثر ابر چھایا رہا۔ کبھی کبھی بوندا باندی بھی ہوئی۔ ایک دریا بھی بار بار دکھایا گیا۔ کبھی کبھار دھوپ نکلی اور یاس انگیز منظر میں کچھ امید کی روشنی نظر آئی۔ اس سیریل میں پانچ محبتیں

ریکارڈ کی گئیں۔ یہ اصغر ندیم سید کا کمال ہے کہ پانچ کہانیوں کا نقطہءعروج تک پہنچایا۔ وہ اپنے سیریل میں کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور پیش کرتے ہیں اور تصادم وکشمکش کی فضاء میں گہری ہوتی ہے۔ اب نہ امریکہ جانے کو جی چاہتا ہے' نہ انگلینڈ کو' ہاں اگر کوئی سیریل ''سائبیریا'' لے چلے یا ''ٹمبکٹو تو بندہ حاضر ہے۔ یوں ''سیریل'' ''زنجیر'' ہمیں گلگت اور سکردو یا چترال کی سیر کراتا رہا۔ اتنے خوبصورت مناظر نہ امریکہ میں نظر آئے' نہ انگلینڈ' سکاٹ لینڈ اور سپین میں۔ اتنے سرسبز پہاڑ اور برف سے ڈھکی سفید پوش چوٹیاں کہ آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور کہاں نظر آئیں گی۔ اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے۔ کوہسار اور مرغزار بھی' جنگل بھی اور منگل بھی' سمندر بھی اور صحرا بھی' دریا بھی جھیلیں بھی۔

شوبر کی ایک خبر ہے کہ رحمٰن مذنب مرحوم کی ایک کہانی پر مبنی ایک سیریل ''سفر'' کے عنوان سے ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ اس سیریل کا تعارف ان الفاظ میں ہوا ہے۔ ''آج کل بیرون ملک ڈرامے بنانے کا رجحان زیادہ ہے۔ اس ماحول میں ''سفر'' کی کہانی کا انتخاب صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ خالصتاً اپنی دھرتی اور اس میں بسنے والوں کی کہانی ہے۔ یہ ایک متنوع سیریل ہوگا جو لاہور' دریائے چناب' چھانگا مانگا' ایبٹ آباد اور کراچی کے ساحل پر ریکارڈ کیا جائے گا۔''

شاید ''سفر'' وہی کہانی ہے جس کے کسی لمحے یا نقطے پر رحمٰن مذنب کے قلم کی نوک چلتے چلتے رک یا اٹک گئی تھی کہ انہیں اللہ کی طرف سے بلاوا آ گیا تھا۔ میں اس سیریل کے لئے چشم براہ ہوں کہ یہ ان کے ایک ''سفر'' کا نقطہ انتہا بھی تھا اور اس سے اگلے ''سفر'' کا نقطہ آغاز بھی...

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یکم مارچ 2001

پانچ روپے میں ایک لفافہ

آج سے ایک زمانہ پہلے لفافہ پانچ پیسے میں ملا کرتا تھا' ان دنوں لفافہ عام طور پر دفتروں میں استعمال ہوتا تھا یا چند پڑھے لکھے اہل استطاعت اس قسم کی عیاشی کے مرتکب ہوا کرتے تھے۔ پوسٹ کارڈ دو پیسے میں ملتا تھا اور اس کے ذریعے چھوٹی چھوٹی باتیں مکتوب الیہ تک پہنچائی جاتی تھیں۔ تاہم جب کبھی کوئی نہایت ہی راز کی بات کہنی ہوتی تو کم استطاعت لوگ بھی لفافہ استعمال کرنے پر مجبور ہوتے۔ میرے بچپن بلکہ جوانی اور ادھیڑ عمر تک میرے والد مرحوم مجھے پوسٹ کارڈ ہی لکھتے تھے اور میں بھی جواب میں پوسٹ کارڈ ہی لکھتا تھا۔ عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ بھی کارڈ ہی کے ذریعے خط و کتابت ہوتی تھی۔

پھر اچانک ایسا ہوا کہ عزیزوں اور دوستوں نے کارڈ نویسی ترک کر دی حتیٰ کہ میرے سب سے بڑے قلمی دوست یعنی میرے برادر خرد پروفیسر سجاد نقوی کی طرف سے بھی لفافہ آنے لگا تو میں نے بھی کارڈ نویسی ترک کر دی۔ یاد پڑتا ہے کہ آخری پوسٹ کارڈ میں نے اپنے بزرگ دوست نور احمد انجم فاروقی مرحوم کو لکھا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے لفافہ لکھا اور کہا کہ پوسٹ کارڈ میرے پوتوں کو ایک اعجوبہ لگا۔ وہ پوچھتے تھے کہ دادا جان! یہ کیا ہے۔ بات یہ تھی کہ اس دن میرے پاس لفافہ نہیں تھا اور فائل میں سے ایک پوسٹ کارڈ نکل آیا تھا۔ اب بھی پوسٹ کارڈ ڈاکخانے سے ملتا ہوگا لیکن میں نے گزشتہ پندرہ بیس سال سے اس کی شکل نہیں دیکھی۔

اب ممکن ہے کہ پھر پوسٹ کارڈ کی طرف رجوع کرنا پڑے۔ زمانے کا کلاک کبھی کبھی الٹا بھی چل پڑتا ہے جس شرح سے وطن عزیز میں بجلی مہنگی ہو رہی ہے' معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ مٹی کے دیے کے طرف لوٹنا پڑے گا لیکن اس میں بھی سرسوں کا تیل جلتا ہے اور سرسوں کے تیل سے گھی بنتا ہے اور کسی زمانے میں گھی کے دیے بھی جلائے جاتے تھے لیکن کبھی کبھار کسی خاص فنکشن پر' عام طور پر شہنشاہوں کی تخت نشینی کے موقع پر۔ میں نے تو اپنی زندگی کا آغاز لالٹین سے کیا تھا اور لالٹین میں بھی تو مٹی کا تیل جلتا ہے اور اسے جلا کر بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ پس ثابت ہوا

کہ کلاک الٹا چل کر بھی پھر اسی جگہ آ جاتا ہے جہاں سے چلا تھا۔

پوسٹ کارڈ میں آدمی اپنے جی کا غبار نہیں نکال سکتا تھا۔ جانبین نہایت باریک نب استعمال کر کے ایک دوسرے کو خیر خیریت کی خبر پہنچا سکتے ہیں ''امابعد اور کیا لکھوں ...... پوسٹ کارڈ نبڑ گیا ہے۔ تھوڑے لکھے کو بہت سمجھو''۔

میرا خیال ہے کہ مرزا غالب کے زمانے میں پوسٹ کارڈ ایجاد ہوا تھا نہ لفافہ۔ وہ خط لکھ کر رکھ لیتے تھے اور جب ہرکارا آتا تھا' اس کے سپرد کر دیتے تھے لیکن خط کو ملفوف ضرور کرتے ہوں گے اور اس پر دو پیسے کا ٹکٹ بھی لگاتے ہوں گے۔ خط کی ترسیل پر خرچ بھی خاصا اٹھتا ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرض کی مے کشی کے علاوہ خط نویسی نے بھی انہیں فاقہ مستی میں مبتلا کر رکھا تھا جیسا کہ ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

تاہم انہوں نے دوستوں کی خوشی کے لئے' اتنے خطوط لکھے کہ تین چار مجموعے بن گئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک خط بھی محبوب کے نام نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مجھے لفافہ نویسی کی عادت ترک کرنی پڑے گی یا اسے کم کرنا پڑے گا۔ میں مہینے میں کم از کم پچیس لفافے تو ضرور لکھتا ہوں۔ اگر میں اس شرح سے خط لکھتا رہا تو میرا ماہوار خرچ پچاس روپے سے بڑھ کر ایک سو پچیس روپے ہو جائے گا۔ خبر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے عوام کے اخراجات میں کوئی اضافہ نہیں ہو گا جیسے بجلی کی فی یونٹ شرح بڑھنے سے عوام کو کوئی فرق نہیں پڑا کہ وہ اندھیروں سے زیادہ مانوس ہیں۔ ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ عوام کون ہیں اور کیا مجھے بھی عوام میں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یوں خاص لوگ آج کل کلاسیکی انداز کی خط و کتابت نہیں کرتے۔ وہ فون پر بات کر لیتے ہیں۔ فیکس بھی موجود ہے۔ ای میل کی استطاعت بھی رکھتے ہیں اور کچھ نہیں تو کوریئر سروس سے ضرور کام لے سکتے ہیں۔

لفافے کی قیمت بڑھے گی تو رجسٹری کی فیس بھی اڑھائی گنا ہو جائے گی۔ پارسل کا خرچ بھی اڑھائی گنا ہو جائے گا ادبی رسائل پہلے ہی بہت کٹھن حالات سے گزر رہے ہیں۔ اب

ڈاک کا محکمہ تو ان کی کمر توڑ دے گا۔ آج کل ادیب اپنی کتاب اپنے خرچ پر چھپواتا ہے۔ کتاب کی ترسیل کے وقت اسے سوچنا پڑے گا کہ کس کو کتاب بھیجے اور کس کو نہ بھیجے۔ ریٹائرڈ لوگوں میں سے کچھ کو اخبار کے علاوہ کتاب اور رسالے کی لت بھی ہوتی ہے۔ اس کی تشفی کیسے ہوگی لیکن یہ عام آدمی کا مسئلہ نہیں۔

میرے ایک سکول فیلو جناب سراج الدین صاحب پاکپتن شریف سے لکھتے ہیں ''ڈاک کا لفافہ' شنید ہے کہ -/5 روپے میں ملے گا۔ غربا اور متوسط طبقے کے لئے خط وکتابت ہی نصف ملاقات سمجھی جاتی ہے جو ٹیلی فون کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ اب نصف ملاقات کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔ -/5 روپے سکت سے باہر نظر آ رہے ہیں...... تاہم اگر زندہ رہا تو خط کتابت کا ذریعہ قائم رہے گا خواہ لفافہ -/10 روپے کا ہو جائے۔'' بھائی سراج! بہت بہت شکریہ۔ آپ بھی میری طرح پنشن خواہ ہیں۔ مجھے امید نہیں کہ پنشن لفافے کی قیمت میں اضافہ کے تناسب سے بڑھے تاہم ذوق ملاقات پورا کرنے کے لئے اپنے عزم وارادہ کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔ کاگا اب بھی کبھی کبھار منڈیر پر آ بیٹھتا ہے اور کائیں کرنا نہیں بھولا۔ عوام سمجھ جاتے ہیں کہ کسی کی طرف سے خیریت کا پیغام مل رہا ہے۔ ہم بھی سمجھ جایا کریں گے۔ طفیل ہوشیار پوری مرحوم ایک کبوتر کی تخلیق کر گئے ہیں کہ اس کے گلے میں چٹھی باندھ کر کہا جا سکتا ہے!

واسطہ ای رب دا توں جانویں وے کبوترا
چھٹی میرے ڈھول نوں پہنچا دیں وے کبوترا

یوں خط لکھنا اب عادت ثانیہ بن چکا ہے۔ خط لکھنے میں مسرت کے جو دو چار لمحے قابو میں آ جایا کرتے تھے' اب وہ بھی دور سے جگنو کی چمک کی طرح گزر جایا کریں گے۔ ہم لفافے کی تعداد کم کر دیں گے۔ میں پچیس لفافے ماہوار لکھتا ہوں اب دس لکھا کروں گا تا کہ بجٹ متوازن رہے لیکن خبر سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ لفافہ مہنگا کر کے پوسٹ مین کی تنخواہ بڑھائی جائے گی۔ اس صورت میں پوسٹ مین سے محبت ومودت کے رابطے قائم رکھنے کے لئے اس ایثار پر تیار ہوں کہ پوسٹ مین کی تنخواہ جتنی بڑھے گی' اسی تناسب سے لفافے کی کھپت بڑھا دوں گا۔ برادرم سراج صاحب! مجھے امید ہے کہ آپ بھی اس کار خیر میں میرے شریک ہوں گے۔ ہماری اس فیاضانہ پیش کش کو مد نظر رکھتے ہوئے' اب تو ارباب حکومت کو پوسٹ مین کی تنخواہ بڑھانے میں لیت ولعل سے کام نہیں لینا چاہئے!

9 مارچ 2001ء

ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف

9 فروری 2001ء کے اخبار میں ایک خبر کا جلی عنوان تھا ''آئی ایم ایف نے سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بڑھانے کی تجویز دے دی۔'' خبر پڑھ کر میں بہت حیران ہوا اور خوش بھی۔ یہ بھی پڑھا کہ اضافہ نئے بجٹ میں ہوگا اور 20 فیصد ملازم بھی فارغ ہوں گے۔ حیرت تو قائم رہی لیکن خوشی کچھ دھندلا سی گئی۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کو اچانک ملازمین سے اتنی ہمدردی کیوں ہوگئی؟ خیال آیا کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے جو کرتا دھرتا ہیں، وہ روبوٹ تو نہیں، ہماری طرح کے انسان ہی ہیں۔ کسی کا دل پاکستانی ملازمین کی زبوں حالی پر پسیج گیا ہوگا!

اچانک حافظے کی سکرین پر ایک لفظ لکھا گیا ''کابلی والا جو رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک نہایت پر اثر افسانہ ہے اسے یزدانی جالندھری مرحوم نے اردو میں منتقل کیا تھا۔ کابلی والا ایک پٹھان تھا جو کلکتے میں خشک میوے گھوم پھر کر بیچا کرتا تھا۔ ایک ننھی منی بنگالی بچی کو دیکھ کر اسے اپنی بچی یاد آ گئی اور اس سے اسے بہت پیار ہوگیا۔ افسانہ پڑھ کر بے اختیار آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اگلے لمحے ایک فلیش سا ہوا کہ مجھے وہ پٹھان یاد آ گیا جو برصغیر کے بڑے بڑے شہروں میں سود پر روپیہ دیتا تھا۔ لاہور میں بھی کبھی ایسے پٹھان رہا کرتے تھے اور شاید اب بھی ہوں۔ وہ لکھتے تھے ہم غزنی سے آئے ہیں۔ وہ لکھت پڑھت کے بغیر قرضہ دیتے تھے اور ان کا اتنا دبدبہ تھا کہ مقروض ان سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔ کسی کونے کھدرے یا چوہے کے بل میں بھی چھپ جائے، وہ اسے کھوج نکالتے تھے۔ دیہات میں بھی جایا کرتے تھے اور کپڑا چھ مہینے کے ادھار پر دیا کرتے تھے۔ ان کے چنگل میں پھنسا ہوا کوئی مقروض اپنا قرض ادا کر جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔ وہ کہتے تھے'' خوچہ! اصل کا فکر نہ کرو، سود ادا کرتے رہو۔'' سو روپیہ دے کر پانچ روپے مہینے کا سود وصول کرتے تھے۔ چھ مہینے گرمیوں کے غزنی میں گزار کر آتے تو سود کی وصولی کے لئے دن رات ایک کر دیتے۔

ایک دیہاتی ایک ایسے ہی پٹھان کا مقروض ہوگیا۔ حالات اچھے نہ رہے تو سود ادا کرنے کے قابل بھی نہ رہا۔ جب بھی پٹھان گاؤں میں وارد ہوتا تو وہ ادھر ادھر ہو جاتا۔ ایک بار

پٹھان گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ شامت کا مارا دیہاتی گھر لوٹ رہا تھا کہ پٹھان ''یا قربان! قربان!'' کہہ کر اس سے لپٹ گیا۔ دیہاتی بیچارہ غش کھا گیا۔ لوگ اسے اٹھا کر گھر لے گئے جب تک وہ بیمار رہا' پٹھان چارپائی کی پٹی سے لگا رہا اور گاؤں کے حکیم سے اس کا علاج بھی کرواتا رہا۔ کسی نے پوچھا ''خان! تم اس پر اتنا خرچ کر رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے تمہیں اس بیچارے پر ترس آ گیا ہے۔'' پٹھان نے کہا ''خوچہ! ترس نہیں آیا...... یہ مر گیا تو بتاؤ ہمارا قرضہ تم ادا کرو گے؟''

ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی ہمدردیوں کے پیچھے بھی یہی پٹھان والا جذبہ کارفرما ہے۔ پاکستان کے موجودہ حالات سے یہ سود خور ادارے بہت پریشان ہیں۔ انہیں خدشہ ہے کہ حالات یہی رہے تو پاکستان سالانہ اقساط ادا کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ پاکستانی معیشت کی بہتری کے لئے نئی نئی تجاویز سوچتے رہتے ہیں۔ مثلاً ڈاؤن سائزنگ اور ٹیکسوں میں اضافے' سبسڈی کا خاتمہ اور گولڈن ہینڈ شیکس وغیرہ وغیرہ۔ انہیں معلوم ہے کہ ملازم مطمئن ہو گا تو بہتر کارکردگی دکھائے گا اور کرپشن نہیں کرے گا۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ کرپشن بھی ایک قسم کا نشہ ہے کہ جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ ملازمین کی تنخواہیں تو پہلے بھی کئی بار بڑھی ہیں۔ لیکن کرپشن کا گراف بھی ان کے ساتھ ہی اونچا ہوتا چلا گیا ہے۔

ان اداروں کی کوشش ہے کہ پاکستان ڈیفالٹ نہ کرے وہ اصل نہیں مانگتے۔ ہر سود خور کی طرح انہیں حاصل بیاج پیارا ہے۔ کہتے ہیں کہ پاکستان ڈیفالٹ کرنے سے بچ گیا ہے اور ان اداروں کو اطمینان حاصل ہوا ہے لیکن ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اربوں کھربوں ڈالر کا قرضہ پاکستان کو کب ملے گا جو عرصہ تین سال سے پائپ لائن میں ہے اور پائپ لائن کا دہانہ کھل گیا تو پاکستان میں کون سے معجزے بپا ہوں گے؟ کیا کالا باغ ڈیم بن جائے گا یا وہ ڈیم جو پانی سے خالی ہو چکے ہیں پانی سے بھر جائیں گے؟ میرا ناقص خیال ہے کہ پانی ان اداروں کے قبضہ قدرت میں نہیں۔ وہ تو جب بھی برسے گا' آسمان سے برسے گا۔ ان اداروں نے تو ہمارے ایمان و یقین اور جذبوں کو بھی متزلزل کر دیا۔

میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے سنا ضرور ہے کہ یہ ادارے جو قرضہ دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ماہرین کی ایک ٹیم بھی بھیج دیتے ہیں جو اس کے مصرف کو مانیٹر کرتی ہے۔ اسے مقروض ملک کی طرف سے تنخواہیں ملتی ہیں۔ وہ ہر منصوبے کو اتنا طول دیتی ہے کہ بہت سا سرمایہ واپس اپنے گھر چلا جاتا ہے اور جو یہاں لگتا ہے اس سے شاید ہی کوئی منصوبہ مکمل ہوتا ہو۔ اگر

ہو بھی جائے تو وہ سود خوروں کے چنگل میں گرفتار ملک کے لئے سفید ہاتھی بن جاتا ہے۔ یوں قرض اور بھیک دونوں میں ایک بات مشترک ہے کہ اس میں برکت نہیں ہوتی۔

کچھ لیڈر حکومت کو مشورہ دیتے رہتے ہیں کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کو آنکھیں دکھاؤ کہ جاؤ ہم قرضہ واپس نہیں کرتے۔ تم نے جو کرنا ہے کرو، سود خور پٹھان تو ایسی دھمکی سن کر خنجر نکال لیا کرتا تھا۔ ان اداروں کے پاس بھی کئی خفیہ ہتھیار ہوں گے جیسے آستین میں خنجر ہوتے ہیں کہ جنہیں صرف حکومتیں دیکھتی ہیں، وہ لیڈر نہیں دیکھتے جو محراب و منبر کی پناہ گاہ سے ایسے فتوے صادر کرتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے کہ پوری قوم ایثار سے کام لے۔ محبّ وطن پاکستانی لاکروں سے جواہرات نکال کر ان کے آگے ڈھیر کر دیں۔ تنخواہ دار نہیں کہ جب تک پاکستان کا قرض نہیں اترتا، ہم ترقی نہیں لیں گے اور چٹنی سے روٹی کھالیں گے۔ وہ چالیس چور جو ملک سے باہر غاروں میں لوٹا ہوا خزانہ ڈال آئے ہیں ان کی حب الوطنی کے دروازے پر بھی دستک دی جائے کہ ملک بہت خطرے میں ہے۔ وہ علی بابا بن کر قوم و وطن کو اس کا مال لوٹا دیں!

مجھے معلوم ہے کہ اتنی عظیم قربانیوں پر کوئی آمادہ نہیں ہوگا۔ اس لئے میں موجود نسل کے ان بچوں سے اپیل کروں گا کہ جنہیں ہم نے پاپ ڈانس کے سپرد کر دیا ہے، اپنے بڑوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر التجا کریں "بزرگو! اگر آپ کے یہی اللے تللے رہے تو ہماری نسل تک پہنچتے پہنچتے پاکستان کا نام پاکستان نہیں رہے گا بلکہ قرضستان ہو جائے گا۔" ایک اور لطیف سنا کر کالم کا اختتام کرتا ہوں۔

ایک پٹھان اپنے قرض خواہ سے قرضہ وصول کرنے آیا، تو اسے معلوم ہوا کہ وہ بیچارہ تو اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔ پٹھان نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "خوچہ وہ تو ہمارا جگری دوست تھا، ہم اس کا ختم دلوائے گا۔" اس نے چاولوں کی ایک دیگ پکوائی اور کہا کہ چاول وہ بانٹے جو اس کا وارث ہو۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کڑچھا ہاتھ میں لیا تو پٹھان نے اسے بازو سے پکڑ کر کہا "خوچہ! اب تم اس کا قرضہ بھی ادا کرے گا۔"

27 جولائی 2001

جمہوریت اور پاکستان

نا معلوم کیا وجہ ہے کہ ذاتی طور پر مجھے جمہوریت سے بہت محبت ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے اسے کبھی مقدس جانا' نہ اسے جزو ایمان بنایا۔ چنانچہ جیسی جیسی جمہوریت مل گئی اس پر قناعت کر لی۔ میرا نقطہ نظر رہا ہے کہ حکومت وہی بہتر ہوتی ہے جو ''اچھی'' ہو' ملک میں امن و امان قائم رکھے' اس کی بنیاد عدل و انصاف پر ہو اور ہر عام و خاص کو برابر کے بنیادی حقوق حاصل ہوں۔ مجھے اسلامی نظام عدل ہی ان تمام اچھائیوں کا حامل و موید نظر آتا ہے۔ ہم نصف صدی سے جس طرز جمہوریت کے خوگر ہونے کی کوشش میں مصروف ہیں' وہ ابھی تک ہماری جلد سے نیچے نہیں اتری یعنی جسم و جان کا حصہ نہیں بنی۔ میں برملا کہنے پر مجبور ہوں کہ ابھی تک پاکستان میں یہ طرز جمہوریت کامیاب نہیں ہو سکی لیکن ہم عوام نے اسے دل میں جگہ دے رکھی ہے۔ ہماری امید بہار قائم ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے جمہور اور جمہوریت کے موضوع پر جتنے اشعار (اردو فارسی) لکھے ہیں' میں نے انہیں ایک جگہ لکھ کر کئی بار پڑھا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو ''جمہور'' کے جذباتی فیصلوں پر بھی اعتبار نہیں تھا۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا!
طریق کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

مغربی جمہوریت کو وہ ''دیو استبداد'' کہتے ہیں جس نے جمہوری قبا اوڑھ لی ہے۔ اسے انہوں نے سرمایہ داروں کی جنگ زرگری' چنگیزی' قلب و نظر کی رنجوری اور جمہوری لباس میں شاہی کا نام دیا ہے۔

اسے ایک ''تماشا'' کہا ہے۔ اس کا چہرہ روشن اور اس کا اندرون چنگیز سے بھی تاریک تر ہے۔ جس نظام میں بندوں کو گنا کرتے ہیں' تولا نہیں کرتے' اس میں غلام پختہ کار ہونا بہتر ہے۔

اس کے باوجود علامہ '' نے جس خطہ اسلامی کا خواب دیکھا تھا' اس کے نظام حکومت میں اسلامی

جمہوریت کے قیام کے موید نظر آتے ہیں ورنہ انہیں قائداعظمؒ جیسے جمہوریت پسند لیڈر میں قومی نجات کے آثار نظر نہ آتے۔ وہ نطشے کی طرح ایک مرد کامل کے منتظر تھے اور قائداعظمؒ میں انہیں مرد مومن کی بہت سی صفات نظر آئیں۔

قائداعظمؒ کی جمہوریت پسندی میں کس کو شک ہو سکتا ہے؟ وہ تو اس بات پر نازاں تھے کہ اسلام ایک جمہوریت پسند دین ہے چونکہ برصغیر میں انگریز نے اپنے ہاں کی پارلیمانی جمہوریت کی اشاعت و ترویج کی کوشش کی تھی اور قائداعظمؒ کو اس کا تجربہ حاصل تھا' اس لئے وہ اسی طرز کی جمہوریت کو رائج اور مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ قائد ملت لیاقت علی خان کے بعد طالع آزمالوگوں نے جمہوریت کو بازیچہ اطفال بنالیا۔ حکمرانوں میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو حصول پاکستان میں شریک سفر نہ تھے۔ سرفیروز خان نون جیسے انگریز پرست اور ڈاکٹر خان صاحب جیسے کانگریس پرست پاکستان کی وزارت عظمیٰ پر فائز نظر آئے۔

اس جمہوریت نے عام آدمی کا کوئی بھلا نہ کیا اور خاص آدمی نے بھی اسے قبول نہ کیا۔ پاکستان کے دانشوروں میں فکری اعتبار سے دو گروہ وجود میں آ گئے۔ ترقی پسند اور اسلام پسند۔ میرے نزدیک دونوں جمہوریت کے حامی نہیں تھے۔ دونوں کسی لطیفہ غیبی کے منتظر تھے کہ موقع ملے تو پاکستان پر قبضہ کر لیں کیونکہ ووٹ بنک ان کے پاس نہیں تھا اور میرا خیال ہے کہ اب بھی نہیں۔ فکری و نظری اعتبار سے البتہ ایک خاص طبقے کے سیاسی شعور میں ایک دو عملی سی پیدا ہو گئی۔ یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ 1973ء کا آئین وجود میں آ گیا اگر اس پر پورا عمل کیا جاتا تو مجھے امید تھی کہ جمہوریت کی یہاں جڑ لگ جاتی۔

جمہوریت کی جو تعبیریں کی جا رہی ہیں' انہوں نے مجھ جیسے ایک سیدھے سادے پاکستانی کو خلفشار میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہنوز روز اول ہے جب پاکستان وجود میں آیا تھا' میرا ذہن صاف تھا۔ میں ایک عادلانہ جمہوری نظام کا خواب دیکھ رہا تھا بلکہ اس پر اعتقاد بھی رکھتا تھا۔ میں سکولوں اور کالجوں میں پڑھاتا رہا ہوں۔ میں نے اساتذہ اور طلبا کو فکری اعتبار سے بٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ کئی جارحانہ گروپ وجود میں آ گئے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سیاسی قتل ہونے لگے اور یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کیوں؟

افسوس کہ قائداعظم کے بعد پاکستان کو جتنے بھی جمہوری قائد ملے' وہ قد کاٹھ کے اعتبار سے بہت چھوٹے تھے۔ وہ نہ پاکستان سے وابستہ تھے' نہ جمہوریت سے۔ فوجی حکومتوں کو سیاست

دانوں نے خود اپنے آپ پر مسلط کیا جب بھی کوئی جمہوری حکومت قائم ہوتی، کچھ لیڈر بوٹوں کی چاپ سننے لگتے، کچھ "بھٹو ہٹاؤ نواز شریف ہٹاؤ" کی تحریک کا آغاز کر دیتے۔ اگر سیاسی لیڈر "بھٹو ہٹاؤ" تحریک کو کامیاب نہ کرتے تو لنگڑی لولی جمہوریت چلتی رہتی۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کی فوجی حکومت کو سیاست دانوں کی پوری پوری تائید حاصل تھی چنانچہ گیارہ سال تک اسے ہٹانے کی کوئی تحریک وجود میں نہ آسکی۔ جب جونیجو مرحوم برطرف ہوئے تھے، میں نے تو کسی بہت بڑے احتجاج کی آواز نہیں سنی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کو بھی تختہ دار سے بچانے کے لئے بہت کم آوازیں بلند ہوئی تھیں۔ اس میں ان لیڈروں کی قطعی طور پر کوئی آواز شامل نہیں تھی جو تحریک سازی کے ماہر ہیں۔

اب جس متبادل جمہوریت کی بنیاد رکھی جا رہی ہے، وہ کوئی نئی چیز نہیں اور جنرل ایوب خان مرحوم اس کا تجربہ کر چکے ہیں۔ اس جمہوری نظام کو یکسر رد کرنا پڑا تھا۔ موجودہ جمہوری نظام کے لئے بھی ووٹر کو صحیح طور پر تیار نہیں کیا جا رہا۔ مجھے امید نہیں کہ بلدیاتی نظام نو کے قائم ہونے کے بعد اس کی سیاسی تربیت کا ہر مرحلہ طے ہو چکا ہوگا۔

چنانچہ ضروری ہے کہ جو جمہوریت یہاں چل رہی تھی، اسی کے مطابق باقی انتخابات کروائے جائیں۔ اس طرح بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ مزید کسی نئے تجربے کا خطرہ مول لینے سے بہتر ہے کہ پرانے نظام کی اصلاح کی جائے ممکن ہے کہ قائداعظمؒ کے بعد کوئی قائد ثانی آجائے!

3/اپریل 2001ء

چلو نور پور کلاں چلیں

ایک عرصے سے میں نور پور کلاں نہیں گیا حالانکہ ان دنوں مجھے وہاں ضرور جانا چاہیے کیونکہ اگلے مرحلے میں واں بلدیاتی الیکشن ہونے والا ہے۔ وقتاً فوقتاً اطلاعات ملتی رہی ہیں۔ ان سے معلوم ہوا ہے کہ چاچا بوٹے نے الیکشن نہ لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ اپنی نئی نسل کو موقع دینا اور خود بادشاہ گر کا کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔ لوگ اصرار کر رہے ہیں کہ وہ خواتین کی سیٹ پر چاچی کو ضرور کھڑا کرے۔ چاچا کہتا ہے اسے بیٹھا ہی رہنے دیں۔ ایک بار کھڑی ہوگئی تو پھر کبھی نہیں بیٹھے گی اور مجھے ہمیشہ کے لئے بٹھا دے گی۔ ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ چاچا نے چاچی کو الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی ہے۔

نور پور یونین کونسل کے ناظم کے لئے بابو کرم دین سائیکل والا ایک مدت سے امیدوار ہے۔ حیران کن خبر یہ ہے کہ نائب ناظم کے لئے مخالف پارٹی کے شیخ منظور اللہ کی حمایت کی جا رہی ہے۔ وہ گاؤں کے واحد دکاندار شیخ برکت اللہ کا بھانجا ہے اور ایف اے پاس ہے۔ کہتے ہیں کہ سیاست میں کوئی بات آخری نہیں ہوتی۔ بابو کرم دین سائیکل واال بلاشبہ ایک منجھا ہوا سیاست دان ہے جو یونین کونسل سے مرکزی اسمبلی تک کا ہر الیکشن لڑ کر ضمانتیں ضبط کروا چکا ہے۔ اور شیخ منظور نا تجربہ کار نوجوان ہے اور سیاست میں نو وارد ہے لیکن اس کے پاس سرمایہ ہے تجربے اور سرمائے کا یہ حسین سنجوگ انشا اللہ رنگ لائے گا سرمایہ ہو تو تجربہ نہیں ہوتا تجربہ ہو تو سرمایہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ عام طور پر یہی ہوتا رہا ہے کہ تجربہ بغیر سرمائے کے ہمیشہ ضمانت ضبط کرواتا ہے۔ مجھے امید واثق ہے کہ ان الیکشنوں میں ایسا نہیں ہوگا۔ تاہم احتیاط لازمی تھی چنانچہ ایک خط لکھ کر میں نے چاچا بوٹے کو اس کی سیاسی فراست کی داد دی ہے۔

شیخ منظور کا نور پور کلاں میں ''ماماں بھانجا سپر سٹورر'' چل رہا ہے۔ لیکن سرپٹ نہیں دوڑ رہا۔ اس لئے الیکشن پر جو خرچ ہوگا وہ شیخ برکت کا ہوگا۔ چاچا بوٹا خوش ہے کہ شیخ برکت نے لہو چوس چوس کر جو سرمایہ جمع کیا ہے اس میں سے کچھ تو نور پور کلاں کو لوٹے گا۔ شیخ منظور کے سارے ورکر نوجوان ہیں۔ اس طبقے میں اس کا خاصا رسوخ ہے اور وہ انہیں خوش بھی بہت رکھتا ہے

ان میں سے کچھ کو ووٹ دینے کا حق بھی مل گیا ہے۔ یونین کونسل میں جو دوسرے گاؤں ہیں، وہاں کے نوجوانوں میں بھی اس کا سرمایہ بڑی تیزی سے اثر ونفوذ کر رہا ہے۔ شیخ برکت کی دکان کے تھڑے پر ایک کے بجائے تین بنچ بچھ گئے ہیں اور اس بہانے اس نے گلی میں تھوڑا سا اور تجاوز کر لیا ہے۔ بنچوں پر شیخ منظور کے کارکن بیٹھ کر سیاسی گپ شپ اڑاتے ہیں۔ کوکا اور پیپسی کولا کے کاگ بھی اڑ جاتا ہے تاہم وہ دل کو تسلی دے لیتا ہے کہ میرا بھانجا منظور نائب ناظم ہو گیا۔ تو انشااللہ اس بے جا خرچ کی نہ صرف تلافی ہوگی بلکہ سرمائے میں اضافہ بھی ہوگا ممکن ہے کہ کبھی وہ بنک سے قرض سے کر ایک چھوٹی موٹی فیکٹری لگا لے لیکن اسے معلوم ہونا چاہئے کہ نئے بلدیاتی نظام کے قائم ہونے کے بعد ایسا خواب بھی دیکھنا جرم ہوگا۔

دونوں امیدواروں نے گاؤں والوں سے کچھ وعدے وعید بھی کئے ہیں۔ بابو کرم دین سائیکل والے نے وعدہ کیا ہے کہ وہ گاؤں کے دونوں پرائمری سکولوں کو مڈل کا درجہ دلا کر دم لے گا۔ جہاں تک اس کا سائیکل جائے گا۔ وہاں تک سائیکل پر پہنچے گا ورنہ یونین کونسل سے قرارداد منظور کرائے گا کہ اسے موٹر سائیکل خرید دیا جائے۔ (اگرچہ اب اس کی عمر موٹر سائیکل چلانے کی نہیں بلکہ کار پر بیٹھنے کی ہے) شیخ منظور نے وعدہ کیا ہے کہ وہ فوری طور پر پرائمری سکولوں کی عمارتوں کی ضرور مرمت کروا دے گا۔ اس نے یہ حامی بھی بھر لی ہے کہ وہ بابو کرم دین کی موٹر سائیکل کی ڈرائیوری بھی کرے گا۔

مخالف گروپ بھی موجود ہے اگرچہ زیادہ دکھائی نہیں دے رہا۔ اس کی پشت پر سابق ایم این اے حاجی مولا جٹ کا ہاتھ ہے جو جیل کی بی کلاس میں بیٹھ کر الیکشن کی ڈائریکشن کر رہا ہے گاؤں میں اس گروپ کی قیادت چودھری لال دین نمبردار کے ہاتھ میں ہے۔ جس کی نمبرداری اس کی قدیمی حویلی کی طرح بہت شکستہ اور دیمک خوردہ ہو چکی ہے۔ اسے ابھی تک ناظم اور نائب ناظم کے عہدوں کا الیکشن لڑنے کے لئے میٹرک پاس امیدوار نہیں ملے۔ چاچی کے مقابلے میں وہ اپنی بیوی کو کھڑا کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے گھٹنوں میں اتنا شدید درد اٹھتا ہے کہ وہ اٹھ بھی نہیں سکتی۔ مزید براں کلمہ بھی بھول گئی ہے چاچی سمجھتی ہے۔ ''میں نے تو بی بی ملانی سے پنج سورہ پڑھا ہوا ہے اور اس کی زبان پر تو کلمہ بھی نہیں چڑھا تھا۔ اس کے کاغذ کیسے منظور ہوں گے''؟ دیہات کی بڑھی بوڑھیوں کی زبان میں ''کاغذ'' سے مراد طلاق نامہ ہی ہوتا ہے لیکن چاچی اب اتنی تعلیم یافتہ ہو گئی ہے کہ وہ کاغذات نامزدگی کے معنوں سے آگاہ ہے۔ چاچا بوٹے کو نیلے' پیلے' خاکی اور گلابی بیلٹ

پیپروں سے کچھ تشویش ہے کہ ایک ہی وقت میں اتنی پرچیوں پر نشان لگاتے وقت کون دیہاتی ہے۔ جو اپنے ہوش و حواس برقرار رکھ سکے گا۔ دیہاتی افسر کے سامنے یوں بھی بوکھلا ہی جاتا ہے اور الیکشن بوتھ میں جو بھی ہوگا وہ افسر ہوگا خواہ وہ ان کے اپنے پرائمری سکول کا اول مدرس ماسٹر اللہ دتا زخمی ہی کیوں نہ ہوگا۔ پریذائیڈنگ آفیسر تو واقعی کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا افسر ہی ہوتا ہے اور اسے نظام سقہ کی طرح مجسٹریٹ درجہ سوم کے اختیار بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اگرچہ استعمال کرنے کی جرات کم ہی لوگ کرتے ہیں۔ میرے ایک دوسرے نے ایک الیکشن میں یہ جرات کر لی اور اس کا خمیازہ یہ بھگتنا پڑا کہ اسے اپنے عملے سمیت پولنگ سٹیشن میں محصور رہنا پڑا تا آنکہ پولیس نے محاصرہ نہ توڑا۔ اس دوران میں مجرم فرار ہو چکا تھا۔ میرے دوست کہتے تھے کہ سارا ڈرامہ پولیس نے رچایا تھا۔ یہ واقعہ سنانے سے میرا مقصد یہ ہے کہ افسر کا پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کب افسری پر اتر آئے۔ چنانچہ ووٹر بوکھلا کر کبھی اسے دایاں انگوٹھا دکھاتا ہے کبھی بایاں ایک الیکشن میں میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔

چنانچہ امیدواروں نے گاؤں کے کچھ پڑھے لکھے لڑکوں اور لڑکیوں کو تربیت دی ہے کہ وہ گھر گھر جا کر ووٹروں کو پرچی پر نشان لگانے کی تربیت دیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ پرائمری پاس لڑکے اور لڑکیاں جنہیں تا حال ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں ہوا ان ووٹروں کی نسبت کہیں زیادہ ذہین ہیں جن کی ذہانت کا ٹیسٹ پولنگ الیکشن پر لیا جاتا ہے معلوم ہوا ہے کہ ابھی تک چاچی کا آئی کیو بھی اونچا نہیں ہوا۔ وہ جو (میئر) بننے جا رہی ہے ممکن ہے کہ اس کا اپنا ہی ووٹ مسترد ہو جائے جیسا کہ صدر کے چناؤ پر کئی ایم این اے اور ایم پی اے حضرات کا ووٹ مسترد ہو جایا کرتا تھا۔

چاچا بوٹا یونین کونسل کے دیہات میں جس گھر میں ووٹ لینے جاتا ہے وہاں چاچی کو بھی ساتھ لے کر جاتا ہے۔ حکومت اسے جداگانہ انتخاب کہتی ہے۔ لیکن چاچا بوٹا کے نزدیک ہر الیکشن مخلوط تعلیم کی طرح مخلوط ہی ہوتا ہے کیونکہ عورتیں مردوں کو ووٹ دیتی ہیں اور مرد عورتوں کو۔ مشہور ہے کہ مرد اور عورت شانہ بشانہ چلیں تو ملک ترقی کرے گا۔ اسی لئے چاچا اور چاچی اس کا عملی مظاہرہ کر رہے ہیں۔ افسوس کہ میں نور پور کلاں نہ جا سکوں گا۔ حالانکہ مجھے وہاں ضرور جانا چاہئے تا کہ ووٹ ڈالنے کی تربیت حاصل ہو جاتی اور میں صحیح ووٹ ڈال سکتا۔ اصل میں افسری کا خوف ہر پاکستانی کی طرح میرا بھی آر کی ٹائپل خوف بن چکا ہے۔

16 اپریل 2001ء

ٹاٹ سے ڈیسک تک

جب سے یہ خبر پڑھی ہے کہ حکومت پرائمری سکولوں میں انگریزی کولازمی مضمون کی حیثیت دینا چاہتی ہے، میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی!

اس انقلابی اقدام سے امیر اور غریب کا فرق یکدم مٹ جائے گا یعنی لاہور کی کارپوریشن کے پرائمری سکول ایچی سن سکول کو آئینہ دکھایا کریں گے۔ چچوں کی ملیاں کا پرائمری سکول کسی بیکن سکول کا نمونہ پیش کرے گا۔ بچے دھول سے اٹے ہوئے ٹاٹ سے اٹھ کر صاف ستھرے ڈیسکوں پر بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے۔ اگرچہ امیر اور غریب کے درمیان معاشی مساوات تو پیدا نہیں کی جاسکتی تاہم نفسیاتی اعتبار سے امیر وغریب کا امتیاز یکسر مٹ جائے گا۔ علامہ اقبالؒ کے پاکستان میں غریب بھی اپنی ''خودی'' کو پہچان لے گا۔

امیر اور غریب کی تفریق ہم گزشتہ ترپین سال سے مٹاتے چلے آرہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ امیر امیر تر ہو رہا ہے اور غریب غریب تر۔ کئی بار ہم نے زرعی اصلاحات نافذ کیں ٹیلی ویژن کی سکرین پر ہم نے کئی بار دیکھا کہ بے زمین مزارعین کو زمین کی رجسٹریاں دی جارہی ہیں آج کل پیکج دینے کا رواج ہے یہ پیکج بھی بہت پراسرار ہوتے ہیں کہ جب تک سربمہر رہیں تو بہت اچھے لگتے ہیں۔ جب کھلتے ہیں تو لفافہ اندر سے خالی ہوتا ہے۔ چنانچہ اب پیکج کو کھولا ہی نہیں جاتا۔ پنڈورا باکس کھولنے کا فائدہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ عوام کی توقعات آسمان تک پہنچا کر دھڑام سے زمین پر گرادی جائیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایسے ہی چند پیکج اور دیئے گئے جیسا ابھی مزدوروں کو دیا گیا ہے تو پاکستان کی قسمت بدل جائے گی۔ پاکستان یک لخت خوشحال ہو جائے گا۔ جس ملک میں قرضہ ملنے پر خوشی سے بغلیں بجائی جائیں وہاں خوشحالی تو ضرور آئے گی۔ کیا موٹروے کی صورت میں خوشحالی کی ایک شاندار مثال ہمارے سامنے موجود نہیں؟ عوام کی خوشحالی میں واقعی اضافہ ہوگیا ہے کہ لاہور کے بڑے بڑے چوکوں پر صبح صبح مزدور جمع ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دن کی روزی مل جائے۔

جنہیں دہاڑی نہیں ملتی وہ خوشی سے نعرہ لگاتے ہیں کہ چلئے آج چھٹی منائیں گے اور لنگوٹی میں پھاگ کھیلیں گے۔ ان بے روزگار مزدوروں کو منگلا ڈیم کی صفائی پر لگا دیا جائے تو دنوں میں اس کی ''سلٹ'' صاف کر دیں ورنہ کوئی سیاستدان عقلمندی سے کام لے تو ہر روز لاہور کے ہر چوک سے ایک بڑا جلوس نکال سکتا ہے۔

ان غریب کسانوں اور مزدوروں کو مژدہ دیا جا رہا ہے کہ ان کے بچے اب پرائمری سکولوں میں انگریزی پڑھیں گے اور فر فر انگریزی بولتے ہوئے امیروں کے بچوں کی ہمسری کرنے لگیں گے۔

پنجابی والوں کا ایک دیرینہ مطالبہ ہے کہ پرائمری سکولوں میں ''پنجابی'' کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہئے۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ اس کی تعلیم بھی پہلی جماعت سے ہو رہی ہے اور عربی تو ہماری دینی زبان ہے ہی تو گویا ہمیں غریبوں کے پرائمری سکولوں میں اب انگریزی سمیت چار زبانیں پڑھانا ہوں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ غریب کا بچہ اپنی ماں بولی بھی بھول جائے گا۔

اگر انگریزی کو پرائمری سطح پر لازمی قرار دینا ضروری ہے تو اس کے لئے بہت سے لوازمات درکار ہیں۔ سب سے پہلے تو ہر پرائمری سکول کی عمارت کو انگریزی کے شایان شان بنانا ہوگا۔ اس کے لئے کسی ماڈرن پبلک سکول کی عمارت کو نمونہ بنانا ہوگا۔ ہیڈ ماسٹر کے لئے دفتر اور اساتذہ کے لئے سٹاف روم میں تعمیر کرنا ہوں گے۔ سکول کے کشادہ صحن میں درخت بھی ہوں گے اور گھاس کے تختے بھی، کھیل کا میدان بھی ہوگا، لائبریری بھی ہوگی اور جمنازیم بھی۔ تیراکی سکھانے کے لئے تالاب بھی بنانا ہوگا اور کون ہے جو نہیں جانتا کہ انگریزی ٹاٹ پر بیٹھ کر نہیں پڑھی جا سکتی۔ ہر کمرے میں ڈیسک اور کرسیاں لگانی پڑیں گی۔ اور استاد کو بھی معقول تنخواہ دینی ہوگی کہ وہ انگریزی کے آداب کے مطابق ڈھنگ کا لباس پہن کر آئے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی تہبند یا شلوار قمیض میں تو نہیں پڑھائی جا سکتی۔

موجودہ نظام تعلیم میں عکاسی عوامی سکولوں میں انگریزی چھٹی جماعت سے شرع ہوتی ہے۔ طالب علم کو بہت خوشی ہوتی ہے کہ اب ٹاٹ سے اٹھ کر ڈیسک پر جا بیٹھوں گا۔ اگر سروے کیا جائے تو تعلیمی ترقی کے اس دور زریں میں بھی عوامی سیکنڈری سکولوں میں خواہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی ہر کلاس کو کمرہ نہیں ملتا۔ کوئی کلاس برآمدے میں لگتی ہے اور کوئی سکول کے لان میں کسی درخت کے نیچے جہاں ٹاٹ ہی بچھتے ہیں۔ چھاؤں سمٹتی ہے تو ٹاٹ بھی سمیٹ لئے جاتے ہیں۔

جناب منظور احمد وٹو کے دورِ وزارت میں تعلیم کے ایک صوبائی وزیر نے تجربے کے طور پر کچھ پرائمری سکولوں میں انگریزی رائج کی تھی اور ڈیسک بھی لگوائے تھے۔ تحقیق کروائی جاسکتی ہے کہ اس تحریک کا کیا حشر ہوا۔ یہ تو یقینی ہے کہ ڈیسک ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں اور طلبا پھر بوریا نشین ہو گئے ہیں۔

ڈیسکوں کے علاوہ ضروری ہے کہ بچے یونیفارم میں سکول آئیں۔ میرے علاقے میں ایک ماڈرن پبلک سکول ہے۔ وہاں کے بچوں کو یونیفارم میں دیکھیں تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ اتنے صاف ستھرے یونیفارم اور اتنے تروتازہ چہرے کہ معلوم ہوتا ہے ہم بیسویں صدی سے اکیسویں صدی میں پہنچ چکے ہیں۔ اسی علاقے میں کچھ اور بھی پبلک سکول ہیں۔ جہاں بچے یونیفارم میں آتے ہیں کوئی کوئی یونیفارم استری شدہ بھی ہوتا ہے۔ یونہی معلوم ہوتا ہے کہ بس یونیفارم کا تکلف ہی کیا گیا ہے۔ مجھے یہ پبلک سکول اور ان میں پڑھنے والے بچے اصل پبلک سکولوں کی نقل ہی معلوم ہوتے ہیں یعنی تحریف (پیروڈی) یہ بچے ہماشما کے چشم و چراغ ہیں کہ والدین اپنا پیٹ کاٹ کر لشٹم پشٹم ان کی فیسیں تو ادا کر دیتے ہیں لیکن انہیں پوری آب و تاب نہیں بخش سکتے۔ وہ یہ سارا دکھ اس لئے اٹھاتے ہیں کہ انہیں پہلی جماعت سے انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ میں نے ان سکولوں کے بچوں کے منہ سے کبھی انگریزی کا کوئی جملہ نہیں سنا۔ ممکن ہے کہ ابا کو ڈیڈ اور امی کو ممی بنا دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اپنے استاد سے 'سر' کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں لیکن اپنی ترقی پذیر قوم کا بہت بڑا طبقہ مجھے ڈیسک تو کیا ٹاٹ پر بھی بیٹھا نظر نہیں آتا۔ وہ روزانہ گھر سے بوری کا کوئی ٹکڑا لے کر آتا ہے اور اسے احتیاط سے لپیٹ کر واپس لے جاتا ہے۔ انسے انگریزی تو کیا آئے گی۔ اردو بھی بھول جائے گی اور ممکن ہے ماں بولی بھی۔ ایک ریٹائرڈ استاد اور استادگر کا مشورہ آپ کو پسند آئے تو عرض کروں کہ اگر تعلیم میں انقلاب برپا کرنا ہے تو موجودہ نظام کو بہتر بنایئے۔ پورے ملک میں لازمی اور مفت ابتدائی تعلیم عام کیجئے۔ فرش پر ڈھنگ کے ٹاٹ بچھا دیئے اور سر پر چھت کا انتظام کیجئے کہ بچے گرمی سردی سے محفوظ رہیں۔ پرائمری سکولوں میں انگریزی کو لازمی قرار دینے سے کوئی انقلاب نہیں آئے گا صرف یہ ہوگا کہ غریب اور بے سہارا بے استطاعت بچے کے بستے میں ایک اور کتاب کا اضافہ ہو جائے گا۔

7 مئی 2001ء

بستی بسنا کھیل نہیں ہے؟

فانی بدایونی کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

دل کا اجڑنا سہل سہی' بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسانا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

واقعی بستی کا بسنا سہل نہیں' اجڑنا بہت سہل ہے۔ بستی کو بسانے کیلئے بہت خون پسینہ بہانا' چلچلاتی دھوپ اور کڑکڑاتے جاڑوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے لیکن بستی بسانے سے پہلے میلوں تک ہرے بھرے کھیت بھی اجاڑنے پڑتے ہیں۔ جہاں کبھی درختوں کا گھنا سایہ ہوتا تھا' وہاں کھمبے اگ آتے ہیں۔ سرسبز و شاداب فصلوں کی جگہ جھاڑ جھنکار نظر آتا ہے۔ بستی کے بسنے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اس دوران زرخیز زمین کی کوکھ سوکھ جاتی ہے' کوئی شگوفہ نہیں پھوٹتا' کوئی دانہ نہیں اگتا' کوئی درخت باقی نہیں رہتا کہ ہری بھری شاخوں پر بیٹھ کر پرندے چہچہائیں۔ گویا ایک ویرانی کا سماں ہوتا ہے۔ ایک بستی کو بسانے کیلئے کئی بستیاں اجاڑنی پڑتی ہیں کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔ بستی بسانے والے ظالم بھی بہت ہوتے ہیں کہ ایک عفریت کا روپ دھار لیتے ہیں کہ جو گاؤں کے گاؤں نگل جاتا ہے۔ وہ ایک عرصے عفریت کے منہ میں جانے سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور بچ نہیں سکتے حتیٰ کہ اپنی شناخت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ فیصل ٹاؤن اور جوہر ٹاؤن کے درمیان کبھی ایک گاؤں ہوتا تھا جسے ''کوٹھا پنڈ'' کہتے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دس بارہ سال کے اندر اندر اسے اپنی شناخت سے محروم ہوتے دیکھا ہے' اس کا نام موجود ہے لیکن اب نہ کوئی کوٹھا رہا ہے' نہ پنڈ۔

کتنے دل ہیں جو بستیوں کے بس جانے سے اجڑ جاتے ہیں۔ زمانہ غزل کے روایتی محبوب سے بھی زیادہ ظالم ہے۔ وہ نئی بستیوں کو آباد کرنے کیلئے پرانی بستیوں کو اجاڑ دیتا ہے۔ ایسے ہی نجانے کتنے گاؤں اور شہر ہیں جو وسیع و عریض بیراجوں اور ڈیموں میں ڈوب چکے ہیں اور ان کے ساتھ کتنے دل ہیں جن کے ارمان اور رومان ان میں غرق ہو چکے ہیں۔ کئی دیوانے اب

بھی ان کے کنارے بیٹھ کر اپنی یادوں کی بازیابی کی کوشش کرتے ہوں گے۔ بہر حال تعمیر و تخریب کا سلسلہ جاری ہے۔ ڈیم بھی بننے چاہئیں اور بستیاں بھی آباد ہونی چاہئیں لیکن جن زرخیز زمینوں کو اجاڑا جاتا ہے' ان کی جگہ بنجر زمینوں کو زرخیر بنانے کی ضرورت بھی ہے اور ان بنجر زمینوں پر نئی بستیاں بھی آباد ہونی چاہئیں لیکن ایسا ہو نہیں رہا۔

بستی بستے بستے بستی ہے۔ جب بس جاتی ہے تو اس کی سڑکوں کے کنارے درخت بھی اگ آتے ہیں۔ کہیں کہیں کسی پارک میں گھاس کا سبز فرش بھی بچھ جاتا ہے اور بہار کے موسم میں پھول بھی کھلتے ہیں اور کلیاں بھی چٹکتی ہیں۔ پرندے بھی درختوں پر واپس آ جاتے ہیں۔ سرِ شام خوبصورت عمارتوں میں قمقمے روشن ہو جاتے ہیں اور ٹیلیویژن سے نغمے بلند ہوتے ہیں۔ کھمبوں پر لگی ٹیوب لائٹیں بھی روشن ہو جاتی ہیں اور وہاں کا ہر سٹور سپر سٹور کہلاتا ہے۔ جہاں کوک پینے اور آئیس کریم کھانے کے لئے لڑکوں کا ہجوم بھی ہوتا ہے اور گراونڈ آباد ہو جاتے ہیں۔ مسجد سے لاوڈ سپیکر پر اذان بھی نشر ہونے لگتی ہے اور مسجد کے اندر نمازیوں میں یہ بحث و مباحثہ بھی شروع ہو جاتا ہے کہ کیا اذان سے پہلے درود شریف پڑھنا جائز ہے یا یہ ایک بدعت ہے اور آمین اونچی آواز میں کہنی چاہئے یا دھیمی آواز میں۔ گویا ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔

لیکن ابھی بستی کی تعمیر مکمل نہیں ہوتی کہ اس میں اجڑنے کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ گٹر ابل آتے ہیں' سڑکیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں' پارکوں میں دھول اڑنے لگتی ہے' درختوں کی دیکھ بھال نہیں ہوتی' کئی درخت کسی تعمیر کیلئے تخریب کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے درخت نہیں لگائے جاتے۔ بستی کے مکین سڑکوں پر تجاوزات کر لیتے ہیں' جو پلاٹ خالی رہ جاتے ہیں وہاں گندگی کے ڈھیر لگ جاتے ہیں اور پرندوں کی جگہ پلاسٹک کے لفافے اڑتے پھرتے ہیں۔ مکان اندر سے بہت صاف ہوتے ہیں' باہر کا ماحول نہایت ناصاف ہوتا ہے۔

میں جس بستی میں رہتا ہوں' وہ دو تہائی بس چکی ہے اور ابھی سے اس میں اجڑنے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ سڑکیں کھنڈر بنتی چلی جا رہی ہیں اور تجاوزات کی وجہ سے تنگ سے تنگ تر حالانکہ اس بستی کے سبھی مکین پڑھے لکھے ہیں۔ مزید برآں کسی نہ کسی بہانے سڑکوں کے کناروں کے درخت کٹ رہے ہیں۔ پارکوں میں گھاس کم اگنے لگا ہے۔ پھول کم کم ہی نظر آتے ہیں۔ گراونڈ میں گھاس سوکھ رہا ہے اور دھول اڑنے لگی ہے۔ میں کبھی گھاس کے جس سرسبز قطعے پر ایک سفیدے کے سائے میں بیٹھ کر افسانے اور کالم سوچتا تھا یا فرض کر لیتا تھا کہ غزل اس نے چھیڑی'

مجھے ساز دینا' ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا' وہ قطعہ سوکھ گیا ہے اور درخت بھی کٹ گیا ہے اور فانی کے شعر کی صداقت دل میں جاگزیں ہوگئی ہے۔ منفی اور سلبی صداقت ہی سہی لیکن صداقت تو ہے' تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ کہ بستی کو اجاڑنے کیلئے کوئی ظالم باہر سے نہیں آتا' وہ ظالم ہمارے اندر ہی بیٹھا ہوتا ہے۔

میں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے' وہ ان بستیوں کے متعلق ہے جو پکی بستیاں کہلاتی ہیں۔ کچھ بستیاں کچی بھی ہوتی ہیں جن پر شاید فانی کا شعر صادق نہیں آتا یا کچھ زیادہ ہی صادق آتا ہے۔ جس طرح تنکا تنکا جوڑ کر پرندہ آشیاں بناتا ہے' اسی طرح اینٹ اینٹ جوڑ کر آدمی ایسی بستیاں تعمیر کرتا ہے۔ جب وہ تعمیر ہو رہی ہوتی ہیں تو کسی کو نظر نہیں آتیں۔ جب تعمیر ہو چکتی ہیں تو ایک لمحے کیلئے نظر آتی ہیں اور دوسرے لمحے ملبے کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ خبر صرف اتنی چھپتی ہے کہ فلاں کچی بستی کو بلڈوز کر دیا گیا۔

یکم جون 2001ء

پروفیسر اشفاق علی خان......ایک سچا پاکستانی

مجھے پروفیسر اشفاق علی خان مرحوم کے ساتھ ایک عرصہ کام کرنے کا شرف حاصل رہا۔ وہ میرے پرنسپل تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرے دوست ہیں۔ وہ اپنے اور اساتذہ کے درمیان فاصلے رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ سنٹرل ٹریننگ کالج میں تقریباً ایک سال رہے۔ وہاں کی فضاء میں ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ وہ آئے تو یوں لگا جیسے تازہ ہوا کا ایک جھونکا وارد ہو گیا ہو۔ کالج میں جو روایتی نظام تقریباً پون صدی سے چل رہا تھا' اس میں انہوں نے کوئی اصلاح نہ کی البتہ انہوں نے اساتذہ اور طلباء کے زاویہ نگاہ میں کشادگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

سنٹرل ٹریننگ کالج کا سٹاف نہایت مختصر تھا۔ یہاں کی دیرینہ روایت تھی کہ تفریح کے پیریڈ میں اساتذہ سٹاف روم میں جمع ہوتے۔ پرنسپل صاحب بھی آتے۔ چائے کی پیالی پی جاتی اور دو دو بسکٹ کھائے جاتے (اپنے چندے پر) اور پرنسپل صاحبان تفریح کو بھی ایک درسی پیریڈ بنا لیتے جہاں اساتذہ کو انتظامی' انصرامی یا اصلاحی نصائح کی جاتیں۔

پروفیسر اشفاق علی خان مرحوم نے اسے ''گیٹ ٹو گیدر'' بنا دیا۔ گپ شپ میں چالیس پینتالیس منٹ گزر جاتے تو آدمی اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا۔ اشفاق علی خان کھلے ڈلے آدمی تھے۔ اتنی بے تکلفی سے بات چیت کرتے کہ معلوم ہوتا کہ سب اس میں شریک ہیں حالانکہ محفل میں زیادہ تر وہی بولتے۔ جب وہ نہ آتے تو پیریڈ سونا اور اداس سا محسوس ہوتا۔ ان کی گفتگو میں عالمانہ وسعت ہوتی تھی لیکن گرانباری نہیں۔ وہ انسان دوست تھے اور نہایت ہمدرد اور مخلص انسان تھے۔

اس پیریڈ میں انہوں نے کئی اچھے لوگوں سے ہماری ملاقات کرائی۔ صرف مسعود کھدر پوش یاد رہ گئے ہیں۔ وہ ایک باغی سے بیوروکریٹ تھے اور اپنے طبقے سے الگ تھلگ نظر آتے تھے۔ وہ انگریز کے خلاف تھے اور پاکستان میں بڑھتے ہوئے امریکی اثر و نفوذ سے خائف تھے۔

پروفیسر اشفاق علی خان اور ان میں یہی قدر مشترک تھی ورنہ اشفاق علی خاں پاکستانی بیوروکریسی کے کڑے ناقد تھے۔ ان کے دوسرے بیوروکریٹ دوست قدرت اللہ شہاب تھے لیکن افسوس کہ ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔

پروفیسر مرحوم اپنی گفتگو میں بیوروکریسی کا بہت مذاق اڑایا کرتے تھے۔ بیوروکریٹس کو وہ "ایگزالٹڈ کلارکس" کہتے تھے یعنی اونچے درجے کے کلرک، وہ اسی طبقے کو امریکی اثرونفوذ کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اقتصادیات ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ پاکستانی اقتصادیات پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ پاکستان ٹائمز میں ان کے جو مضمون چھپتے تھے، انہیں نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔ ہیوی انڈسٹری اور خاص طور پر سٹیل ملز کے قیام کے بہت بڑے حامی تھے۔ امریکہ اور یورپ کی صنعتی دنیا چاہتی ہے کہ ایشیا زراعت کرتا رہے اور اگر کوئی انڈسٹری یہاں قائم ہو تو وہ زراعت پر مبنی ہونی چاہیے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ایک من چاول برآمد کر کے اس کے بدلے میں ہم باہر سے ایک چھوٹا سا مشینی پرزہ درآمد کرتے ہیں جس کا وزن کسان کے بہائے ہوئے پسینے کے برابر بھی نہیں ہوتا۔

پروفیسر اشفاق علی خان ایک محبّ وطن پاکستانی تھے۔ ہر سال جی ایچ کیو میں حالات حاضرہ پر ایک نہایت پرمغز لیکچر دیتے تھے جو فصیح و بلیغ انگریزی کا ایک شاہکار ہوتا تھا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں ایک سال دو عیدیں ہوئی تھیں۔ انہی دنوں جی ایچ کیو میں ان کا لیکچر تھا۔ ان کا موضوع کچھ اور تھا لیکن چند حواریوں کی زبان سے پاکستانی ملا کی ہٹ دھرمی پر تنقید سن کر ان کا جذبہ ایمانی بیدار ہو گیا۔ انہوں نے مقالہ ایک طرف رکھا اور "ملا اور اسلام" پر فی البدیہہ تقریر شروع کر دی۔ سٹاف روم کی گیٹ ٹو گیدر میں انہوں نے پورا واقعہ سنایا۔ مجھے صرف اس کا خلاصہ یاد رہ گیا ہے۔ فرمایا کہ انگریز کا دور ہو یا انگریز پرستوں کا، ملا اسلام کا وہ سپاہی ہے جس نے اپنی وردی کبھی تبدیل نہیں کی۔ اس نے میز کرسی قبول نہ کی اور بوریا نشین رہا اور مسلمانوں کے دل پر حکومت کرتا رہا۔ کہتے تھے کہ اس محفل میں سبھی بڑے بڑے جرنیل موجود تھے اور وہ ان کے لیکچر سے کچھ خوش نہ ہوئے۔

اردو میں انہوں نے ایک طویل افسانہ "طمانچہ" کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے کتابچے کی صورت میں چھپا بھی تھا۔ جب یہ مسودے کی صورت میں تھا تو سٹاف روم کی ایک گیٹ ٹو گیدر میں انہوں نے پڑھ کر سنایا تھا۔ اس کا پلاٹ یہ ہے کہ تیسری دنیا کے کسی غریب ملک کو خوردونوش کی اشیاء پر مشتمل غیر ملکی امداد سے نوازا گیا۔ ایک سال تک یہ امداد اس

ملک کو ملتی رہی۔ پھر امداد بھیجنے والے ملک نے یہ دیکھنے کے لئے اپنی انسپکشن ٹیم بھیجی کہ اس کی امداد سے لوگوں کی صحت میں کتنا فرق آیا ہے۔ اول تو یہ امداد عام لوگوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ تھوڑی بہت پہنچی بھی تو عوام کے چہروں سے صدیوں کی بھوک کیسے مٹتی۔ اس ٹیم کو عام آدمیوں سے ملنے نہ دیا گیا۔ ملک کے سربراہ نے طمانچے مار مار کر اپنا چہرہ لال کر لیا اور اپنے وزیروں مشیروں سے کہا کہ وہ بھی منہ لال کر لیں۔ افسانہ سنا کر مجھ سے پوچھنے لگے ''مولانا! آپ بھی افسانہ لکھتے ہیں' اس افسانے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں نے جواب دیا '' سر! ایک نہایت اچھا علامتی افسانہ ہے لیکن اسے بیوروکریٹس کی محفل میں پڑھنا چاہئے تاکہ انہیں کچھ عبرت حاصل ہو۔''

وہ عام گفتگو پنجابی میں کراتے تھے لیکن مسعود کھدر پوش کی طرح انہوں نے پنجابی کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا تھا۔ تقریر عام طور پر اردو میں کرتے' سٹاف کی ایک گیٹ ٹو گیدر میں ایک سیکرٹری تعلیم عبداللطیف مرحوم مہمان خصوصی تھے اور بقول اشفاق علی خان انہیں اپنی انگریزی پر بہت ناز تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس دن پوری گفتگو نہایت فصیح و بلیغ انگریزی میں کی۔ سیکرٹری مرحوم بھی بلاشبہ بہت اچھی انگریزی بولتے تھے لیکن اشفاق علی خان کا کیا مقابلہ! وہ پہلے مسلمان تھے جنہیں پنجاب یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس فرسٹ کا اعزاز حاصل ہوا۔ وہ پطرس بخاری' پروفیسر سراج اور ڈاکٹر امداد حسین جیسے انگریزی کے اساتذہ کی صف میں شامل تھے لیکن صاحب بہادر قسم کے پروفیسر نہیں تھے۔

تعلیم و تعلم سے انہیں دلی رابطہ تھا۔ خود بھی اچھے استاد تھے اور اچھے استاد کی قدر بھی کرتے تھے۔ معاشرے میں استاد کا احترام پیدا کرنے کے موید تھے۔ استاد کے خلاف کوئی بات نہ سن سکتے تھے۔ ایک بار ایک اعلیٰ سطح کی محکمانہ میٹنگ میں ایک ڈویژن کے ڈائریکٹر ایجوکیشن نے اپنی تقریر میں کہا کہ اساتذہ فنڈز کھا جاتے ہیں اور خاص طور پر جب ٹورنامنٹ ہوتے ہیں تو پی ٹی آئی بہت گھپلے کرتے ہیں۔ اشفاق علی خان نے پوچھا '' کتنے بڑے گھپلے؟''

'' سو پچاس تو مار ہی لیتے ہوں گے۔''

'' جناب! جس معاشرے میں لوگوں کے اتنے بڑے بڑے معدے ہوں کہ پورا پاکستان ان میں سما جائے گا وہاں ایک پی ٹی آئی سو پچاس کھا بھی جائے تو کونسی قیامت آ جائے گی۔'' یہ واقعہ سنا کر کہنے لگے '' حال ہی میں مجھے اسلام آباد میں ایک بیوروکریٹ کے نو تعمیر شدہ

بنگلے میں مدعو ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے ان کا نہایت خوبصورت ڈرائینگ روم دیکھا کہ جس میں اتنے نوادرات سجے ہوئے ہیں کہ شاید ملکہ برطانیہ کے ڈرائینگ روم میں بھی نہ ہوں۔ یہ بیوروکریٹ حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔"

سنٹرل ٹریننگ کالج میں انہوں نے صرف ایک کانووکیشن کرائی۔ اس میں پروفیسر فضل احمد کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔ وہ اسی سال کالج سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انہوں نے عالمانہ خطبہ اردو میں پڑھا۔ یہ بھی ایک قسم کی روایت شکنی بھی۔ کانووکیشن کا مہمان خصوصی عام طور پر کسی بڑے آدمی کو بنایا جاتا ہے۔

سنٹرل ٹریننگ کالج سے وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں آ گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گورنمنٹ کالج میں تبدیل ہو کر آ گیا۔ گورنمنٹ کالج ایک بہت بڑا ادارہ ہے۔ یہاں ان سے ذاتی ملاقات کا بہت کم موقع ملا۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء تک کا زمانہ بھی کچھ سیاسی اکھاڑ بچھاڑ کا زمانہ تھا اور طلباء میں بھی جذباتی طور پر بغاوت کی ایک لہر پیدا ہو گئی تھی۔ جلوس عام نکلتے تھے' تاہم اشفاق علی خان نے اس زمانے میں بھی استبدادی رویہ اختیار نہ کیا۔ ان کا عوامی انداز نہ بدلا۔ یہ پیپلز پارٹی والا عوامی انداز نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے مخلص کارکن تھے۔ اس لئے یہ مصنوعی انداز نہ اپنا سکے۔ وہ پنجاب سروسز ٹریبونل بورڈ میں چلے گئے اور ان سے رابطہ یکسر منقطع ہو گیا۔ البتہ ان کے اخباری کالموں سے ان کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہا۔ ہر کالم ایک پر مغز مقالہ ہوتا تھا' خاص طور پر ان کا وہ کالم جو وہ امریکہ میں رہ کر لکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پاکستانیت سے بھی ماورا ہو کر پین اسلامزم کے مبلغ بن گئے ہیں۔ وہ مغربی معاشرے پر اسلام کے مبلغ بن گئے ہیں۔ وہ مغربی معاشرے پر اسلام کے اثر و نفوذ کی لہر کو صاف دیکھ رہے تھے۔ اسلام کی سربلندی کی نوید ان کے ہر کالم میں ہوتی تھی۔

ایسے نابغہ دہر کبھی کبھی جنم لیتے ہیں

7 جون 2001ء

نیا بجٹ......پرانا پنشنر

آج یعنی 19 جون 2001ء کو صبح صبح مجھے اپنے دوست میر عبدالقوی ضعیف کا فون ملا ہے۔انہوں نے فرمائش کی کہ میں ایک کالم لکھ کر وزیر خزانہ کا شکریہ ادا کر دوں کہ انہوں نے پرانے پنشنروں کو نئے پنشنروں کے برابر لانے کی کوشش تو کی ہے۔"اماں! ناشکری اللہ کو بھی پسند نہیں' اگر چہ اضافہ اتنا کم ہے کہ پرانا پنشنر نئے پنشنر کے برابر تو کیا قریب بھی نہیں پھٹک سکتا" میر صاحب نے کہا۔میر صاحب مجھ سے بھی سات آٹھ سال پہلے ریٹائر ہوئے تھے۔(میں 1983ء میں ریٹائر ہوا تھا) انہیں اتنی کم پنشن ملی تھی کہ ذرا غور کرنے پر نظر آتی تھی اور اب تو نظر بھی نہیں آتی۔

میر عبدالقوی اپنے نام کے برعکس عبدالضعیف کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں، جبھی تو وہ اتنی چھوٹی سی پنشن پر گزارہ کر لیتے ہیں۔میں نے ان کا تخلص ضعیف رکھ دیا ہے۔انہیں معلوم نہیں۔ دھان پان سے آدمی تھے اور اب بھی ہیں۔اس پر مستزاد کہ پان کھاتے ہیں۔قد کچھ لمبا ہے لیکن دبلے پن کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی لمبا معلوم ہوتا ہے۔نہایت شستہ اردو بولتے ہیں لیکن اس میں نقاہت کا احساس ہوتا ہے۔جوانی میں بھی اور اب بھی۔ہوا کے جھونکے اور ہر نئے تعارف پر ان کی کمر دہری ہو جاتی ہے اور اب مستقلاً دہری ہو گئی ہے لیکن کبھی کبھی انہیں غصہ آ جائے تو راست بھی ہو جاتی ہے۔

آج سے کچھ دن پہلے انہوں نے فون پر پیک آلودہ غصے سے لرزتی آواز میں کہا تھا" اماں! خبروں میں یہ تو نشر ہوتا ہے کہ ملازمین کی تنخواہیں بڑھ رہی ہیں لیکن پنشنروں کا ذکر گول کر دیا جاتا ہے۔جناب چیف ایگزیکٹو صاحب کی زبان مبارک پر کسی انٹرویو کے دوران ایک بار بھی بیچارے پنشنر کا نام نہیں آیا"

"میرا ماتھا بھی ٹھنک رہا ہے میر صاحب! معلوم ہوتا ہے کہ اس بجٹ میں پنشنروں کو صرف نظر کر دیا جائے گا" میں نے کہا۔

"اماں! اگر ایسا ہوا تو میں پنشنروں کے صدر جناب عبدالغنی رومی صاحب سے کہوں گا

کہ وہ جلسے جلوس کی کال دے دیں۔ ہم اسمبلی ہال سے گورنر ہاؤس تک احتجاجی ما......ر......
چ......'' اور ان پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اصل میں غصہ گلوگیر ہو گیا تھا۔ تب میر صاحب کی بہو کی آواز آئی کہ انکل! ابو جی کھانس کھانس کر بے حال ہو گئے ہیں۔ اب وہ آپ سے مزید بات نہیں کر سکیں گے۔ یہ کہہ کر عزیزہ نے فون بند کر دیا۔ عین اس لمحے مجھ پر ایک کالم وارد ہو گیا۔ اس کا عنوان تھا ''پنشنروں کا جلوس'' اس کی پوری تفصیل میری آنکھوں کے سامنے یوں آئی جیسے کوئی کتاب کھل گئی ہو! ہاتھ بے چین ہو کر قلم اور کاغذ کی طرف بڑھنے لگا تو عقل نے کہا ''بجٹ کے اعلان کا انتظار تو کر لو'' عقل کی بات مان لی لیکن ایک کالم ضائع ہو گیا تاہم پنشن میں ساڑھے سات سو روپے اضافہ ہو گیا۔ اگر کھو گیا ایک کالم تو کیا غم! لیکن جی چاہتا ہے کہ پورے کا پورا کالم ہاتھ سے نہ جائے۔ چنانچہ اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے......

میر عبدالقوی ضعیف اتنے طیش میں تھے کہ جناب عبدالغنی رومی صاحب کو احتجاجی جلسے اور جلوس کی کال دینی پڑی۔ حکومت نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اس دن اسمبلی ہال کے لان میں ہانپتے کانپتے لاٹھیاں ٹیکتے کچھ پنشنر جمع ہو گئے اور جہاں جہاں سایہ تھا' وہاں سبز گھاس کے فرش پر بیٹھ گئے۔ کچھ اس دن دھوپ بھی بہت تیز تھی۔ ارد گرد کسی درخت پر کوئی چیل نظر نہ آئی۔ یقیناً انڈا چھوڑ گئی ہو گی۔ میر عبدالقوی واقعی قوی بن گئے تھے۔ انہوں نے ایسی جوش سے بھری تقریر کی کہ اکثر پنشنروں کا لہو کھول اٹھا۔ (چلو بھر لہو کھول بھی بہت جلد جاتا ہے) بہت سوں کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا۔ میں نے میر صاحب کے کان میں پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر سرگوشی کی ''میر صاحب! زیادہ اشتعال نہ دلائیں۔ کہیں کسی بوڑھے خون میں شرپسندی کی لہر نہ اٹھنے لگے۔'' چنانچہ میر صاحب کی تقریر میں بتدریج ضعف پیدا ہونے لگا اور پھر ایک مرد ضعیف سبزے پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے منہ میں چوانے کے لئے پانی بھی نہیں مل رہا تھا کہ نل شوں شو کر رہے تھے۔ بہرحال انہیں گرے پڑے پتوں کی ہوا دی گئی اور انہوں نے آنکھیں کھول کر پوچھا ''کیا ہم گورنر ہاؤس تک پہنچ گئے ہیں؟'' اس اثنا میں کچھ سپاہی بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ انچارج اے ایس آئی نے کہا ''بزرگو! کیوں اپنی جان کے لاگو' ہوئے ہو؟'' اس پر ضعیف صاحب نے ایک نہایت قومی نعرہ مارا ''پنشن بڑھاؤ یا عمر مکاؤ'' مطلب یہ ہے کہ ایسی عمر کا کیا فائدہ جو بھوک ننگ میں گزر رہی ہو۔ رومی صاحب نے کہا ''میر صاحب! جلوس پر پابندی ہے'' اس کا جواب اے ایس آئی نے دیا ''بزرگو! آپ کے جلوس پر کوئی پابندی نہیں۔ آپ میں سے کوئی بھی نواب زادہ نصراللہ خان نہیں تاہم ذرا ٹھہریے۔ میں

ایدھی فاؤنڈیشن کو فون کر کے آپ کیلئے ایمبولنس منگوالوں"

"ایمبولنس؟" میر صاحب نے حیران ہو کر پوچھا

"بزرگو! مجھے امید نہیں کہ آپ میں سے کوئی بزرگ اپنے پاؤں پر گورنر ہاؤس پہنچ سکے۔ اس طرح آپ کو ٹرانسپورٹ تو مل جائے گی۔"

ٹرانسپورٹ کے لفظ پر میں کھلکھلا کر ہنسا تو میرے پہلو میں کھڑے میرے بیٹے نصیر عباس نقوی نے پوچھا "ابا جی! کوئی لطیفہ ہو گیا؟"

میں نے کہا "شکر ہے، پنشن میں اضافہ ہو گیا ورنہ مولانا ایدھی کی ایمبولنس میں گورنر ہاؤس تک پہنچنا پڑتا" وہ کچھ حیران ہوئے، پھر انہوں نے پوچھا "ابا جی! آپ نے ابھی تک اخبار نہیں پڑھا؟"

میں نے جواب دیا "نہیں تو"

"آپ کو یہ سن کر مایوسی ہو گی کہ آپ کی پنشن میں اضافہ یکم دسمبر 2001ء سے ہو گا۔ یوں اگر اجازت دیں تو یکم جولائی سے تیس نومبر تک ہر ماہ اضافے کی رقم میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیا کروں"، نصیر عباس نے ہنس کر کہا "اس سے مایوسی کی تلخی میں کچھ تو کمی واقع ہو جائے گی"

نصیر عباس کی پیشکش پر غور کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ آواز آئی "اماں! ہمارے ساتھ اس صدی کا سب سے بڑا مذاق ہوا ہے۔ میں دھوکا نہیں کہوں گا کہ مذاق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ وزیر خزانہ صاحب کی تقریر سے تو یہی معلوم ہو رہا تھا کہ اضافہ یکم جولائی سے ہو گا"

میں نے کہا "میر صاحب! میں اور آپ دونوں آلہ سماعت استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے یکم دسمبر کو یکم جولائی سمجھا۔ آلہ سماعت تو اکثر دھوکا دے جاتا ہے"

میر صاحب بولے "اماں! اب تو میں جناب عبدالغنی رومی صاحب سے بااصرار کہوں گا کہ وہ جلسے جلسوں کی کال دے دیں۔ فی الحال آپ جو کالم لکھیں، اس میں شکریہ یکم دسمبر تک ملتوی کر دیں۔ بشرط صحت زندگی"۔

28 جون 2001ء

نظام تعلیم میں استاد کا مقام

اس میں کچھ شک نہیں کہ نظام تعلیم مشرقی ہو یا مغربی اس میں استاد محور کی حیثیت رکھتا ہے۔ نظام تعلیم میں کتاب، تختی پنسل، سلیٹ اور سلیٹی کی بھی اہمیت ہے اور ٹاٹ اور ڈیسک کی بھی۔ سر پر اگر چھت ہو تو فبہا، نہیں تو کسی برگد کی چھاؤں میں بھی مکتب لگ سکتا ہے۔ ٹاٹ بھی نہ ہو تو فرش سبزہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ تاہم آج کے زمانے میں ظاہری شان و شوکت نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ جتنی اونچی عمارت ہو گی اتنا ہی وہ ادارہ اونچا نظر آئے گا۔ جو اس کے اندر قائم ہے۔ لیکن یہ ایک بدیہی امر ہے کہ یہ سب کچھ استاد کے بغیر بے کار ہے۔

کبھی استاد کا درجہ مدرسے اور مکتب کی عمارت سے زیادہ بلند تھا۔ مدرسہ و مکتب استاد کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ استاد بھی بہت بلند کردار ہوا کرتا تھا۔ بوریا نشین تھا لیکن سلاطین زمن اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے تھے۔ تاہم یہ استاد صرف دو سبقوں کا استاد نہیں تھا۔ یہ شیخ مکتب تھا جس کے متعلق علامہ اقبال فرماتے ہیں......

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی

علامہ نے استاد کو "عمارت گر" کہا ہے، معمار نہیں۔ عمارت گر وہ نہیں ہوتا جو صرف اینٹ پر اینٹ رکھنے کا فن جانتا ہے۔ عمارت گر وہ ہے جو نقشہ سوچتا بھی ہے، اسے صفحہ قرطاس پر منتقل بھی کرتا ہے اور اس پر عمارت بھی تعمیر کرتا ہے اس کی صنعت سنگ و خشت نہیں، روح انسانی ہے۔ وہ شاگرد کو صرف پڑھنا لکھنا نہیں سکھاتا بلکہ انسان بھی بناتا ہے۔ وہ اس سرشت میں عظمت انسانی کا بیج بوتا ہے اور اسے احترام آدمیت سے آشنا کرتا ہے۔ وہ اسے کتاب خواں ہی نہیں، صاحب کتاب بھی بناتا ہے۔

لیکن اقبال جب 'بال جبریل' سے 'ضرب کلیم' تک پہنچے تو شیخ مکتب کے ایک اور رخ سے آشنا ہو کر فرمایا......

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادہ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

کبریت کے معنی گندھک ہیں جس سے دیا سلائی بنتی ہے۔ دیا سلائی سے بجلی کا چراغ روشن نہیں ہوسکتا۔ میں اس علامت سے یہ مطلب لیتا ہوں کہ شیخ مکتب ابھی تک دیا سلائی کے دور میں ہے، وہ بجلی کے دور میں نہیں پہنچا۔ اس کی تعلیم و تربیت سے 'کشادہ دل' ممکن نہیں کیونکہ وہ کشادہ ذہن سے آشنا نہیں۔ ''ضرب کلیم'' کا ایک قطعہ اس مضمون کو آگے بڑھاتا ہے......

مقصد ہو اگر تربیت لعل بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ، کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

جہاں تک میں سمجھتا ہوں' اس قطعے میں 'کہنہ دماغ' سے مراد وہ تجربہ کار اساتذہ ہیں جو یا تو روایات کے پھندوں میں گرفتار ہیں اور اپنے زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے یا اپنے زمانے کی امامت کر سکتے ہیں۔ لیکن اپنے زمانے کے پیرو بن گئے ہیں۔ دونوں میں سے کوئی اس قابل نہیں کہ ''لعل بدخشاں'' کی تربیت کر سکے۔ یہ وہ لعل بدخشاں ہے جس کی تربیت بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو بھی نہیں کر سکتا۔

اپنے زمانے کی امامت تو بہت اونچی بات ہے' مجھے تو آج کا استاد دو رکعت کا امام بھی نظر نہیں آتا۔ ''دو رکعت'' کی جگہ ''دو اسباق'' کے ابلاغ میں بھی خون جگر کی آمیزش لازمی ہے۔ حکومت نے بھی استاد کو وہ کچھ نہیں دیا جو استاد کا حق تھا لیکن استاد نے بھی قوم و ملت کا حق ادا نہیں کیا جیسا کہ ادا ہونا حق تھا۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ گزشتہ نصف صدی میں مجھے کوئی حکومت ''تعلیم'' سے مخلص نظر نہیں آئی۔ بلند بانگ دعوے ہر دور میں ہوتے رہے لیکن نتیجہ کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ اعداد و شمار کچھ بھی کہیں عوامی خواندگی کی شرح میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ سرکاری تعلیم سرکار کے شانے پر ایک بار گراں ہے کہ اس کی نجکاری کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں زمانہ جدید کے اداروں میں خواہ نجی ہوں یا سرکاری انسان سازی کیسے ہوگی۔ ان اداروں نے جن

شاہینوں کی تربیت کی۔ انہیں ٹیلی ویژن کی سکرین پر جنگی نغمے ناچتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ (آج کل نغمہ گایا نہیں جاتا ناچا جاتا ہے) علامہ اقبال کا ایک شعر اور یاد آ گیا:

اس جنون سے تجھے تعلیم نے بے گانا کیا

جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

''خرد'' سے طالب علم کا کب کا ناطہ ٹوٹ چکا ہے۔ البتہ ''جنون'' سے اس کا رابطہ استوار ہو چکا ہے کہ پی ٹی وی کے پاپ سنگرز نے ایک ''جنون گروپ'' ضرور قائم کر لیا ہے۔ ان میں انجینئر بھی ہیں' ڈاکٹر بھی اور پروفیسر بھی' اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ آج کا طالب خرد کی گتھیاں سلجھا کر ''صاحب جنوں'' بن چکا ہے۔ البتہ وہ نظام تعلیم جسے مدرسے و مکتب کا نام دیا جاتا ہے۔ اس نے کچھ شہباز ضرور پیدا کئے ہیں اور کر رہا ہے جو جموں و کشمیر کی جنگ آزادی میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔

اس دور کی رہنمائی استاد اور صرف استاد ہی کر سکتا ہے۔ وہی بھٹکے ہوئے راہی کو سوئے منزل لا سکتا ہے۔ یہ وہ استاد ہے جو ''سودوزیاں'' سے بے نیاز ہے۔ اسے ہم مثالی استاد کہیں گے۔ مثالی استاد خال خال ہی ہوتے ہیں۔ پہلے بھی اور اب بھی۔ فقیری اور درویشی ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ لوگ مشعل راہ ہوا کرتے تھے یا فقیر کی کٹیا میں جلنے والا دیا جو بھولے بھٹکوں کی رہنماؤں کرتا تھا لیکن استاد کو استاد ضرور ہونا چاہئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' دو سبقوں کا استاد ہی سہی لیکن ان دو سبقوں پر اسے پورا عبور حاصل کرنا چاہیے۔ کلاس میں موجود ہو تو طالب علموں کو اس کی ذات میں ایک مخلص اور ہمدرد انسان کی صفات نظر آئیں۔ یعنی وہ صفات جو اسے معاشرے کے عام انسانوں میں کم نظر آتی ہیں۔ استاد اپنے پیشے کو روپے پیسے میں نہ تولتا ہو' تو طالب علم اسے اپنا رہبر بنا لیتا ہے۔ پھر وہ شیخ مکتب ہوگا اور روح انسانی اس کی صنعت ہوگی۔

میں تو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ صاحب دل اساتذہ جو اپنے نظام تعلیم سے بیزار ہیں' ٹریڈ یونین کی بجائے ایک ایسی انجمن قائم کریں جو استاد کی عزت نفس بحال کرے' اسے صحیح معنوں میں قوم و ملک کا معمار بنائے اور استاد اور شاگرد کے درمیان دل پیش کرنے کا جو رشتہ ٹوٹ گیا ہے' اسے پھر سے بحال کرے! ورنہ تعلیم کی نجکاری ہو گئی تو نظام تعلیم سے ''نظریہ'' غائب ہو جائے گا۔ ایک ایسی صنعت جس کے کالید سے ''روح انسانی'' کو خارج کر دیا جائے گا اور استاد اس مشین کا پرزہ بن جائے گا!

10 جولائی 2001ء

ایک ادھورا خواب

ایک خواب میں 1947ء سے پہلے اکثر دیکھا کرتا تھا' یہ خواب تھا کشمیر جنت نظیر کی سیر کا۔ادھورا اس لئے رہا کہ جموں تک کئی بار گیا لیکن اس سے آگے نہ جا سکا۔سیالکوٹ شہر سے تین میل شمال کی طرف میرا گاؤں بھڑتھ جموں شہر سے صرف بیس پچیس میل کے فاصلے پر ہے' سیالکوٹ کے شہری اکثر اتوار کے روز جموں جا کر نہر کے کنارے پکنک منایا کرتے تھے۔گرمیوں کی چھٹیوں میں اکثر میرے والد محترم مجھے اور میرے چھوٹے بھائیوں رفیق اور سجاد کو لے کر جموں جاتے تھے۔نہر کے کنارے پر بیٹھ کر آم ٹھنڈے کر کے چوستے۔نہر بہت کم گہری تھی لیکن پانی اتنا سرد کہ ایک منٹ کے لئے بھی اس میں ٹھہرا نہ جا سکتا تھا۔والدِ محترم سہانی (آزاد کشمیر) میں پیدا ہوئے تھے۔ان کی زندگی کے 33 سال ریاست جموں کشمیر میں گزرے تھے درّہ بانہال سے آگے نہ جا سکے تھے اور وادی جنت نظیر کو دیکھنے کی حسرت تادم مرگ ان کے دل میں رہی۔میں بھی مقبوضہ کشمیر کے ضلع نوشہرہ کے ایک گاؤں جو کی ہنڈن میں پیدا ہوا تھا اور تین سال کی عمر میں اپنے آبائی گاؤں میں آ گیا تھا لیکن تین سال کی عمر میں آبائی گاؤں میں آ گیا تھا لیکن تین سال کی عمر کی کچھ یادیں حافظے میں ایسی نقش ہو گئی ہیں کہ جموں کشمیر مجھے اپنی سائیکی کا جزو لاینفک محسوس ہوتا ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ بی ٹی کرنے کے بعد جب گرمیوں کی پہلی چھٹیاں آئیں گی تو میں والد مرحوم کو ساتھ لے کشمیر ضرور جاؤں گا۔میں 12 جون 1946ء کو بی ٹی کر کے ٹیچر مقرر ہوا۔صرف اٹھارہ دن کی تنخواہ ملی تھی کہ تعطیلات گرما آ گئیں۔سوچا کہ اگلے سال کی تعطیلات تک کچھ زادِ راہ جمع کر لوں گا اور پھر باپ بیٹا کشمیر جائیں گے۔سیالکوٹ سے روزانہ نندہ بس سروس کی کئی لاریاں کشمیر جاتی تھیں۔1946ء میں اپنے محبّ گرامی ایم آئی شمیم کی معیت میں دوبارہ جموں جا کر پکنک منائی لیکن آگے کا خواب ادھورا رہ گیا کہ انگریز نے دوبارہ جموں کشمیر کو ہندوؤں کے ہاتھ بیچ دیا۔

اب میں اناسیویں سال میں ہوں۔کیا اس سال یا اس سے اگلے سال میرا ادھورا

خواب پورا ہو جائے گا؟ میں اپنے سوال پر لرز جاتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں اندھیرے اجالے کے ایک منظر میں گرفتار ہوں۔ ذرا سا اجالا ہوتا ہے تو گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یوں میرا ایمان کہتا ہے کہ شہیدوں کا خون ضرور رنگ لائے گا لیکن وہ کون سا لمحہ ہوگا کہ جب یہ خون رنگ لائے گا۔ رنگ تو لا رہا ہے کشمیر جنت نظیر میں جو بھی پھول کھلتا ہے اس میں کسی شہید کے خون کی لالی ہوتی ہے یعنی اب تو وادی کشمیر میں اتنے لالہ و گل بھی نہیں کھلتے‘ جتنے شہید اس کی خاک میں سما جاتے ہیں۔ بقول غالب...... ؏

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

کیا وہ لمحہ قریب ہے کہ یک بار کشمیر کی خاک پر پھولوں کی چادر بچھ جائے اور کسی پھول میں کسی کشمیری ماں کو اپنے بیٹے کی صورت نظر آئے اور کسی بہن کو اپنے بھائی کا پھول سا چہرہ۔

تب میں اسی سالہ زندگی کا بار اٹھا کر کشمیر جاؤں گا اور ایک ایک پھول کو دیکھوں گا اور سونگھوں گا اور آنسو بہاؤں گا وہ آنسو زعفراں زار کشمیر کی مٹی میں جذب ہو کر لافانی ہو جائیں گے۔ کسی فارسی شاعر نے کہا تھا کہ کشمیر کی فضاؤں میں مرغ بریاں بھی چلا جائے تو وہ زندہ ہو کر اڑنے لگے۔ میں بھی اپنی عمر کا بوجھ جھیل ڈل میں پھینک کر ہلکا پھلکا ہو جاؤں گا۔ ایک نئی زندگی میری رگ رگ میں دوڑنے لگے گی۔ اس لمحے مجھے کرشن چندر آنجہانی کے وہ افسانے یاد آ رہے ہیں جس میں انہوں نے کشمیر جنت نظیر کے جاں بخش نظاروں کا نقشہ کھینچا ہے۔ ان کا افسانہ ”گرجن کی ایک شام“ کو تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ کیا پتہ کہ میں بھی ”گرجن“ میں ایک شام بسر کر سکوں کرشن چندر نے ڈوگرہ راج میں کشمیر کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا‘ اس میں دلسوزی اور دردمندی کی ہر لطافت موجود ہے لیکن افسوس ہے کہ جب ہندوستانی راج میں کشمیر کا خون بہایا جاتا رہا تو آنجہانی منقار زیر پر رہے!

مشہور ادیب مستنصر حسین تارڑ نے کشمیر کے حوالے سے اپنے والد مرحوم کا ایک واقعہ سنایا اور وہ میرے دل پر نقش ہو گیا۔ ان کے والد مرحوم کو پھولوں سے بہت عشق تھا اور گل آفرینی کا خوبصورت کاروبار بھی تھا۔ وہ ہر سال وادی کشمیر کی سیر کو جایا کرتے تھے۔ رستے میں ایک سٹاپ پر لاری رکتی تو ان کی نظر ایک پہاڑی پر پڑتی جو بہار کے موسم میں بھی سبزے اور پھول سے محروم نظر آتی۔ ایک بار وہ کئی پھولوں کے بیج اور ایک کھرپا اپنے ساتھ لے گئے۔ جب لاری اس بس سٹاپ

پر رکی تو انہوں نے پہاڑی کے اس رخ پر جو سڑک کے مقابل تھا' جہاں جہاں انہیں جگہ ملی کھرپے سے مٹی کھودی اور وہاں بیج بو دیئے اگلے سال وہ اس بس سٹاپ پر پہنچے تو پہاڑی کا یہ رخ گل وگلزار ہو رہا تھا۔ پھر اس پہاڑی پر جواہر لال نہرو نے قبضہ کرلیا کہ اس کے آباؤ اجداد وادی کشمیر کے رہنے والے تھے اور یہ وادی اسے وراثت میں ملی تھی اور تارڑ کے والد مرحوم پھولوں کا منظر دیکھنے سے محروم ہو گئے۔

ممکن ہے کہ امید کی ایک کلی اب بھی اس پہاڑی پر زندہ ہو اور کیا یہ ممکن نہیں کہ مستنصر حسین تارڑ میرا بازو تھام کر مجھے اس پہاڑی تک لے جائیں کہ اس کلی کی خوشبو سونگھ سکوں۔ ان کے والد کی روح ان کے استقبال کیلئے وہاں موجود ہو گی اور درہ بانہال پر میرے والد کی روح میرے انتظار میں اور ہم سب مل کر کھوئی ہوئی جنت میں داخل ہوں گے۔ پھر مستنصر حسین تارڑ اس صدی کا سب سے بڑا سفر نامہ تحریر فرمائیں گے! اللہ ہی بہتر جانتا ہے وہ اپنی ہر مصلحت سے خوب واقف ہے اور انسان کو اس نے بہت کم علم دیا ہے لیکن ''لاتقنطو'' کی نوید بھی عطا کی ہے!

اب تو شہیدوں کا اتنا خون بہہ چکا ہے کہ اس کی رحمت کو ضرور جوش میں آنا چاہئے! ہم تو صرف ہاتھ بلند کر کے اس سے رحمت طلب کر سکتے ہیں! آمین!

22 جولائی 2001ء

علم وادب کا فروغ

پاکستان میں علم وادب کے فروغ کے لئے کئی ادارے قائم ہیں جنہیں مرکزی یا صوبائی حکومتوں کی طرف سے سالانہ گرانٹ ملتی ہے۔ ان میں نیشنل بک فاؤنڈیشن' اقبال اکادمی' اکادمی ادبیات پاکستان' مقتدرہ قومی زبان' اردو سائنس بورڈ اور رائٹرز گلڈ وغیرہ کے نام کچھ لوگوں کو ضرور معلوم ہیں لیکن کچھ ادارے ایسے ہیں جو گمنام سے ہیں اور چند گنے چُنے لوگ ہی ان کے نام جانتے ہیں مثلاً ادارہ ثقافت اسلامیہ' انجمن ترقی ادب اور مجلس اقبال وغیرہ۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ ادارے قائم ہیں اور علم و ادب کا فروغ ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس کی تشہیر کم ہی ہوتی ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان تو کبھی بڑے طمطراق سے جلسے جلوس کیا کرتی تھی جن پر لاکھوں خرچ ہوتا تھا۔ اب بھی چھوٹے موٹے جلسے ہوتے رہتے ہیں مثلاً کوئی تعزیتی ریفرنس یا کسی اہم کتاب کی رونمائی وغیرہ۔ گزشتہ دو سالوں سے انعامات کی تقریبات منقطع ہیں۔ کتابیں اب بھی شائع ہو رہی ہیں لیکن دیکھا جائے تو ادبی وعلمی محاذ پر خاصی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ادب اپنے آپ وجود میں آتا ہے' اسے کوئی ادارہ پروان نہیں چڑھاتا بلکہ ادارے ادب کے نام پر چلتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ اب تو ادب اتنا ناپسندیدہ ہو چکا ہے کہ اشاعتی ادارے اس کا نام سُن کر کان پر ہاتھ دھر لیتے ہیں ''توبہ! توبہ! ادب کا نام نہ لیجئے صاحب! نہ سٹال پر بکتا ہے نہ لائبریاں اسے خریدتی ہیں'' اس کے باوجود سر پھرے ادیب ادبی رسالے بھی نکالتے ہیں اور کتب بھی شائع کرتے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں ادبی کساد بازاری کے باوجود اتنے رسالے شائع ہو رہے ہیں کہ ان کی تعداد کم از کم مجھے تو معلوم نہیں' ڈاکٹر انور سدید صاحب کو معلوم ہوگی۔ ان سے درخواست ہے کہ ایک کالم ''ادبی رسائل'' کے عنوان پر ضرور لکھیں۔ کم از کم کچھ اخباری کالم پڑھنے والے تو ان کے نام اور تعداد سے آگاہ ہو کر کسی رسالے کی مالی سرپرستی پر آمادہ ہو جائیں گے۔ یہ رسائل عام طور پر مفت میں بانٹے جاتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ رسالے اور ان کے مدیران کس ہوا میں سانس لیتے ہیں کہ اپنے رسالے کے ساتھ خود بھی

صرف آکسیجن پر زندہ رہتے ہیں۔ ادبی رسالوں کو اشتہار وغیرہ بھی نہیں ملتے۔ مرنے کے بعد ان کے گھر سے حسینوں کے خطوط تو کیا' ایک کرم خوردہ بیاض بھی نہ نکل سکی۔ ادب دھڑا دھڑ چھپ رہا ہے۔ ایک ادبی رسالے کے مدیر بتا رہے تھے کہ شعروشاعری کے کچھ مجموعوں میں ایک غزل یا نظم بھی وزن میں نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں ان پر تبصرہ نہیں کرتا تو وہ فون پر مجھے بُرا بھلا کہتے ہیں۔ میرے عزیز دوست اور معروف شاعر جناب شاہد واسطی کو اپنے ایک دوست کی معرفت ایک مجموعہ ترمیم واصلاح کے لئے ملا۔ شاعرہ نے لکھا تھا کہ میں نے یہ شاعری اس نیت سے کی ہے کہ اسے پاپ سنگرز گا سکیں۔ اب بتائے! وہ اس کی ترمیم واصلاح کیا کرتے۔ یہی مشورہ دیا کہ اکثر پاپ سنگر خود شاعر بھی ہوتے ہیں' ان سے اصلاح کروا لیجئے گا! لیکن خوشی کی بات تو یہ ہے کہ کتاب شائع ہو رہی ہے......

نوارا تیز ترمی کُن چوں ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چُوں محمل راگراں بینی (عُرفی)

(اگر ذوق نغمہ کم نظر آئے تو سُر کو اونچا کر دو اور اگر یہ دیکھو کہ اونٹ پر بوجھ زیادہ لدا ہے تو حدی کی لے تیز کر دو)

جو ادیب اپنی کتاب اپنے خرچ پر چھاپتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ لوگ اسے پڑھیں۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ بہت کم لوگ اسے پڑھتے ہیں۔ ادیب اپنے صاحب ذوق دوستوں کو کتاب بھیجتا ہے۔ اکثر اسے رسید بھی نہیں ملتی صرف ایک فیصد لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ چلئے ادیب گھر پھونک کر تماشا تو دیکھ لیتا ہے' اس کی ''انا'' کی تسکین تو ہو جاتی ہے۔ جو لوگ کتاب پڑھنا چاہتے ہیں' وہ کتاب خرید نہیں سکتے۔ ملک میں اتنی لائبریریاں نہیں کہ ان تک کتاب پہنچا سکیں اور جو ہیں انہیں گرانٹ نہیں ملتی کہ کتاب خرید سکیں۔ میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ ادب کے فروغ وارتقا میں سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کا کیا کردار ہے؟ کیا کسی ادارے نے کبھی کوئی سالانہ رپورٹ شائع کی کہ ایک سال کے دوران اس نے کون سی ادبی خدمات سرانجام دیں' اس نے کتنی کتابیں چھاپیں یا کتنی کتابوں کی اشاعت میں اضافہ کا ہاتھ بٹایا اور ان کے توسط سے کتنی

28 جولائی 2001ء

دوٹوک فیصلہ اور افغان مہاجرین

صدر پاکستان جناب پرویز مشرف نے دوٹوک فیصلہ کرنے کی جرات کرلی۔ وہ جو بھی فیصلہ کرتے متنازعہ ہوتا۔ اگر وہ ''نہ'' والا فیصلہ کرتے تو اکثر دانشور کہتے ہیں کہ انہوں نے زمینی اور زمانی حقائق کے ادراک کے بغیر جذباتی فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے پر بھارت بہت خوش ہوتا۔ وہ پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دلوالیتا۔ افغانستان کے حکمران ملامحمد عمر مجاہد نے بھی دوٹوک فیصلہ کیا کہ وہ فرعون وقت امریکہ کا کوئی مطالبہ قبول نہیں کریں گے۔ وہ مسلمانوں کے ہیرو اسامہ بن لادن کو کسی صورت میں بھی امریکہ کے سپرد نہیں کریں گے۔ علماء کی کونسل نے فیصلہ کیا کہ اسامہ بن لادن اگر چاہیں تو افغانستان چھوڑ کر کسی اور جگہ چلے جائیں۔ علماء کو مجلس مشاورت کا یہ فیصلہ ''دو ٹوک'' نہیں ہے۔ چنانچہ ابھی تک اسامہ افغانستان میں پناہ گزین ہیں۔ ملاعمر کے اس فیصلے پر پاکستان کی اکثر دینی اور سیاسی جماعتوں نے ان کو داد دی اور جذباتی نعرے لگائے۔ ابھی ان کا جوش وخروش ٹھنڈا نہیں پڑا حالانکہ ابھی تک امریکہ نے افغانستان پر حملہ نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ یہ خطرہ ٹل جائے!

میں ایک بوڑھا اور بیماری آدمی ہوں جوانی کا کوئی ولولہ زندہ نہیں رہا۔ تاہم جب اسلام زندہ باد کا نعرہ لگے' میری خودی بیدار ہو جاتی ہے۔ افغانستان میرا برادر مسلمان ملک ہے۔ اگر کوئی فرعون زمانہ اسے اپنے انتقام کا نشانہ بنائے گا اور پاکستان کی سرزمین سے اس پر میزائل برسائے گا اور بمبار طیارے اڑائے گا تو مجھے بہت دکھ ہوگا لیکن میں یہ نظارہ دور سے دیکھوں گا۔ ان پر کیا گزرے گی جن پر میزائل اود بموں کی بارش ہو رہی ہوگی۔ اللہ جانے کہ اسامہ کا کیا بنے گا۔ کیا امریکہ اسے کسی کھوہ یا زیرزمین پناہ گاہ سے نکال لے گا زندہ یا مردہ؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اسامہ بن لادن کی سلامتی کے لئے لاکھوں افغانوں کو جان کر قربانی دینی پڑے گی۔ دنیا کی واحد سپر پاور اس وقت چنگیز خان اور تیمور جیسے قہرمانوں کی سوچ میں مبتلا ہے۔ فرعون ہو یا چنگیز' نادر ہو یا تیمور اس کی روح ہر دور میں کسی قالب میں داخل ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ ہٹلر اور سٹالن کا روپ

دھارن کرتی ہے، کبھی ٹرومین، جانسن اور بش سینئر کے جسم میں حلول کر جاتی ہے۔ اب یہی روح بش جونیئر کے سراپے میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ٹیلی ویژن سکرین پر جب بھی اسے دیکھا، ایک قہرمان کا چہرہ نظر آیا۔ غم و غصے اور انتقام کی آگ میں جلتا ہوا۔ اس کے اسلحہ خانے میں لاکھوں بجلیاں ہیں، دیکھئے! وہ کب گرتی ہیں اور کسی پر گرتی ہیں۔ اقبالؒ نے کہا ''برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر'' میں کہوں گا کہ آج کل بیچارے افغانوں پر گرتی ہے۔ گزشتہ بیس بائیس سالوں سے بجلیاں ان کے سروں پر کوندرہی ہیں اور برس رہی ہیں۔

طالبان نے افغانستان کے نوے فیصد حصے میں امن وامان قائم کر دیا ہے لیکن افغانوں کی بھوک کا کوئی درماں نہیں کر سکے۔ گزشتہ چار پانچ سال سے وہاں قحط کا سا سماں ہے۔ بارشیں بہت کم ہوئی ہیں۔ اب تو سنگلاخ پہاڑوں میں گھاس بھی نہیں اگتا۔ بحمد اللہ کہ طالبان نے وہاں اسلام نافذ کر دیا ہے لیکن ایسا اسلام جس میں رواداری کی کوئی گنجائش نہیں۔ افسوس کہ انہوں نے ہر افغانی کو ایک آہنی شکنجے میں کس دیا ہے۔ کوئی شخص اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتا۔

بھوکے افغان بار بار ہجرت کرنے پر مجبور ہیں۔ ہمسایہ ممالک پہلے ہی ان کی مہمانی میں تہی دامن ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں پہلے یہ بیس لاکھ افغان موجود ہیں۔ اب پھر اس کی سرحد پر جنگ گزیدہ اور افلاس زدہ افغانوں کی یورش ہے۔ پاکستان ان کا ''یثرب'' ہے۔ وہ اور کہاں جائیں؟ ٹیلی ویژن کی خبروں میں طورخم اور چمن کی چیک پوسٹوں پر ان کی آمد کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا منظر عام ہے کہ بے اختیار الطاف مشہدی کا ایک شعر یاد آ جاتا ہے......

مسافر کی نظر میں پڑھ کے غم اندوز افسانے
برے ماحول کی رنگینیاں لگتی ہیں شرمانے

مسافروں کی بے سروسامانی دیکھ کر اپنے گھروں کی ثروت پر شرم آنے لگتی ہے۔ اتنی غربت، اتنی بے مائیگی، اتنی محرومی، اتنی نکبت، اتنا ادبار شاید ہی کسی اور تصویر میں نظر آئے۔ میں نے ایک بوڑھے بیمار افغان کو ایک کمبل کی چھاؤں میں لیٹا ہوا دیکھا جسے چار لکڑیوں کے سہارے اس پر تانا گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ افغان بیمار بھی ہے اور جس بستر پر وہ لیٹا ہوا ہے، وہ پتھریلی زمین پر بچھا ہے گرد آلود ہوا چل رہی ہے اور دور دور تک کوئی شجر سرمایہ دار نظر نہیں آتا۔ نجانے وہ کتنے کالے کوسوں کا فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے جب یہ جوان تھا تو اپنے وطن کے تحفظ کے لئے راست قد ہو کر کلاشنکوف کندھے پر اٹھائے لئے پھرتا تھا۔ اب مجھے کسی افغان کے کندھے

پر درے کی بندوق بھی لٹکتی ہوئی نظر نہ آئی۔محراب گل افغان کہتا ہے......

افغان باقی! کہسار باقی!......الحکم للہ! الملک للہ!

حاجت سے مجبور مردان آزاد......کرتی ہے حاجت شیروں کو روباہ!

بار بار کے حادثات و آفات نے اس بوڑھے مرد کہستانی کو مبتلائے حاجت کر دیا ہے اور حاجت شیروں کو بھی لومڑیوں کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔کاش کوئی فوٹو گرافر اس مبتلائے حاجت بوڑھے بیمار مرد آزاد کی تصویر بنائے اور دنیا کے فرعونوں کو اس تصویر میں ان کا چہرہ دکھائے جنہوں نے اسے کہسار چھوڑنے پر مجبور کیا۔مسلمانوں کے ہیرو اسامہ بن محمد لادن کو بھی اپنے زبوں حال میزبان کی اس تصویر کو ملاحظہ کرنا چاہئے اور علماء کونسل کے مشورے پر غور کرنا چاہیے اور طالبان کو اپنے مسلک میں رواداری اور لچک پیدا کرنی چاہئے۔

مجھے پورا پورا یقین ہے کہ امریکہ کو اپنے فخر و غرور کی جو سزا ملی ہے، اس کے پیچھے یقیناً یہود کا ہاتھ ہے کبھی یورپ پنجہ یہود میں زبون و خوار تھا۔اب یہ امریکہ کی شہہ رگ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ممکن ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگون کی تباہی کے بعد امریکہ کو اس کا احساس ہو گیا ہو۔ابھی تک تو اسامہ بن لادن اس معاملے میں بے گناہ معلوم ہوتے ہیں لیکن امریکہ انہیں اس نا کردہ گناہ کی سزا دینے پر تلا ہوا ہے وہ یہود سے خائف ہے۔

کاش وہ اس بوڑھے افغان کی تصویر کو ایک بار دیکھ لیتا! اس کے لاکھوں کروڑوں ڈالر اس کی بے بسی اور بے کسی کا مداوا نہیں کر سکتے!

30 اکتوبر 2001ء

پنشن خوروں کا ایک اور اعزاز

حال ہی میں ایک خبر سے معلوم ہے کہ حکومت پنشنر حضرات کو معزز شہریوں کی صف میں شامل کرنے پر غور کر رہی ہے۔ نوائے وقت کے ایک ادارتی نوٹ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ غور ہو چکا ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) صفدر بٹ صاحب نے بھی کہا کہ جو فوجی پنشنرز کی یونین کے صدر ہیں۔ حکومت سے اپیل کی ہے کہ وہ اس اعزاز رسانی یا اذیت رسانی کے مسئلے پر مزید غور کرے۔ یعنی وہ نہیں چاہتے کہ پنشنر حضرات معزز شہریوں کی صف میں شامل ہوں۔ ان کے لئے کہا یہ اعزاز کم ہے کہ وہ ''سینئر سٹیزنز کی فہرست میں شامل ہیں اور انہیں ایک پیکج بھی ملا ہوا ہے جو ابھی تک کھولا نہیں گیا۔ ابھی تو انہیں رنگ برنگا شناختی کارڈ بھی جاری نہیں وا۔ اور نہ رکشا، ویگن، بس ریل گاڑی یا ہوائی جہاز کے سفر پر کرائے میں کوئی رعایت ملی ہے۔ حتیٰ کہ میری اس سفارش کو بھی قابل غور نہیں گردانا گیا کہ سینئر سٹیزنز کو سال میں کم از کم ایک بار تو چڑیا گھر کی سیر ہی مفت میں کروا دی جائے۔

کہتے ہیں کہ دنیا میں صرف پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ٹیکس کا لفظ سن کر کئی شہری بے ہوش ہو جاتے ہیں حالانکہ ٹیکس گزاری ایک شہری کو عزت کا مقام عطا کرتی ہے۔ امریکہ برطانیہ جرمنی اور فرانس کا شہری ٹیکس ادا کر کے اپنے آپ کو معزز شہری سمجھتا ہے۔ وہ ٹیکس ادا کرنے کے لئے بے چین رہتا ہے اور ٹیکس دینے کے بعد اس کی جسمانی اور روحانی صحت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ مجھے یہ بات خلاف فطرت بشری معلوم ہوتی ہے۔ کون چاہتا ہے کہ اپنی حلال کی یا حرام کی کمائی کا ایک حصہ بطیّب خاطر حکومت کے خزانے میں جمع کرا دے۔ کمائی آخر کمائی ہوتی ہے۔ جائز یا ناجائز اس کے لئے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں وہ حضرات جو ٹیکس ادا کرنے کے بہت ہی قابل ہوتے ہیں، ٹیکس دینے سے بہت ہی گریزاں ہوتے ہیں اور اس کا بوجھ ان پر ڈال دیتے ہیں جو قطعاً اس قابل نہیں ہوتے مثلاً ٹیکس سے چھوٹ کی آمدنی کی حد ساٹھ ہزار روپے سالانہ ہے یعنی پانچ ہزار روپے ماہوار اس سے ایک روپیہ بھی بڑھ جائے تو ٹیکس

لاگو ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کی آمدنی پانچ ہزار ایک روپے ماہوار ہو' تو وہ معزز شہریوں کی فہرست میں آجاتا ہے۔ اتنی آمدنی میں ایک اڑھائی مرلے کے مکان کا کرایہ اور یوٹیلیٹی ٹیکس بھی بمشکل ادا ہو سکتے ہیں۔ لیکن اعزاز اعزاز ہی ہوتا ہے۔ اوپر کا اگر ایک روپیہ ٹیکس میں چلا جائے تو بیچارے ٹیکس گزار کے نکبت وافلاس میں کون سا بڑا اضافہ ہوگا۔ ایک مشہور کہاوت ہے چڑی چونچ بھرے گئی' ندی نہ گھیٹو نیر۔ لیکن جس ندی میں اتنا نیر بھی نہ ہو کہ اس کی اپنی پیاس بجھ سکے۔ اس سے چڑی کی چونچ کیا بھرتی ہوگی۔ اور چڑی بھی وہ کہ حکومت اس کے ہاتھ میں ہو۔ ایک ملازم ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہوتا ہے۔ چلیئے قدرت کی طرف سے اسے پانچ سال پنشن تو اتنا جی لینے میں کیا حرج ہے۔ لیکن یہ بھی کیا کہ جیئے چلے جاؤ جیے چلے جاؤ اور ملک وقوم پر بوجھ بن کر ناقت کے بورییے بٹورتے رہے۔ ہونا یوں چاہئے جوں جوں پنشنر کی عمر بڑھتی جائے۔ توں توں اں جرمانے کے طور پر اس کی پنشن گھٹتی جائے۔ نہ کام کے نہ کاج کے اور دشمن اناج کے۔ میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ اب حکومت پنشنروں پر بھی انکم ٹیکس لگانا چاہتی ہے۔ ایک خبر یہ بھی ہے کہ 2070 تک دنیا میں بزرگوں کی تعداد جوانوں سے بڑھ جائے گی۔ حکومتیں دور کی سوچتی ہیں ممکن ہے کہ وہ ابھی سے اس کا سدباب کرنا چاہتی ہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے جب کوئی اسکیمو کام کاج کی سرحد سے گزر جاتا' وہ اظہار کرتا کہ اب اس نے واصل بالحق ہونے کا عزم کرلیا ہے تو پوری آبادی میں خوشی منائی جاتی۔ آبادی سے کچھ دور اسے ''اگلو'' بنا کر دیا جاتا۔ اس میں ایک مہینے کا راشن اور ایندھن رکھ دیا جاتا۔ جب آگ کا شعلہ بجھ جاتا۔ تو اس کی زندگی کا دیا بھی گل ہو جاتا۔

مجھے اس وقت پانچ ہزار انتیس روپے پنشن ملتی ہے۔ ساٹھ ہزار آمدنی ٹیکس فری ہے۔ اس کے بعد سالانہ 348 روپوں پر ٹیکس لگنا ہے۔ ساڑے سات فیصد ٹیکس اس رقم پر صرف 26 روپے بنتا ہے۔ میں ٹیکس دینے کو تیار ہوں لیکن حکومت کو اپنا کارندہ میرے پاس بھیجنا پڑے گا۔ میں تگ و دو کے قابل نہیں۔ اگر میری اس معمولی سی قربانی سے جناب شوکت عزیز کا بجٹ بیلنس ہو جائے تو مجھے خوشی ہو اگر پانچ ہزار روپے ماہوار تنخواہ لینے والا ملازم ٹیکس نیٹ میں جکڑا جا سکتا ہے۔ تو پنشنر حضرات کوئی عرش سے تو نہیں اترے کہ اس قید سے بچ سکیں۔ بڑے بڑے جرنیل وزیر امیر مشیر بھی اس سے دامن نہیں بچا سکتے۔ بلکہ میں نے تو ارب پتی وزرائے اعظم کو ٹیکس ادا کرتے دیکھا ہے۔ خواہ وہ پندرہ سو روپیہ سالانہ ہی کیوں نہ ہو۔ آج کا علم نہیں۔ کبھی کسی وزیر نے اپنی آمدنی اور خرچ کا گوشوارہ پیش نہیں کیا۔ کروڑ پتی لوگ جب ٹیکس ریٹرن بھرتے ہیں تو کنگلوں

کی فہرست میں آ جاتے ہیں۔ بڑی بڑی مارکیٹوں کے غریب دکاندار تو بھکاریوں سے بھی زیادہ بھکاری معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یاد آیا کہ کل ایک بھکاری نے گیٹ کی گھنٹی دبا کر مجھے طلب کیا تو میں نے پوچھا فرمایئے۔ کیا حکم ہے۔ سفید پوش قسم کے بھکاری صاحب کہنے لگے حکم کیا ہے۔ جو سرتا بنتا ہے۔ (حاضر توفیق) عطا کیجئے' میں نے ایک روپے کا سکہ پیش کیا تو انہوں نے اس پر حقارت کی ایک نظر ڈال کر کہا۔ صرف ایک روپیہ۔ میں نے روپیہ جیب میں ڈال لیا تو کہنے لگے چلیئے ایک روپیہ ہی سہی یوں آج کل ریٹ پانچ روپے ہے۔ میں نے جلدی جلدی حساب لگایا۔ اگر وہ دن میں سو گھروں سے بھی بھیک وصول کر لیتا ہو تو ایک دن میں اسے پانچ سو روپے آمدنی ہو جاتی ہے۔ چلیئے پانچ روپے روزانہ مبالغہ ہی ہیں۔ لیکن مجھے پختہ یقین ہے کہ اسے دو سو روپے روز تو وصول ہو جاتے ہیں ہوں گے۔ چھ ہزار روپے ماہانہ گویا وہ ٹیکس نیٹ میں آسانی سے آ سکتا ہے۔ میں نے کہا بھکاری صاحب اگر اتنی شرح سے بھیک آپ کو ملتی ہے تو آپ پر انکم ٹیکس لگ سکتا ہے میری بات سن کر اس نے غش تو نہ کیا البتہ جھٹ سے اگلے گھر کی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔

آج کل امریکہ اور یورپ کے شائی لاک ہم پر یکا یک مہربان ہو گئے ہیں اور حاتم کی قبر لات مار رہے ہیں۔ یعنی بہت سے قرضے ری شیڈول ہو گئے ہیں اور بہت سے قرضوں پر پابندیاں اٹھ گئی ہیں۔ وزیر خزانہ جناب شوکت عزیز صاحب آج کل ٹیلی ویژن پر آتے ہیں تو ان کے چہرے پر بشاشت صاف نظر آتی ہے۔ گزشتہ دو سالوں میں میں نے کبھی انہیں مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا' اب وہ مسکراتے ہیں۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر میرا جی بجھ جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں آپ میری پوری پنشن ٹیکس میں لے لیجئے لیکن خدارا امریکہ اور یورپ کی ان نوازشات کو ان کے منہ پر دے ماریئے اور کہیے کہ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ ہماری مجبوری ہے۔ ہمیں اس کی قیمت ادا کر کے شرمندہ نہ کیجئے۔

30 اکتوبر 2001ء

تورا بورا

1965ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کے شاہبازوں نے ہندوستان کے ایک ہوائی اڈے "بلواڑہ" کو تہس نہس کر دیا تھا۔ اس واقعے سے ایک محاورہ وجود میں آیا تھا۔ "بلواڑہ کر دینا" پنجابی فلم کا کوئی ولن بھڑک مارتا "اوئے! میں تیرے پنڈ وا بلواڑہ کر دیا گا۔" اگرچہ "تورا بورا" پر جو آہن و آتش کا عذاب نازل کیا گیا' اس کے حوالے سے کسی حس مزاح کا اظہار مناسب نہیں لیکن گزشتہ تین ساڑھے تین ماہ سے اعصاب جس تناؤ سے گزر رہے ہیں' ان میں کچھ سکون پیدا کرنے کے لئے مزاح بھی کر لیا جائے تو کیا حرج؟ چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ کرہ ارض کی سب سے بڑی جابر و قاہر قوت نے افغانستان کا "تورا بورا" کر دیا ہے لیکن اسے گوہر مقصود حاصل نہیں ہوا۔ اس نے شہروں کو کھنڈر بنا دیا' وادیوں کو تباہ کر دیا' پہاڑوں کے پرخچے اڑا دیئے' ایسے ایسے بم گرائے جو چٹانوں کو توڑ کر غاروں کی گہرائی تک پہنچتے رہے اور فضا کی آکسیجن جلا دی گئی کہ بلوں میں گھسنے والی ذی روح مخلوق دم گھٹ کر مر گئی۔ میں سوچتا ہوں کہ تورا بورا کے غاروں سے اسامہ بن لادن کو نکالنے کے لئے چار سو بم ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہیروشیما والا ایک ہی ایٹم بم کافی تھا لیکن اس صورت میں اسامہ زندہ یا مردہ ان کے ہاتھ میں نہ آتے اور انتقام کے تقاضے پورا نہ ہوتے۔

اب بھی افغانستان پر دھویں اور گرد کے غبار چھائے ہوئے ہیں۔ ہزاروں افراد حرف غلط کی طرف بٹ گئے ہیں۔ ایسے مٹے ہیں کہ ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا ہے۔ ہزاروں بے گناہ معذور ہو گئے ہیں۔ بچوں کے ہاتھ میں کاسہ گدائی آ گیا ہے۔ بموں کے ساتھ خوراک کے تحفے بھی فضاؤں سے گرائے جاتے رہے۔ اس سے بڑا اور بھونڈا مذاق ادا کیا ہوگا۔ ایک غیرت مند قوم کو بھکاری بنا دیا گیا ہے۔ ایک طرف اور دوسری طرف عارضی کیمپ لگت رہے اور مارنے والا مرنے والوں کو مزید زیر بار کر رہے ہیں۔ یہ کیسا زمانہ آ گیا ہے کہ چنگیز اور ہلاکو قوموں کی "خودی" کو خاک سیاہ کر رہے ہیں۔ گویا اب قہرمانی کے انداز بول رہے ہیں۔ چنگیز اور ہلاکو خونخوار

فوجیں لے کر میدان میں نہیں اترتے کہ کہیں ان کے پروردہ عیش نوجوانوں کو تیروتفنگ کا سامنا نہ ہو۔ وہ زمین سے بہت دور 35 ہزار فٹ کی بلندیوں پر اڑتے ہیں اور بے دریغ زمین پر موت کے گولوں کی بارش کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے ساقی نامہ میں کہا تھا!

اٹھا ساقیا! پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شاہباز سے

اور ہم نے دیکھا کہ شاہباز فضاؤں میں بے درنگ اڑتے رہے اور ممولے زمین پر ان کا انتظار کرتے رہے کہ شہباز نیچے اترے تو اس سے دو دو ہاتھ کریں۔ یہ کیسے شہباز تھے کہ ممولوں پر جھپٹنے پلٹنے، پلٹ کر جھپٹنے کی لذت سے بھی محروم رہے۔ اصل میں یہ کرگس صفت شاہباز تھے کہ اگرچہ فضاؤں میں شاہین وار اڑے لیکن شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہے۔ تب منظر سے ممولے غائب ہو گئے اور ان کی جگہ زاغوں نے لے لی۔ اب کوہ سفید کے وہ غار جنہیں ''تورا بورا'' کہتے ہیں، زاغوں کے تصرف میں آ گئے ہیں۔

تاہم ابھی تک جناب ڈک چینی کی یہ حسرت پوری نہیں ہوئی کہ زمانہ جدید کے اس بیرڈ کے سامنے یوحنا کا سر ایک طشت میں رکھ کر پیش کیا جائے۔ کیا پتہ مافوق الفطرت ہستی آسامہ بن لادن ایک اڑن طشتری میں بیٹھ کر ان کے حضور میں پیش ہو جائے کہ سر حاضر ہے اور جناب ڈک چینی کا ''تورا بورا'' ہو جائے۔ اب ایک اور قوت قہرمانی کے نشے میں سرشار ہو کر پاکستان کا ''تورا بورا'' کرنا چاہتی ہے کہ اسے اپنا ''ہلو اڑا'' یاد نہیں رہا۔ ممکن ہے اس کے پیچھے بھی دنیا کی سب سے بڑی قہرمان قوت کا کوئی اشارہ ہو کہ اس نے جو ورلڈ آرڈر تیار کیا ہے، اس میں ''پاکستان'' کی کوئی ضرورت نہیں لیکن جو ورلڈ آرڈر آسمان پر محفوظ ہے، اس میں شائد اس کی ضرورت باقی نہ رہی ہو......

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں



غُلامُ الثقلین نقوی ۱۲ مارچ ۱۹۲۳ء کو مقبوضہ جموں کشمیر کے ایک گاؤں ”چوکی ہنڈن“ ضلع نوشہرہ میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد سید امیر شاہ مرحوم بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ سکول ریکارڈ کے مطابق، ان کی تاریخ پیدائش ۲۱ مئی ۱۹۲۳ء ہے۔ آبائی گاؤں کا نام ”بھڑتھ“ ہے، جو سیالکوٹ شہر سے شمال کی طرف تین میل کے فاصلے پر واقع ہے، یہیں ان کے بچپن اور لڑکپن کا بیشتر حصہ گزرا۔

پرائمری سکول بھڑتھ، سکاچ مشن سکول سیالکوٹ چھاؤنی، ڈی بی ہائی سکول دیپالپور، مرے کالج سیالکوٹ اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیمی قابلیت ایم اے (اردو) بی ٹی ہے۔ ۳۷ سال تک درس و تدریس کے پیشے سے منسلک رہ کر، ۲۰ مئی ۱۹۸۳ء کو گورنمنٹ کالج لاہور سے اسسٹنٹ پروفیسر، اردو کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ 14 اپریل ۲۰۰۲ء کو اناسی (۷۹) سال کی عمر میں وفات پائی۔ چار بیٹوں اور ایک بیٹی کے علاوہ ڈاکٹر وزیر آغا ڈاکٹر انور سدید ایسے دوست‘ سجاد نقوی ایسے بھائی اور بے شمار احباب کو سوگوار چھوڑا۔